قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in
National Council for Promotion of Urdu Language

جنوری 2023 قیمت 15 ₹

ماہنامہ اردو دنیا نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

- وانمباڑی : ادب شناس شہر
- سوشل میڈیا: تفہیم و اثرات
- مہابھارت کے اردو تراجم
- نازش پرتاب گڑھی : حب وطن کا شاعر
- اردو ایک بین العلومی زبان ہے

ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی
میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب
بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

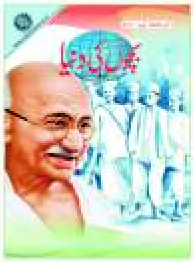

اور بہت کچھ

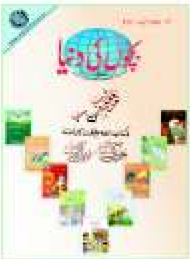

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے　　سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 ،A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ اردو دنیا

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:25، شمارہ:1، جنوری 2023

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مشیر : حقانی القاسمی

معاونین : عبدالرشید اعظمی، نایاب حسن

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارتِ تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے   سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000   شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 22-7-110 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002

فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات — 4

خطوط

ربط و التفات — قارئین کے خطوط — 5

ادب: زاویے اور جہات

شاعری کیا ہے؟ — سید نفیس دسنوی — 8

شمس الرحمٰن فاروقی کی روایت پسندی — محمد اسلم پرویز اسلم — 12

برجستہ گوئی اور فنِ اصلاح شعر کا ماہر: سید محمود الحسن صولت — راشد میاں — 15

میر غلام نازکی ایک غزل، دو قرأت — شاکر علی صدیقی — 19

اردو شاعرات کی نظموں میں اساطیری کردار — محمد حسین — 22

اردو مثنوی میں مشترکہ ہندوستانی تہذیب — محمد ارشد — 24

شہر بین

ادب شناس شہر: وانمباڑی — محمد طیب علی — 27

زبان اور زمینی صورت حال

ترجمہ نگاری کے مراکز قائم کرنے کی ضرورت ہے — سمیرا بانو — 29

لعل و گہر

نازش پرتاب گڑھی انسانیت اور حب وطن کا شاعر — تابش مہدی — 33

ظہیر دہلوی کی غزل گوئی — حمیرا حیات — 36

جہان مذاہب

مہابھارت کے اردو تراجم — شاہ نواز فیاض — 38

اردو شاعری میں گیتا — بلوبندر سنگھ — 40

گرونانک دیو جی: ایک انقلابی ہادی — محمد موسیٰ — 44

سلسلۂ صحافت

اردو بلٹز کی صحافت — ذاکر حسین ذاکر — 47

اردو صحافت: ایک جائزہ — محمد سجاد ندوی — 50

خراج عقیدت

نئی نسل کی نئی غزل اور ابراہیم اشک — شیخ مجیب شیخ ضمیر — 52

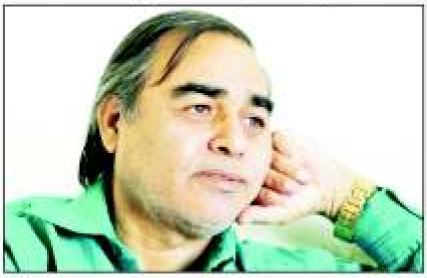

نیا آسماں نئے ستارے

عابد سہیل کے ترجمے — موسیٰ رضا — 54

اردو، آزادی اور وطنیت — محمودہ قریشی — 57

سوشل میڈیا

سوشل میڈیا: تفہیم اور اثرات — احمد خان — 59

خصوصی گفتگو

اردو ایک بین العلومی زبان ہے: پروفیسر محمد نعمان خاں — غضنفر اقبال — 63

کتابوں کی دنیا

تعارف و تبصرہ — ادارہ — 66

عالمی اردو نامہ

اردو نامہ — ادارہ — 76

خبرنامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ — 77

ہماری بات

اردو دنیا کے قارئین کو نیا سال اور یوم جمہوریہ مبارک!

لمحے تیزی سے گزرتے ہیں، ماہ و سال تبدیل ہوجاتے ہیں اور ہمارے ذہنی اور طبعی وجود میں نئی نئی ساعتیں شامل ہوتی جاتی ہیں مگر پرانے لمحے بھی ہمارے وجود کا حصہ بنے رہتے ہیں کہ دراصل انہی لمحوں کا محاسبہ کرکے ہم نئے لمحوں کا لائحہ عمل طے کرتے ہیں۔ محاسبہ ایک لازمی عمل ہے جس کے ذریعے ہم اپنی ناکامیوں اور کامیابیوں کا ایک گوشوارہ مرتب کرتے ہیں اور اس کی روشنی میں مستقبل کی منصوبہ سازی ہوتی ہے۔ محاسبہ صرف سال کے خاتمے پر نہیں کیا جانا چاہیے بلکہ ہمیں ہر لمحے اپنی زندگی اور اس سے جڑی ہوئی کارکردگی کا احتساب کرتے رہنا چاہیے، تبھی ہمیں احساس ہوگا کہ ہم نے اپنے وقت اور ذہنی توانائی کا استعمال کیسے کیا اور اس کے کیا کیا ثمرات اور نتائج مرتب ہوئے۔

ماہ و سال تو بدلتے ہی رہتے ہیں کہ یہ ایک فطری عمل ہے مگر المیہ یہ ہے کہ ہمارے ذہنی رویے اور فکری روش میں کسی طرح کی تبدیلی نہیں آپاتی، جب کہ وقت اور حالات ہمیں تبدیلی کا اشارہ بھی دیتے ہیں۔ اگر ان تبدیلیوں سے ہماری زندگی ہم آہنگ نہیں ہوگی تو ہم پسماندہ ہی رہ جائیں گے، دنیا کی ترقی یافتہ اور زندہ قومیں عصری تغیرات پر نگاہ رکھتی ہیں اور یہی تبدیلیاں ان کی ترجیحات کا تعین بھی کرتی ہیں۔ وہ نئے نئے رویے، رجحانات، نظریات و میلانات کا تنقیدی محاکمہ کرتے ہیں اور ان کے مثبت پہلوؤں کو اپنی زندگی اور معاشرے کا حصہ بنا لیتے ہیں۔ لیکن ہمارے ذہنوں پر قدامت پسندی اس قدر حاوی ہے کہ ہم بہت سی مثبت تبدیلیوں کو بھی گوارا نہیں کرتے اور ہماری زندگی پرانی سوئی پر ہی لٹکی رہتی ہے اسی لیے ہم علوم و فنون کے باب میں نئے تغیرات اور تبدیلیوں سے یا تو آشنا نہیں ہو پاتے یا ان تغیرات و تبدیلیوں کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ زمانہ کتنی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے اور تہذیب و تمدن کی سطح پر ارتقا کا سفر کس طرح جاری ہے، اس پر ہماری نگاہ کم ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ہم عصری تبدیلیوں سے اپنے معاشرے کو ہم آہنگ نہیں کریں گے تو ہمارے لیے آگے کا راستہ یقینی طور پر بند ہوجائے گا۔ ہمیں نئے راستوں اور نئی منزلوں کی جستجو کے لیے عصری تغیرات پر سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا۔

2022 میں قومی اور عالمی سطح پر بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ معاشرتی، سیاسی، اقتصادی، تمدنی اور تہذیبی سطح پر بہت کچھ نیا ہوا۔ دیکھا جائے تو ہر لمحے یہ دنیا اپنا رنگ و روپ بدلتی رہی۔ سائنسی و تکنیکی سطح پر نئے نئے تجربے ہوتے رہے۔ سوال یہ ہے کہ ان تجربوں میں ہمارا کتنا اشتراک ہے اور ہم ان تجربوں سے کتنا فائدہ اٹھا پا رہے ہیں۔ ادب بھی ایک تجربہ ہے اور گذشتہ چند برسوں میں کچھ نئے نئے تجربے بھی کیے گئے۔ اس سے قطع نظر کہ ان تجربوں کو کتنی مقبولیت ملی لیکن یہ بات باعث مسرت ہے کہ کم از کم تجربے تو کیے جا رہے ہیں، ورنہ عام طور پر ادب میں بھی جمود اور اضمحلال کی کیفیت طاری رہی ہے۔ وہ تحرک و طغیانی نہیں جو پہلے کے ادیبوں نے پیدا کرنے کی کوشش کی۔ زبان کی سطح پر بھی کچھ تجربے کیے گئے جن کے مثبت نتائج سامنے آئے، لیکن مجموعی طور پر محاسبہ کیا جائے تو ہمیں بہت سی سطحوں پر ابھی مزید متحرک اور فعال ہونے کی ضرورت ہے۔ اگر یہ فعالیت ختم ہوگئی تو ادب اور زبان دونوں کا بے حد خسارہ ہوگا۔ اردو زبان کا دائرہ وسیع تو ہو رہا ہے مگر بہت سے علاقوں میں یہ زبان سکڑتی بھی جا رہی ہے۔ اس لیے ہمیں اب کوشش کرنی ہے کہ جہاں جہاں ہماری اردو زبان سمٹ رہی ہے وہاں ایسی حکمت عملی اختیار کی جائے کہ وہاں اردو زبان کو زندگی بھی ملے اور اس کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہو۔ اردو سے جڑی ہوئی بہت سی تنظیمیں اور ادارے ہیں جو اس زبان کے تئیں خلوص اور محبت کا جذبہ بھی رکھتے ہیں وہ اگر اپنی کوششوں کا دائرہ اور وسیع کر دیں تو یقینی طور پر یہ زبان دور دور تک پھیلے گی اور ان علاقوں میں بھی اپنے مثبت اثرات اور بہتر نقوش قائم کرنے میں کامیاب ہوگی جو ہماری زبان کے لیے ہنوز نامانوس اور اجنبی ہیں۔

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

ماهنامه 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یه نهیں هوتا که محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکه رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا هوتا هے۔ ماضی میں مکتوبات بهت سے مضامین سے بهی زیاده بیش قیمت هوتے تهے که ان میں مشموله مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندهی کی جاتی تهی۔

قارئین سے گذارش هے که ماهنامه 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندهی کریں جنهیں نظرانداز کیا جاتا رها هے۔ آپ کے خطوط همارے لیے بهت اهمیت کے حامل هوتے هیں، ان سے همیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی هے۔ (اداره)

✉ 'اُردو دنیا' دسمبر اردو کے اب پ ت ث ج کے ساتھ رونق افروز ہوا۔ مدیر نے بڑا ہی خوبصورت اداریہ ہماری بات کے تحت لکھا ہے:

''یہاں کا اشرافیہ طبقہ اب شاید اردو زبان سے اتنی دلچسپی نہیں لے رہا ہے کہ انھیں اپنے بچوں کا مستقبل پیشہ ورانہ کورسز یا دوسری زبانوں میں نظر آتا ہے۔''

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے جو مشورہ دیا ہے وہ صد فیصد صحیح ہے:

''ہمارے یہاں اردو کی بہت سی تنظیمیں و ادارے ہیں جو اردو کے فروغ کے لیے

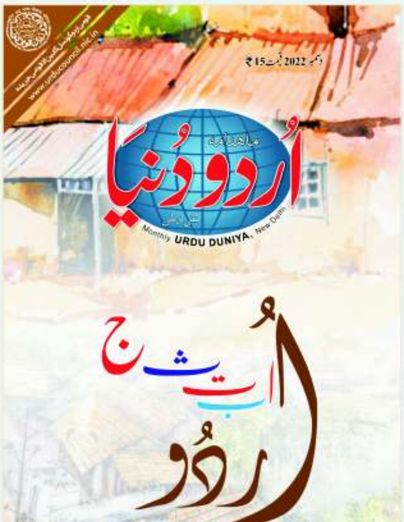

کوشاں بھی ہیں اور ان کے اندر جذبہ بھی ہے، جنون بھی ہے، اگر ایسے ادارے ترجیحی طور پر جھگی جھونپڑیوں اور پسماندہ بستیوں میں اردو زبان کی تعلیم کا نظم کریں تو یہ اردو کی ایک بڑی خدمت ہوگی اور یہ وسائل و ذرائع کا بہترین مصرف بھی ہوگا۔''

'بیگم صغرا ہمایوں مرزا اور ان کی اصلاحی، ادبی خدمات' پر مضمون خوب ہے۔ انھوں نے اسکول کا نام نہیں دیا۔ ہمایوں مرزا کے نام سے محلّہ ہمایوں مہدی پٹنم (Mehdi Patnam) میں ہے۔ ہمایوں نگر میں ہی صفدریہ گرلز ہائی اسکول (مدرسہ فوقانیہ صفدریہ اسکول) ہے، یہ لڑکیوں کا مدرسہ ہے۔ یہاں کے بہترین نتائج آتے ہیں اور یہ اردو میڈیم ہے، پہلے یہ نیم سرکاری تھا اب یہ ختم ہو چکا ہے۔ ابھی ہائی اسکول ہے۔ ڈگری کالج نہیں۔

'شبنمی نگاہ کا لافانی شاعر' امام اعظم کا مضمون خوب ہے۔ مختصر مگر خوب ہے۔ آصف جاہی نظم ونسق میں فارسی اصطلاحات، افسر احمد نے اچھا تجزیہ کیا ہے مگر اس پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے بلکہ اس پر پی ایچ ڈی ہو سکتی ہے۔ فارسی اصطلاحات پر جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ میں کام ہوا اور وہاں ہزاروں فارسی مخطوطات کے علاوہ فارسی سے دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ جامعہ عثمانیہ جو اردو یونیورسٹی تھی اس کو انگریزی بنانے کے بعد فارسی کام پر اثر پڑا۔ 'اردو شاعری میں استادی اور شاگردی' یہ موضوع ہمیشہ رہے گا اور آج بھی ہے مگر معیار بدل گیا ہے۔ تحقیق کرنے والوں کے لیے 'تحقیق میں مفروضے کی اہمیت' مضمون ان کو راہ دکھاتا ہے۔ متین اچل پوری اور ماحولیاتی ادب متین صاحب کو اچھا خراج ہے۔ ماہ دسمبر میں مولانا محمد علی جوہر پر مضمون ہوتا تو بہتر تھا۔ مجموعی اعتبار سے پرچہ خوب ہے جس کے لیے مدیر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

✍ **ڈاکٹر م ق سلیم**: صدر شعبۂ اردو، شاداں کالج، حیدرآباد، تلنگانہ

✉ 'اُردو دنیا' نومبر 2022 باصرہ نواز ہوا۔ سرورق پر بڑا ہی دلکش منظر کھینچا ہوا ہے کہ اوُ دی اوُ دی چوٹیوں پر مرمریں رداڈھلکی ڈھلتی ہوئی اور نشیب میں سرسبز ڈھلوانوں سے چکبست کا تفاخرِ برحق۔ اس کے مشمولات میں 14 شہ سرخیوں کے تحت زائد از 25 ذیلی سرخیاں قائم کی گئیں۔ اداریہ (ص4) سے ہمیں یہ قیمتی سبق ملتا ہے کہ ہم سب مل کر ہندوستان کی عظمتِ پارینہ کی بازیافت کے لیے بھرپور کوشش کریں۔ 'ربط والتفات' (ص5) میں دو مکتوب درج ہیں۔ 'زبان اور زمینی صورت حال' (ص7 تا ص10) کے تحت 'زبان کو زندہ رکھنے کے لیے مقتضائے وقت اور عصری مطالبات ضروری' دیا گیا ہے۔ دراصل 'اردو دنیا' کے فراہم کردہ سوالنامے (ص6) کے دروبست میں لکھا گیا مضمون ہے۔ اس میں 'مقتضائے وقت' اور 'عصری مطالبات' دونوں ہی ہم معنی اور غالباً ایک ہی مفہوم ادا کرتے ہوں گے پھر دونوں کو ایک ساتھ لکھنے میں کچھ تو ادبی حکمت ہوگی تو کیا ہوگی۔ سوچنے کی بات ہے۔ اس کا متن کم و بیش وہی معلومات فراہم کرتا ہے جو سوالنامے کا تقاضا ہے۔ مضمون معلوماتی ہے۔ پڑھنے سے علم میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ 'ادب: زاویے اور جہات' (ص11 تا26) میں پانچ مقالے دیے گئے ہیں۔ پانچوں پڑھنے کے لائق ہیں۔ 'ڈرامہ انارکلی.....' کے پس منظر میں فلم 'مغل اعظم' کی تصاویر دی گئی ہیں جبکہ فلم کی تصاویر اور مضمون کے متن میں قطعی یکسانیت نہیں ہے گو کہ کرداروں کے ناموں میں کافی مشابہت ہے۔

دوسرا مضمون 'ساحر لدھیانوی کی شاعری میں پیکر تراشی' (ص14) اس مضمون کے دوسرے پیراگراف میں لکھا گیا ہے کہ ''ساحر کی شاعری میں شعری پیکر کی تلاش سے پہلے یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ پیکر کسے کہتے ہیں۔'' پھر پیکر کی تعریف و وضاحت میں گاہ گاہ بڑا زور صرف کیا گیا ہے۔ اس کے بجائے کم سے کم الفاظ میں محض یہ لکھا جاتا کہ ''کسی ذہنی فکر اور اس کے عملی اظہار کو پیکر کہتے ہیں'' تو بات بن جاتی۔ قطع نظر اس کے مضمون نہایت عمدہ اور قابل تعریف ہے۔ مصنفہ کو زبان و بیان اور پیش کش پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ کلام کا انتخاب بھی سلیقے کا غماز ہے۔ 'میراجی کی فکری جہات' اور 'اردو کے دخیل الفاظ اور رشید حسن خاں' دونوں ہی مضامین خالص ادبی ہیں۔ ادب کے طلبہ اور اساتذہ کو ان سے ضرور مستفید ہونا چاہیے۔ 'داستانوں کے مافوق الفطری تصورات کا ٹکنالوجی میں اطلاق' نہایت ہی اچھوتا مضمون ہے کہ قدیم طلسمی کہانیوں کو آج ٹکنالوجی سے کیسے ہو بہ ہو بلکہ اس سے کہیں زیادہ ممکن بنا دیا گیا ہے۔ یہ مضمون پڑھ کر طبیعت باغ باغ ہوگئی۔ اس کی ہیئت میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ناقابل یقین کہانی کو فاضل مصنف نے جدید ایجادات سے بخوبی مربوط کر دیا ہے۔ بہت خوب بہت مبارکباد۔ 'لعل و گہر' (ص27 تا35) کے تحت ادبا و شعرا پر چار تاثراتی مقالے شامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام تر توصیفی ہیں لیکن تعریف و توصیف کے توسط سے کچھ محاسن سے واقفیت ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ ویسے چاروں ہی مقالے معیاری ہیں۔ ان کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ 'ذکر ن.م. راشد' (ص36 تا46) اسے گوشہ ن.م. راشد کہیے۔ اس میں تین مضامین رکھے گئے ہیں۔ پہلا مضمون اساطیری حوالے سے لکھا گیا ہے۔ قابل مصنفہ نے پہلے اساطیر کی اصطلاح کی بخوبی صراحت کی ہے کہ یہ عربی لفظ ہے اور اس کا واحد اسطورہ ہے۔ یہ قدرے طویل پر مسلسل مضمون ہے اور اس میں کوئی گوشہ تشنہ نہیں اور ایک خاص بات یہ کہ تمام تر مضمون میں راشد کے کلام کی کوئی مثال پیش نہیں کی گئی گو کہ نظموں کے عنوانات سے کام لیا گیا ہے۔ بلکہ اس میں ایک تحقیقی اور تنقیدی لگن کے تسلسل کا احساس ہوتا ہے۔ لاجواب مضمون ہے۔ 'ن.م. راشد' شمیم حنفی کی نظر میں (ص40) اسے یوں سمجھیے کہ افلاطون کے مطابق شاعر جس چیز کی نقل کرتا ہے وہ حقیقت سے دو درجہ دور ہوتی ہے۔ اب اور کیا لکھیں خود تحقیق کر کے کچھ لکھتے تو ایک بات بھی تھی۔ اس سلسلے کی آخری کڑی 'احتجاجی فکر اور ن.م. راشد' (ص44) ہے کہ وہ ایک انقلابی ہی نہیں بلکہ باغی شاعر کی حیثیت سے ہمارے ادب کا حصہ ہے۔ 'خراج عقیدت' (ص47 تا53) میں اصغر عباس اور رضوان اللہ فاروقی کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ 'سلسلۂ صحافت' (ص54 تا57) کے ذیل میں تکنیکی مضمون 'کمپیوٹر پر دیدہ زیب صفحہ سازی کا طریقہ' دیا گیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ سرخیوں کی جانب قارئین کی توجہ کھینچنے کے لیے کس طرح سے سرخی سازی کی جائے۔ یہ ایک ایسا فن ہے جس کے لیے برسوں مشق کرنی پڑتی ہے۔ 'نکہت نیّر' (ص58 تا62) اس کے ذیل میں نیر مسعود کے فن پر گفتگو کی گئی ہے۔ 'تاریخ' (ص63 تا66) اس کے تحت اقتدار حسین صدیقی کے چند مضامین کی روشنی میں عہد وسطیٰ کا جائزہ لیا گیا ہے جبکہ 'خصوصی گفتگو' (ص67 تا70) کے تحت حبیب کیفی سے ان کے علمی سفر سے متعلق طویل گفتگو کی گئی۔ 'کتابوں کی دنیا' (ص71 تا80) میں کوئی درجن بھر کتابوں پر تبصرے درج ہیں تاکہ آپ درکار کتابوں کا باسانی انتخاب کر سکیں۔ ص81 پر 'عالمی اردو نامہ' اور اخیر میں 'خبر نامہ' (ص82 تا98) میں اردو دنیا کی خبریں ہی خبریں دی گئی ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

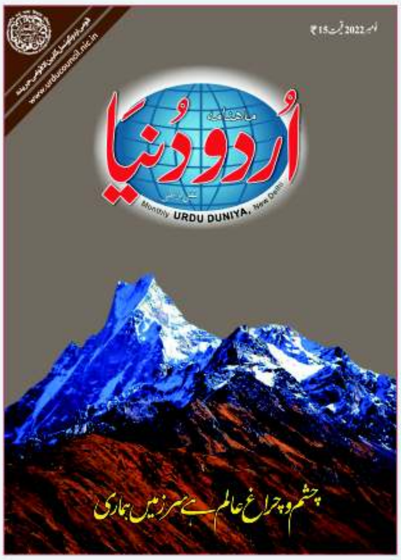

مصطفیٰ ندیم خاں غوری: بی-11، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

■

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا
نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم 'زبان اور زمینی صورت حال' کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال سے آگاہ ہوسکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورتِ حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

شاعری کیا ہے؟

سید نفیس دسنوی

انسان فطرت کواپنے احساسات میں اوراپنی ذات کوفطرت کی نیرنگیوں میں تلاش کرتا رہتا ہے۔یہی جستجو جب کسی باشعور ذہن میں لفظ ومعنیٰ جذب وافکار کا پیرہن تلاش کرلیتی ہے تو 'شاعری' میں ڈھل جاتی ہے۔شاعری دراصل انسان کے جمالیاتی شعوراورحسِ ذائقہ کی ترجمانی 'نمائندگی اور اظہارِ ذات کا خوبصورت وسیلہ ہے۔فکر و وجدان کی آمیزش سے شاعری ایک ایسے تجربے کا رتبہ حاصل کرلیتی ہے جس کی ہمسری دیگر فنونِ لطیفہ نہیں کرسکتے۔ شاعری دراصل الفاظ کی تصویر کشی ہے۔یہ انسانی جذبات کو لطافت ونزاکت اور جذبہ وتمازت کا پیرہن پہنا کرالفاظ بند کرنے کا ہنر ہے۔کسی خیال کا محض ذہن میں پیدا ہونا ہی شاعری نہیں، بلکہ اس خیال کو فنکاری کے ساتھ دوسروں کے دلوں میں اتارنا شاعری ہے۔انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے احساسات، جذبات اور مافی الضمیر کوخوب سے خوب تر اور دلنشیں انداز میں دوسروں تک پہنچائے،یہی جذبہ شاعری کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے۔یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شاعری محض قافیہ پیمائی نہیں بلکہ معنیٰ آفرینی کا فن ہے۔یہ ذات سے کائنات تک کی سیروسیاحت اورخود آگہی کا بہترین وسیلہ ہے۔یہ بھی کہا جا سکتا ہے شاعری ماضی، حال اور مستقبل کو ہم عصر بناتی ہےاورزمان ومکان کی قید سے اس کوآزاد کرتی ہے۔

دانشورانِ ادب کا کہنا ہے کہ شعرموزوں کر لینا ہی کمالِ فن نہیں، بلکہ کمالِ فن تو یہ ہے کہ شعر میں کوئی نیا زاویہ، کوئی اچھوتا خیال اور فکری سطح پر جدت وندرت کا ایک ایسا امتزاج پیش کیا جائے جو براہ راست دل میں اتر جانے کی خاصیت رکھتا ہو۔کوئی اچھا اور فطری شاعر جب شاعری کرتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے اشعار کا نزول ہو رہا ہے،الفاظ صف بستہ کھڑے ہیں،مفہوم ومعنی ایک طلسمی ترتیب اختیار کرتے جا رہے ہیں اور بحورواوزان کے سانچے میں ڈھلتے جارہے ہیں۔ایسے شعرا کے اشعار قاری اورسامع کے ذہن میں اتر کراپنے دائرۂ اثر کو کچھ اس طرح وسیع کرتے ہیں کہ رموز و نکات،مفہوم ومعنی کی پرتیں روشن ہوتی جاتی ہیں۔مغربی ادب میں شعر کی تعریف کچھ یوں کی گئی ہے کہ جو خیال ایک غیر معمولی اورنرالے طور پر لفظوں کے ذریعہ اس طرح ادا کیا جائے کہ قاری اور سامع کا دل اس کوسن کرخوش اور متاثر ہو وہ شعر ہے خواہ نظم میں ہو یا نثر میں مگر مشرقی شعروادب میں یہ تصور پیش کیا گیا ہے کہ وہ موزوں کلام جو بالارادہ کہا گیا ہواورانسانی جذبات کو برانگیختہ کرتا ہو وہ شعر ہے۔شاعری دراصل ایک خدا داد صلاحیت ہے جو روح کو بالیدگی،افکارواحساسات کووسعت اور پروازِ تخیل کوعروج بخشتی ہےاور وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کا جلوہ دکھاتی ہے۔یہ انسان کے دل میں وہ سوزوگداز پیدا کرتی ہے جواشعار کے قالب میں ڈھل کر باذوق سماعتوں کواپنی گرفت سے نکلنے نہیں دیتی۔شاعری کی تعریف یوں بھی کی گئی ہے کہ''یہ ایک ایسا شعلہ ہے جو خودبخود دھڑک اٹھتا ہے'ایک ایسا چشمہ ہے جوخودبخود ابل پڑتا ہے،ایک برق ہے جوخودبخود کوند جاتی ہے۔'' کلاسیکی اردو شاعری اپنے اسرارورموز دھیرے دھیرے منکشف کرتی ہےاوراپنے ملکوتی حسن کوایک اندازِ دلبری سے بے نقاب کرتی ہے۔وہ اشعار جن میں ایک دلفریب دیوانگی کا کیف وسرور ہو،نشاط وکرب ہو وہ براہ راست دل میں اتر جاتے ہیں۔ایک فطری شاعر کے اشعار میں دھیما دھیما سا سلگتا سا نرم ونازک لہجہ اس کے احساسات کی تمازت کا پتہ دیتا ہے۔ پیرایۂ اظہار میں کلاسیکی رچاؤ اس کے اسلوب کووقار اور تمکنت عطا کرتا ہے اور کلام میں استعارہ وعلامتوں کی فنکارانہ زرکاری اس کی فنی بصیرت اور تجربات کا اشاریہ بن کرابھرتی ہے۔اسی لیے کہا جاتا ہے کہ سمندرکو قطرے میں سمیٹ لینا اورقطرے میں سمندر کا جلوہ دکھا دینا ہی شاعری ہے۔

لب ولہجہ میں شائستگی،طرز بیان میں متانت اور وارداتِ قلبی میں اظہار کا سلیقہ رچ بس جاتا ہے تو اس کی چاشنی قاری اور سامع کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔یہ حقیقت ہے کہ شاعری کا خمیر انسانی کردار کی داخلی تہذیب،عرفانِ ذات اور وجدانی کیف وکم کے خمار سے اٹھتا ہے جو زندگی کے ردِعمل کا خوبصورت اظہاریہ ہوتا ہے۔شاعر کا حسِ ذائقہ اسے الہامی بلندیوں سے ہمکنار کرتا ہے۔ ایک اچھا شعر بعض اوقات صدیوں کولمحوں میں سمیٹ لینے کی صلاحیت رکھتا ہے،ایسا شعر جہاں سے ختم ہوتا ہے وہیں سے فکرواحساس کے سلسلے شروع ہوتے ہیں۔ایسی ہی شاعری 'عالمی سطح' کے زمرے میں شامل ہونے کا امکان رکھتی ہے۔بڑی یا عظیم شاعری لازمانی اور لافانی ہوتی ہے۔وہ جیسے جیسے وقت کے دوش پر سفر کرتی ہے، شرابِ کہنہ کی طرح اس کا نشہ تیز سے تیز تر ہوتا جاتا ہے۔شاعری دراصل وہ سیماب صفت فن ہے جسے اپنی گرفت میں لینے کے لیے ہر شاعر عمر بھر کوشاں رہتا ہے،مگر احساسِ نارسائی کے باوجود اس لیلیٰ سخن کے عشق سے دست بردار ہونا نہیں چاہتا۔معیاری شاعری کے لیے لازم ہے کہ فکر میں گہرائی ہو، رموزِ فن پہ دسترس ہو اور شاعر میں قادرالکلامی کی صفت موجود ہو'تاکہ پامال مضامین میں بھی تازہ کاری پیدا کی جا سکے اوراس میں نئی زندگی بخشی جا سکے۔فنکار کا شعر اتنا اثر انگیز ہو کہ سامع یا قاری یہ محسوس کرے''گویا یہ بھی میرے دل میں ہے'' تب ہی اسے اچھا شعر کہا جاسکتا ہے۔اسے اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ جو خیال یا کلام انسانی جذبات کو برانگیختہ کرے اور فنی لوازمات کے ساتھ تحریک پیدا کرے وہ اچھا شعر ہے۔شرط صرف یہ ہے کہ شعر سامعین یا قارئین کے جذبات پر وہی اثرات مرتب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو جو صاحبِ کلام یا شاعر کے دل ودماغ پر طاری ہوا ہو۔سچ تو یہ ہے کہ ایک باشعور شاعر کے وارداتِ قلبی،خواہ داخلی محرکات کا نتیجہ ہوں یا خارجی محرکات کے ترجمان، ڈھلیں گے تو صرف ان سانچوں میں ہی جنھیں فنونِ لطیفہ کہا گیا ہے۔ایک شاعر کسی خیال کو اپنے ذہن اور روح میں حل کرکے پیش کرنے کے ہنر سے واقف ہوتا ہے،جس سے اشعار میں

سحر آگیں کیفیت پیدا ہوتی ہے۔اشعار کی تخلیق آسان نہیں،شاعر اپنے تجربات ومشاہدات کوتحلیل نفسی کے عمل سے گزار کر فکرواحساس کے سانچے میں ڈھالتا ہے اور پھر الفاظ بند کر کے اشعار کی صورت میں زمانے کو پیش کرتا ہے۔یہی اس کے تخلیقی عمل کا ماحصل ہوتا ہے۔شاعری کا بنیادی مقصد جمالیات زیست کے شبنمی خدوخال تک رسائی ہے۔خواہ وہ فکر کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہو یا کیف وکم کے حوالوں میں روپوش ہو یا زندگی کے تلخ وشیریں تجربات کے 'کتھا رسس' میں محفوظ ہو۔مگر وہ شعری کاوش جو جمالیاتی شعور اور حسنِ بیان سے عاری ہو وہ 'کوہ کندن وکاہ بر آوردن' کی مثال بن جاتی ہے۔

وزن، قافیہ، ردیف اور دیگر لوازمات شعر کے حسن اور اس کی سحر کاری کو دوبالا کر دیتے ہیں۔مثال کے طور پر قیمتی مشروب اگر جام سفال میں پیش کی جائے تو گوارہ کر لی جاتی ہے،مگر وہی مشروب بلوری آبگینوں میں پیش کی جائے تو چیزے دیگر نظر آتی ہے۔یہی کیفیت ان اشعار کی ہے جو فنی لوازمات سے مرقع ہو کر تخلیقی کینوس پر ابھرتے ہیں۔ ایک اچھا شاعر جب اپنے احساسات، خیالات اور تجربات کو جذبات کے نقرئی پنوں میں لپیٹ کر پیش کرتا ہے تو خیال وفکر کی یہی فنکاری 'شاعری' کہلاتی ہے۔بہ الفاظ دگر ان محرکات کے مرکب سے الفاظ کی مرقع سازی کا فن ہی دراصل شاعری ہے۔ معیاری شاعری میں ابہام بقدر نمک،اور موسیقی ریز الفاظ کا انتخاب اور ان کی فنکارانہ ترتیب شعر کو'سحر کاری' کے زمرے میں لے جاسکتی ہے۔شعر گوئی صحیح معنوں میں ایک مشکل فن ہے اور یہ شاعر سے محسوسات اور تصورات کی ایک دنیا آباد کرنے کا تقاضا کرتی ہے۔شاعری صرف خیالات سے نہیں بلکہ الفاظ کے خوشنما ڈھانچے کی تشکیل سے ہوتی ہے،جس میں احساسات اور تصورات سے گوشت پوست کی ہیئت سازی کی جاتی ہے اور جذبات کی تمازت اس میں اثر انگیزی کی روح پھونکتی ہے۔کہا جاتا ہے کہ شاعری احساسات کا عکس مکرر اور فطری حقائق سے اعلیٰ تر شے ہے۔مختصراً شاعری آفاقیت کا اظہار ہے، جزئیات کا نہیں۔عشق حقیقی ہو یا عشق مجازی' غزل دراصل عشقیہ شاعری ہے اور حسن وعشق انسانی جذبوں کا فطری چہرہ۔

شاعری اعلیٰ ترین شعور وآگہی کے سرچشمے سے پھوٹتی ہے،جس کی ہم سری نہ سائنس کر سکتا ہے اور نہ ہی فلسفہ۔ایک فلسفی سوچ سکتا ہے مفکر اسرار ورموزِ حیات تک رسائی حاصل کر سکتا ہے مگر انہیں موزوں اظہار کا پیرہن صرف ایک شاعر عطا کر سکتا ہے۔شاعر بظاہر حجرۂ تنہائی میں پڑا رہتا ہے مگر اس کی فکرِ رسا سارے عالم کا جائزہ لیتی رہتی ہے۔شاعر کا تخیل جس درجہ بلند ہوگا شاعری بھی ویسی ہی اعلیٰ درجہ کی ہوگی۔تشبیہہ واستعارہ کا حسن شاعر کی جدت طرازی اور ندرتِ بیان میں پوشیدہ ہوتا ہے اور یہی جدت اسلوب اور طرزِ ادا کہلاتی ہے۔ اسلوب اور اندازِ بیان کی تعمیر میں الفاظ کا ہنرمندانہ استعمال بے حد اہم ہے، کیونکہ الفاظ کی خاصیت، نشست اور ترتیب کا حسن ہی شاعری کو اثر آفرینی عطا کرتا ہے اور اسلوب میں دلکشی پیدا کرتا ہے۔افکار وخیالات کے کسی جواہر پارے پر جب اس کی نظر پڑتی ہے تو وہ اسے اٹھا کر اپنے دستارِ فن کی فضیلت بنا لیتا ہے۔کسی شاعر کا شعری اسلوب اور قوتِ اظہار پر اس کی دسترس اور رمزیت اس کی شاعری کو ایک مکمل اکائی میں تبدیل کر دیتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ جذبہ جنون شاعری کی روح اور شاعری اظہار ذات کا سب سے خوبصورت اور موثر وسیلہ ہے۔

ایک شاعر ذہن کی میکانیکی قوت کے دائرے سے نکل کر احساسات کی لامحدود وسعتوں میں سفر کرتا ہوا عدم آگہی کے دبیز پردوں کے اس پار دیکھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس درونِ ذات سے کائنات تک کے سفر میں وہ وجدان کی کیفیت کے منازل سے گذرتا ہے جہاں دوسروں کی رسائی ممکن نہیں۔اس مقام پر نہ شعور کی دسترس ہوتی ہے اور نہ لاشعور کی پیچیدگیاں۔شاعر کی خداداد حس کائنات کے رموز واسرار سے ہم آہنگ ہوتی ہے اور وجودی نیز محرکاتی پس منظر تک پہنچ کر اس کا تجزیہ کرتی ہے،ہیئت کو ماہیت میں ڈھالتی ہے اور فنی حس وذائقہ کے جمالیاتی تموج سے گذر کر انہیں الفاظ کا شعری پیکر عطا کرتی ہے۔ ایک شاعر لفظوں کے بطون میں پوشیدہ مفہوم ومعنی میں روح پھونکتا ہے جس کی رمزیت باذوق قاری اور سامع کے شعور وادراک کو متحرک کرتی ہے اور اسے سحر انگیز کیفیت سے ہمکنار بھی کرتی ہے۔ایک سچا شاعر کرب واحساس کے بے آب وگیاہ صحرا میں ایک مدت بھٹکتا ہے تب کہیں جا کر لیلیٰ' سخن اس پر مہربان ہوتی ہے اور اپنے ملکوتی حسن کی جھلک دکھلاتی ہے۔کسے معلوم کہ ایک شعر کی تخلیق کے لیے شاعر کن اذیتوں سے گذرتا ہے،اور زندگی کو شاعری اور شاعری کو زندگی بنانے کا سفر اسے کس طرح آبلہ پائی کی سوغات سے نوازتا ہے۔ایک ناقص شاعر تھوڑی سی تگ ودو کے بعد کسی ایک لفظ پر قناعت کر لیتا ہے جبکہ ایک کامل شاعر مناسب لفظ کی تلاش میں زبان کے بحرِ بے کراں کو کھنگالتا ہے' تب جا کر کسی لفظ سے مطمئن ہوتا ہے۔ایک شاعر کو جب تک ذخیرۂ الفاظ پر دسترس حاصل نہ ہو اور اس میں فکر وجستجو کا مادہ نہ ہو،اس کی فطرت میں تحمل نہ ہو، یہ ممکن نہیں کہ وہ ایسا فن تخلیق کر لے جو شائقین ادب کے دلوں پر اپنی حکمرانی قائم کر سکے۔

شاعری میں اشارات وکنایات،تشبیہات واستعارات صنفِ شاعری کی وہ ادائیں ہیں جو طبیع موزوں کو اپنا دیوانہ بنا لیتی ہیں، وہیں فکر ونظر کی بالیدگی، تخیل کی بلند پروازی، دروں بینی اور معنوی تہہ داری وہ خصوصیات ہیں جو کسی باذوق قاری یا سامع کو روا روی میں آگے بڑھنے نہیں دیتیں بلکہ روک کر کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔اسی طرح فصاحتِ کلام اسلوب کا وہ بنیادی عنصر ہے جس کا تعلق شاعری کے لفظی پہلوؤں سے جڑا ہوا ہے۔وضاحت' سہولتِ اظہار، روانی، سلاست اور برجستگی کا آمیزہ اس میں جزو لازم کی حیثیت رکھتا ہے۔اس کے برخلاف بلاغت کا تعلق الفاظ سے کم مگر معنی سے زیادہ ہوتا ہے۔ بلاغت کے اجزائے ترکیبی میں واقعیت، جذبات نگاری، مناظرِ فطرت کی مرقع کشی اور واقعہ نگاری وغیرہ شامل ہیں۔شاعری میں تخیل اور محاکات بنیادی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان ہی دونوں کے امتزاج سے اچھی شاعری وجود پذیر ہوتی ہے۔اچھی شاعری وہ ہے جو بصیرت افروز ہو، کائنات کے رموز واسرار سے ذہن کو منور کر سکے اور دل کو وجدانی کیفیت سے آشنا کر سکے۔دراصل شاعری میں ذوق ووجدان اس کی داخلی کیفیت کی غمازی کرتے ہیں۔

شاعری کے حوالے سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ خالقِ مطلق نے انسان کو دو صلاحیتوں سے نوازا ہے، ایک 'ادراک' دوسرا 'احساس' اور ادراک کی تحریک پر شاعر کے ذہن میں ایک خیال بن کر ابھرتا ہے اور اس کا اظہار اوزان کی پابندی اور دیگر لوازمات کے ساتھ کیا جاتا ہے تو قارئین اور سامعین کا ذہن بھی شاعر کے احساسات سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے اور ایسا کلام 'شعر' کہلاتا ہے۔سنگلاخ اور مشکل ردیفوں میں غزل کہنا قادرالکلامی اور فنی گرفت کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔اساتذہ فن نے ہنرمندی کے ساتھ انہیں برت کر اپنی فنی مہارت کا ثبوت بھی دیا ہے۔دراصل ہر شاعر اپنی ایک انفرادی اکائی (Unit) کی حیثیت رکھتا ہے، جس کا اپنا استعاراتی، محاکاتی اور علامتی نظام ہوتا ہے اور اپنا پیرایۂ اظہار بھی۔تفہیم وترسیل اور رمزوکنایہ اس کے اسلوب کی علامت بن کر ابھرتے ہیں اور شاعر کے لب ولہجے کی تراش خراش ہی اسے دوسرے شعراء سے الگ اس کی اپنی انفرادی شناخت عطا کرتی ہے۔ ایک اچھے شاعر کے لیے لازمی ہے کہ اس کی شاعری کا کینوس وسیع ہو جس میں وہ بنی نوع انسان کے احساسات کی ترجمانی

کر سکے‘شاعری کے رموز ونکات، اوزان وبحوراور الفاظ کی نشست وبرخواست پر کامل ملکہ رکھتا ہو،شاعری کلاسیکی روایات کی پروردہ ہو،ساتھ ہی عہدِ حاضر کے نت نئے مسائل سے رشتہ بھی قائم کرنا چاہتی ہوتا کہ ایک آفاقی ماحول کی تشکیل ہو سکے۔لہٰذا ایک حساس شاعر کے لیے اپنے عہد کے اجتماعی شعور سے ہم آہنگی لازمی ہے۔شاعری کو قابلِ قبول اور مروجہ ہیئتوں میں محفوظ رکھنا بھی ادبی ذمہ داری ہے۔

شاعر کا دل بربطِ صفت ہوتا ہے۔جب اس کے دل پر واقعات اور حادثات کا مضراب ضربیں لگاتا ہے تو لاشعور کے پردوں پر ارتعاش سا پیدا ہوتا ہے اور کیف ومسرت،سوز وگداز کی ترنگ موسیقی ریز ترتیب میں الفاظ کا جامہ پہن لیتی ہے۔اس طرح ’شاعری‘ وجود میں آتی ہے۔ایک سچا شاعر لفظوں کا بازی گر ہو نہ ہو مگر جذبات شناس اور رموز آشنا ضرور ہوتا ہے۔کسی بڑے شاعر کی شناخت یہ بھی ہے کہ قاری اور سامع کے فہم وادراک کے مطابق اس کی شعری شخصیت خود بخود سمٹتی اور پھیلتی رہتی ہے۔کبھی ایک شعر میں تو کبھی دیوان میں۔ہوتا دراصل یہ ہے کہ انسان کے دل میں محسوسات کی ترنگیں دائرہ در دائرہ پھیلتی وسمٹتی رہتی ہیں۔بقول عابد پشاوری ’شعرا کے دو قبیلے ہیں ایک ’فطری‘ دوسرا ’مشقی‘۔مگر یہ ضروری نہیں کہ فطری شاعر کو مشق کی ضرورت نہیں ہوتی،اسے بھی مشق کی ضرورت ہوتی ہے،مگر ایک فطری شاعر جو کچھ کہتا ہے،دل سے کہتا ہے اور اس کے کلام میں ’’از دل خیزد، بر دل ریزد‘‘ والی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جبکہ ایک مشقی شاعر اپنے دماغ سے کام لیتا ہے جس کی وجہ سے اس کا کلام ’فکری شاعری‘ کے دائرے میں محدود ہو کر رہ جاتا ہے، جس سے تاثر کا فقدان ہوتا ہے۔اس عمل کو شاعری کی لغت میں ’آمد‘ اور ’آورد‘ کی شاعری سے موسوم کیا جاتا ہے۔اس لیے کہا گیا ہے کہ شاعری کا فن اکتسابی نہیں بلکہ عطیہ الٰہی ہے۔کسی شاعر کا وجدانی شعور جب بیدار ہوتا ہے تو ایسے اشعار کا نزول ہونے لگتا ہے جو ’الہامی شاعری‘ کے وقار سے ہم کلام کرواتی ہے۔

انسان عموماً اپنے لاشعور میں مخفی جذبات واحساسات سے پوری طرح باخبر نہیں ہوتا،محض ایک دھندلا دھندلا سا نقش ہوتا ہے جسے وہ واضح طور پر محسوس نہیں کر سکتا۔اس کے برعکس ایک شاعر ان لاشعوری محرکات کو واضح طور پر محسوس بھی کر سکتا ہے اور انہیں الفاظ کے موزوں سانچے میں ڈھال بھی سکتا ہے اور ایسے نقوش خلق کرتا ہے جنہیں دیکھ کر قاری اور سامع کے لاشعور میں مستور وہ دھندلا سا نقش جگمگا اٹھتا ہے اور وہ ایک مسرت زا حیرت میں ڈوب جاتا ہے کہ جو کچھ اس کے دل میں تھا اسے شاعر نے کیسے سمجھ لیا۔وہ شاعر کا دل اپنے سینے میں دھڑکتا محسوس کرتا ہے اور جذباتی زیر و بم کے تحت الشعور میں جذب ہوتا ہوا دیکھتا ہے۔شاعری کی تعریف کچھ یوں بھی کی گئی ہے کہ ’’یہ فکر واحساس کا وہ سرچشمہ ہے جو وقت کے دھارے پر بہتے ہوئے ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کو سرسبز وشاداب کرنے اور تشنگانِ فن کو سیراب کرنے کا اعلیٰ ترین وسیلہ ہے‘‘۔تاثر انگیز اشعار اسی قبیل کے اشعار کو کہا جاتا ہے جو شاعری کی روحانی اور داخلی کیفیات کا اشاریہ ہوں اور جو قاری یا سامع کو ایسے تجربات سے دوچار کریں جن کی کسک انہیں دیر تک اپنی گرفت سے نکلنے نہ دے۔

’شعر‘ دراصل عربی نژاد لفظ ہے جس کا لغوی مفہوم ’زیرکی اور دانائی‘ اور عقل کی باتیں ہے۔شعر سے مراد ہے ایک احساس،وہ احساس جس کے ذریعہ انسان بنا دیکھے اور چھوئے سمجھ لینے کی قدرت رکھتا ہو۔اس لیے شاعری میں احساس کی لچک اور شعور کی پختگی جزوِ لاینفک کی حیثیت رکھتی ہے۔جس طرح دنیا کا کوئی بھی موضوع نیا نہیں ہوتا، اسی طرح شاعری کے موضوعات بھی ہمیشہ نئے نہیں ہوتے،بس شاعر کے اندر کا چھپا ہوا فنکار اپنے مخصوص لب ولہجہ، رنگ وآہنگ، برتنے کے انفرادی انداز اور طریقہ اظہار کی صناعی اور فکر وجذبہ کے ذریعہ انہیں نیا پن عطا کرتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ دل کے زخم اگر لَو نہ دیں تو الفاظ کے چراغ روشن نہیں ہوتے۔ایک سچا شاعر وہ ہے جس کے واردات قلبی اپنے ہوں، سرگذشت اپنی ہو اور پیرایۂ اظہار اپنا ہو اور الفاظ کی قدر وقیمت احسن طریقے سے معلوم ہو،اس کے خواب بھی ہوں اور شکستہ خوابوں کی تعبیر بھی ہو‘پیش کش میں تہہ داری کا حسن ہو اور طریقۂ اظہار میں تازہ کاری بھی۔کہتے ہیں شاعری ’اشاروں کنایوں‘ میں بات کہنے کا وسیلہ ہے۔غالباً اسی لیے ڈاکٹر علامہ اقبال نے کہا ہے کہ ’’موزوں شعر کہنے کے لیے خونِ جگر صرف کرنا پڑتا ہے‘‘ اور مولانا الطاف حسین حالی نے بجا طور پر فرمایا کہ ’’ایک شاعر کو ایک ایک لفظ کے لیے ستر ستر کنویں میں جھانکنا پڑتا ہے‘‘۔مولانا شبلی نعمانی کے خیال میں ’شاعری دراصل دو چیزوں کا نام ہے،’’محاکات اور تخیل‘۔ان میں سے اگر ایک بھی بات پائی جائے تو ایک شعر،شعر کہلانے کا مستحق ہوگا،باقی اوصاف یعنی سلاست، صفائی، حسنِ بندش وغیرہ اجزائے اصل نہیں بلکہ عوارض اور مستحسنات ہیں۔میر تقی میر اور مرزا غالب نے ہمیشہ شاعری کے اصل مزاج کو سامنے رکھا اور ان دونوں کا ماننا ہے کہ شاعری اور خطابت کے درمیان حدِ فاصل رکھنا ضروری ہے۔اُس دور میں اردو شاعری کو ایک نیا مزاج ملا،خودداری اور انا کے تیور ملے اور لہو کے گھونٹ پی کر بھی مسکرانے کی ادا ملی۔ایک بڑے شاعر کی پہچان یہ بھی ہے کہ وہ جس صنفِ سخن میں طبع آزمائی کرے اس کے ان امکانات کو روشن اور واضح کرے جو اس سے پہلے ناپید تھے یا ممکنات کی حد سے باہر تصور کیے جاتے تھے۔اسی طرح کسی عہد ساز شاعر کو کسی مخصوص دائرے میں محدود نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کی شاعری میں حال سے زیادہ مستقبل جھلکتا ہے۔صوفیوں اور مسلم شعرا نے ہندوستانی طرزِ فکر اور فلسفہ، تہذیب وتمدن کے مقامی رنگ وآہنگ سے استفادہ کرنے میں ہمیشہ فراخ دلی کا ثبوت دیا ہے جس کے نتیجے میں اردو شاعری کا گنگا جمنی رنگ بے حد دلکش اور اثر انگیز ہوگیا ہے۔

رشید احمد صدیقی کہتے ہیں ’’شاعری دنیا کی مادری زبان ہے،اس لیے شاعری میں مخصوص ذہن، زندگی اور زمانے کی ترجمانی اور تلاش بہت ضروری اور فطری ہے۔ ہاں ایسی شاعری میں اعلیٰ لسانی اور فنی قدروں کا ہونا بھی اسی قدر اہم اور ناگریز ہے۔‘‘

مولانا الطاف حسین حالی ایک جانب شاعری کو فطرت کی طرف لے جانے کی تلقین کرتے ہیں تو دوسری جانب یہ بھی فرماتے ہیں کہ صرف فطرت کا مطالعہ اور معلومات کا ذخیرہ جمع کر لینا ہی شاعر کا کام نہیں بلکہ ہر شے کی روح میں جو خاصیتیں ہیں ان کا انتخاب کرنا اور ان کو شاعری کی طرف مائل کرنا بھی ایک شاعر کا فرض ہے۔پروفیسر کرامت علی کرامت مرحوم فرماتے ہیں ’’کہ کسی شعر کے لیے جذبات ہی سب سے اہم ہیں،اور اگر جذبات میں ندرت ہو تو فرسودہ الفاظ میں بھی نئی جان ڈالی جا سکتی ہے،مرحوم مزید فرماتے ہیں کہ صنف غزل حسن وعشق کی داستان سے شروع ہو کر مختلف داخلی اور خارجی مدارج طے کرتے ہوئے ایک ایسے مقام پر پہنچ چکی ہے جہاں وارداتِ قلبی کی اہمیت کو اکثر اربابِ ذوق نے تسلیم کر لیا ہے،اس لیے اردو شاعری میں جا بجا نادر ذہنی پیکر (Images) بھی نظر آتے ہیں۔کرامت صاحب مرحوم نے ایذرا پاؤنڈ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ کسی شاعر کے لیے زندگی بھر صرف ایک ذہنی پیکر کی تخلیق کرنا ایک ضخیم شعری مجموعہ کی تخلیق سے بہتر ہے (شاخسار کے اداریے اور تبصرے)۔ شاعری کے حوالے سے انہوں نے ایک مفید مشورہ بھی دیا ہے کہ ’’شاعر کو محض مشاقی سے آگے بڑھ کر شعر میں خیال اور اسلوب کے لحاظ سے کچھ نئی بات پیدا کرنے کی کوشش بھی کرنی چاہیے‘‘۔شاعر ہر ایک چیز اور واقعہ سے صرف ’ذوقیات‘ لے لیتا ہے جو اس

کے سوا کسی اور کا حصہ نہیں۔ایک باکمال شاعر کے یہاں اس کا کلام ہموار اور اصول کے مطابق ہوتا ہے اور کہیں کہیں اس میں ایسا حیرت انگیز جلوہ نظر آتا ہے جو ہر خاص وعام کے دلوں میں براہ راست اتر جاتا ہے۔ایسے شعرا کے ان اشعار میں جا بجا معنی ومفہوم کی بجلیاں کوندتی ہوئی نظر آتی ہیں۔شاعری کے رموز وعلائم تغیر پذیر اور سیماب صفت ہوتے ہیں،وہ خود مکتفی نہیں ہوتے بلکہ زمانی اور مکانی عناصر کے سہارے ظہور پذیر ہوتے ہیں اور اپنے وجودی خدوخال کی تشکیل کرتے ہیں۔

افلاطون نے شاعری کو'الہامی' کیفیت سے تعبیر کیا ہے جبکہ ارسطو کی نظر میں شاعری ایک شعوری کاوش کا نتیجہ ہے،مگر حقیقت افلاطون کے حق میں جاتی ہے کہ شاعری کا فن یقیناً خدا داد ہوتا ہے۔ارسطو نے لگ بھگ دو ہزار برس قبل مسیح شاعری کے حوالے سے یہ کہا تھا کہ اس فن کا میدان اس قدر وسیع ہے کہ بت تراشی،مصوری اور ڈرامہ وغیرہ کے فنون مل کر بھی اس کی وسعت کو نہیں پہنچ سکتے۔شاعری کو ان تینوں فنون لطیفہ پر اس حیثیت سے بھی فوقیت حاصل ہے کہ انسان کا بطون شاعری کی قلمرو ہے۔شاعری دراصل ایک سلطنت ہے جس کی قلمرو اس قدر وسیع ہے جتنی خود تصورات کی دنیا۔شاعری کے حوالے سے افلاطون کا خیال ہے کہ شاعری ایوانِ مفروضات کی بنیاد پر قائم ہے،کیونکہ شاعری فطرت کی نقالی ہے اور فطرت خود حقیقت کی نقالی۔اس لیے صنفِ شاعری حقیقت سے تین قدم پیچھے کھڑی نظر آتی ہے۔مگر جب وہ دیکھتا ہے کہ شاعری یونانی تہذیب وتمدن کی رگ وجاں میں برقی رو کی طرح دوڑ رہی ہے اور اس کے اندر وہ بے پناہ صلاحیت موجود ہے جو عوام کے دلوں کو جوش وجذبہ سے معمور کر سکتی ہے،تو افلاطون خود الجھ کر رہ جاتا ہے اور یہ اعتراف کرتا ہے کہ شاعری نقل کی نقل ضرور ہے مگر یہ نقل اتنی خوبصورت ہے کہ اس کے آگے اصل بھی ماند پڑ جاتی ہے۔بالآخر وہ مشروط حدوں کے اندر شعرا کو آزادیٔ اظہار کی رائے دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔دانشورانِ عالم میں افلاطون نے ہی سب سے پہلے شاعری کے سماجی مضمرات اور اخلاقی وافادی پہلوؤں کا جائزہ لیا۔اسے تطہیر قلب اور انسانی جذبات کے فروغ کا آلہ قرار دیا اور ساتھ ہی یہ فرمان بھی جاری کیا کہ اگر شاعر وفنکار یہ فریضہ انجام نہ دے سکیں تو انہیں مملکتِ شاعری میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔یہ افلاطون کے 'تصوراتی ادبی دستور' کی ایک اہم شق تھی۔

کسی مخصوص زمانے کی شاعری سے ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور کے سماجی حالات کیا تھے،ثقافتی رجحانات کیا تھے،لوگوں کا مزاج کیسا تھا' تہذیب وتمدن ارتقا کے کن مراحل تک پہنچے تھے، سیاسی اور معاشی ترقی کس زینے پر تھی۔غالباً اسی لیے کہا گیا ہے کہ شعروادب تاریخ سے زیادہ سچا ہوتا ہے۔یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہر خطے کی مٹی اور آب وہوا کا اثر وہاں کے لوگوں کے خیالات واحساسات پر پڑتا ہے اور اس کے توسط سے شاعری اور انشا پردازی تک پہنچتا ہے۔دورِ جاہلیت میں عربوں کے کلام پر کوہ وصحرا' جنگل و بیابان' ببولوں اور ریگزاروں' سراب و تشنگی' کھنڈروں اور ویرانوں کا تصور شاعری کا سرمایہ ہوا کرتے تھے۔مگر یہی شاعری جب اپنا ادبی سفر طے کرتے ہوئے ایران پہنچی تو اس میں مٹی کی زرخیزی' آب رواں' سبزہ وشادابی' بہار وخزاں' گل وبلبل' بادِ سحر کے جھونکے' خوشبو کی لپٹیں وغیرہ مرکزی اہمیت اختیار کر گئیں۔شاعری اپنے سفر میں جب اور آگے بڑھی اور اس کے قدم ہندوستان کی زرخیز اور سرسبز وشاداب زمین پر پڑے تو وادیٔ گنگ وجمن کے ہوش ربا حسن نے اسے مبہوت کر دیا۔وسیع وعریض دریاؤں کا خرام' سبزہ پوش کوہستانی سلسلے' جھرنوں اور آبشاروں کی موسیقی ریز ترنگ' سوہنی مہیوال اور ہیر رانجھا کی عشقیہ داستانیں' رِشی منیوں کی گاتھائیں' میرا کا بھکتی رس' ولیوں اور صوفیوں کے تصوف میں پوشیدہ خود آگہی کا سیمابی احساس' پنگھٹ پر گوریوں کا جھرمٹ' کرشن کی بانسری کا جادو' ان سب کے امتزاج نے اردو شاعری کے آنچل میں ایسی دھنک رنگ سحر کاری کی کیفیت پیدا کی جس کی نظیر کسی دوسری عالمی سطح کی شاعری میں بھی نہیں ملتی۔

اردو شاعری کی ابتدا کا قصہ بھی بہت دل چسپ ہے۔وہ زبان جو محمد شاہ کے زمانے میں ہنوز تصنیف وتالیف کی دنیا سے بہت دور تھی اور کوچہ و بازار،فوجی چھاؤنیوں، خانقاہوں اور دیہاتوں میں بڑے الہڑ پن سے جوان ہوئی تھی،اچانک زرق برق لباس پہن کر مسندِ عروس پر آ بیٹھی اور کچھ ایسے نئے نئے عشوے اور غمزے دکھائے کہ بڑے بڑے شعرا اس کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو گئے،جن میں عبدالقادر بیدل،قزلباش' خاں امید،مرزا معز فطرت، آنند رام مخلص اور شاہ ولی اللہ اشتیاق اردو زبان میں شعر کہنے لگے۔سراج الدین خاں آرزو نے ریختہ میں شعر کہنے کی ترغیب دی،شاہ مبارک آبرو، غلام مصطفےٰ خاں یک رنگ، بے نوا اور آنند رام مخلص نے ان کی صحبت سے فیض اٹھایا۔ایرانی شعرا نے ابتدائی دور میں عربی زبان کے اشعار کا ترجمہ کر کے فارسی شعروادب کے سرمائے میں اضافہ کیا۔مولانا عبدالسلام ندوی کی تصنیف 'شعرالہند' اردو شاعری کی پہلی کتاب ہے جس میں اردو شاعری اور اس کی مختلف اصناف پر تاریخی اور ادبی بحث کی گئی ہے۔اردو کی ابتدائی شاعری پر فارسی زبان کا غلبہ نظر آتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری کے صنائع بدائع، علم بیان، استعارے اور تلمیحات کا رشتہ عموماً فارسی اساطیری روایات سے استوار ہے۔اردو شاعری ہمیشہ قصۂ گل وبلبل اور حکایتِ فراز ودار کے متوازی خطوط کے درمیان سفر کرتی رہی ہے۔یہ روایت اور عصری حسیت کو اپنے دامن میں سمیٹے ارتقائی منزلوں کو گرد راہ کرتی آئی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ شاعری دو طرح کی ہوتی ہے،ایک فکری اور دوسری قوسِ قزح کے ست رنگی جذبات میں ڈوبی ہوئی شاعری' جو براہ راست دل میں اتر جاتی ہے۔ایک اچھا شاعر اجالے کے پس منظر کی تاریکی اور اس تاریکی میں مستور روشنی کو دیکھنے کی خدا داد صلاحیت رکھتا ہے۔یہ اس کی 'ذہنی' بصارت کی علامت ہے۔شاعری انسان کی شخصیت اور اس کے ذوق کو نکھارتی اور سنوارتی ہے۔یہ روح کی تسکین کا سامان فراہم کرتی ہے اور فنی صلاحیتوں کو ابھارتی بھی ہے۔اردو شاعری میں ایک صحت مند روش یہ پائی گئی ہے کہ کلاسیکی دور کے شعرا اپنی شعریات خود وضع کرتے رہے ہیں اور ان کے لہجے میں احتیاط،فکر میں توازن،پیرایۂ اظہار میں متانت اور سنجیدگی کے اوصاف نمایاں ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ کسی مخصوص دائرۂ فکر سے فاصلہ بنائے رکھنے کی لاشعوری کوشش بھی ان کی شناخت ہے۔ان کی شاعری کلاسیکی رچاؤ اور جدت پسندی کے خلاقانہ امتزاج اور سات سروں کے سنگم کو مضراب جذبات سے نغمہ زن کرنے کا ہنر پیش کرتی ہے۔دراصل شاعری اپنے عہد کی اجتماعی فکر و احساس کی ترجمان ہوتی ہے۔زمانے کا مزاج بدلتا ہے تو شاعری بھی اپنا رنگ وآہنگ تبدیل کرتی ہے۔

آج کی برق رفتار زندگی میں شاعری ہمارے شعور کی ضرورت ہے جو تھکے ماندے ذہن کو سکون کے کچھ لمحات فراہم کرتی ہے۔اسی لیے جہاں ارسطو نے کہا ہے کہ''شاعری بیمار روح کی دوا ہے''وہیں نیومین کا کہنا ہے کہ''شاعری روح کی غذا ہے جو دماغ اور ذہن سے افکار کا بوجھ کم کرتی ہے''۔یہ قول مبنی بر حقیقت ہے کہ شاعری اعلیٰ ترین شعور وآگہی کے سرچشمے سے پھوٹتی ہے'جس کی ہمسری نہ سائنس کر سکتی ہے اور نہ ہی فلسفہ۔

■

Sayyed Nafees Dasnavi
Plot No:1481/B,Sector-6.C.D.A
Bidanasi.Cuttack-753014(Odisha)
Mob-9437067585

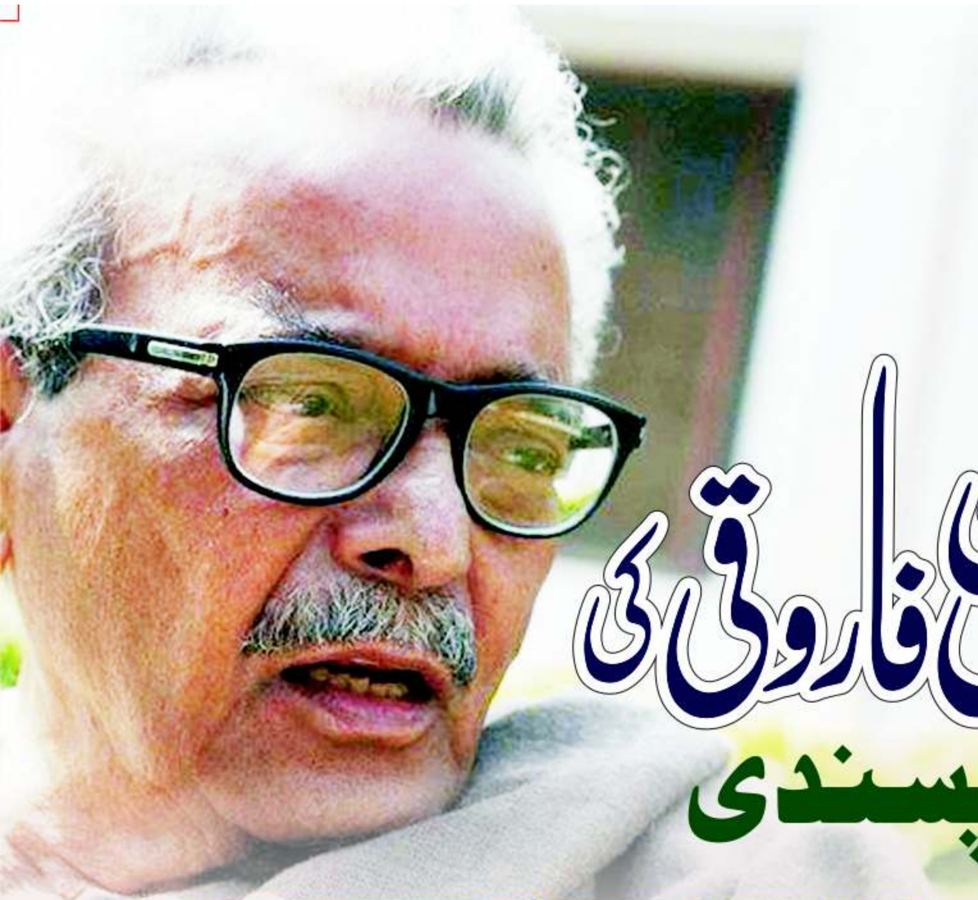

شمس الرحمٰن فاروقی کی روایت پسندی

محمد اسلم پرویز اسلم

فاروقی اور جدیدیت کے موضوع پر اتنا زیادہ لکھا گیا ہے کہ فاروقی اور جدیدیت لازم وملزوم ہو گئے ہیں۔ میرے خیال میں جدیدیت روایت سے بغاوت کا نام نہیں ہے بلکہ جدیدیت کا نظریہ ترقی پسندی کی تردید کرتا ہے، اور فرد کی انفرادیت پر زور دیتا ہے۔ فاروقی نے بھی روایت سے بغاوت نہیں کی ہے بلکہ بے سر پیر کی بات کرنے کے بجائے انھوں نے جب بھی کوئی دعویٰ کیا تو ہماری پرانی روایت کے مطابق اساتذہ شعرا کے کلام سے اپنے دعوے کو صحیح ثابت کرنے کے لیے ثبوت بھی پیش کیے۔ ان کی کتاب 'عروض آہنگ اور بیان' اور 'لغات روزمرہ' کا سرسری جائزہ ہی میرے اس خیال کی تائید کے لیے کافی ہوگا۔ اس لیے میں اس مضمون میں فاروقی کی متذکرہ دونوں کتابوں کے حوالے سے اردو شاعری کی چند عام لیکن اہم اصطلاحات اور اس سلسلے میں شاعروں کے درمیان موجود غلط فہمیوں کو جس خوبصورتی سے فاروقی نے دور کیا ہے، کی وضاحت کرنے کی کوشش کروں گا۔ مجھے امید ہے اس کے مطالعے کے بعد قارئین کو اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ فاروقی کی فکر کا مرکز ومحور کلاسیکی ادب ہی تھا۔

ہمارے بیشتر شاعروں کے نزدیک 'نہ' کو بروزن 'فع' یا ایک سبب خفیف کے برابر شمار کرنا درست نہیں ہے۔ اس لیے ایسا کرنے والے شاعروں پر سخت اعتراض کیا جاتا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ فاروقی کی کتاب عروض آہنگ اور بیان کے صفحہ نمبر 54 پر اس مسئلے پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ اور 'نہ' کی تطویل کے سلسلے میں اساتذہ شعرا کے کئی اشعار حوالے کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔

نہ وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

گر اس طرف بڑھا کسی بیدادگر کا ہاتھ
بالائے تن رہا نہ ادھر نہ ادھر کا ہاتھ

مرزا غالب کے مصرعے اور میر انیس کے درج بالا شعر میں 'نہ' کی تطویل یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ فاروقی نے روایت کے سہارے ہی ہماری اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرے خیال میں 'نہ' کی تطویل کا پختہ ثبوت مل جانے کے بعد 'کہ' کی تطویل پر بحث کرنا محض زیادتی ہے۔ 'نہ' اور 'کہ' دونوں میں ہائے مختفی ہی ہے۔ اس لیے 'نہ' کی تطویل کی مثال 'کہ' کی تطویل کے لیے مضبوط دلیل ہے۔ ضرورت شعری کے تحت 'نہ' اور 'کہ' دونوں کو ایک سبب خفیف کے برابر استعمال کیا جاسکتا ہے۔

ایک مسئلہ علامت اضافت کا/ کے/ کی کے مذکر یا

مونث استعمال کرنے کا ہے۔ اس سلسلے میں بھی ہماری رہنمائی کے لیے شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب 'لغات روزمرہ' کافی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی لغات روزمرہ کے صفحہ نمبر 71 پر رقمطراز ہیں" اگر اضافت کی علامت (کا/کے/کی) اپنے مضاف سے دور پڑ جائے تو اردو میں بہتر یہ ہے کہ علامت اضافت مذکر استعمال ہو، چاہے مضاف مونث ہی کیوں نہ ہو۔" شمس الرحمٰن فاروقی نے سند کے طور پر خواجہ حیدر علی آتش، میر انیس اور میر تقی میر کے اشعار بھی نقل کیے ہیں۔ جنھیں میں متذکرہ شعرا کے نام کی ترتیب کے مطابق یکے بعد دیگرے پیش کر رہا ہوں۔

معرفت میں اس خدائے پاک کے
ہوش اڑتے ہیں یہاں ادراک کے

کٹ کٹ گئے سب نیزے بھی اقبال سے اس کے
میدان میں تھا حشر بپا چال سے اس کے

کیا جانوں لذت درد اس کی جراحتوں کے
یہ جانوں ہوں کہ سینہ سب چاک ہو گیا ہے

اوپر کی مثالوں سے یہ مسئلہ پوری طرح حل ہو جاتا ہے۔ اور یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اگر علامتِ اضافت اپنے مضاف سے دور ہو جائے تب بھی علامتِ اضافت مذکر ہی استعمال ہوگا۔

فاروقی کی روایت پسندی کی ایک دو مثالیں اور دیکھیے۔ لفظ 'بقر عید' کے تلفظ اور املا کے بارے میں لغات روزمرہ کے صفحہ 103، 109، 110، 111 پر کارآمد معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ دلچسپ یہ ہے کہ بقول فاروقی "غالب نے مکتوب بنام نبی بخش حقیر، مورخہ ہفتم نومبر 1853 میں لکھا ہے: بکرید کو کچھ کہا ہی نہیں، ایک رباعی پڑھی تھی۔" فاروقی آگے لکھتے ہیں کہ اردو لغت تاریخی اصول پر میں اسے یعنی لفظ 'بکرید' کو عوامی تلفظ کہا ہے، اور کوئی سند نہیں دی ہے۔ غالب کی سند پر اسے عوامی نہیں کہہ سکتے۔

لغات روزمرہ کے صفحہ 82 پر درج ہے کہ" کچھ عرصے سے پاکستان میں 'خدا حافظ' کی جگہ 'اللہ حافظ' بولا اور لکھا جانے لگا ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی بعض اہل ہند بھی اس راہ پر چل نکلے ہیں۔ اس تبدیلی کی مصلحت سمجھ میں نہیں آتی۔ الوداعی سلام کے معنی میں 'اللہ حافظ' اردو کا روز مرہ نہیں، 'خدا حافظ' اردو کا روزمرہ ہے، بہادر شاہ ظفر۔

ہم تو چلتے ہیں لو خدا حافظ
بت کدہ کے بتو خدا حافظ

شتر گربہ کے بارے میں مولانا کے خیالات سے مجھے کوئی اختلاف نہیں،سوائے اس کے کہ 'آپ' اور 'تم' کا اجتماع ہر جگہ شتر گربہ کا اثر نہیں رکھتا، بعض حالات میں 'آپ' طنزیہ معنی رکھتا ہے، علاوہ بریں، دہلی کی زبان میں 'آپ جاؤ' 'آپ بیٹھو' وغیرہ محاورے میں شامل ہے، لہٰذا اسے بھی عیب نہیں کہہ سکتے،بعض اوقات صیغہ جمع حاضر کا مخاطب وہی شخص نہیں ہوتا جس کو 'تم' کہہ کر بھی اس شعر میں مخاطب کیا گیا ہے، ایسی صورت میں بھی شتر گربہ کا سوال نہیں پیدا ہوتا، چنانچہ مولانا کی درج کردہ مثالوں میں مندرجہ ذیل میں شتر گربہ نہیں ہے۔

درج بالا اقتباس سے اس بات کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے کہ فاروقی کس حد تک روایت پسند تھے، اور روایت پسند ہونے کے ساتھ ساتھ حب الوطنی کا جذبہ بھی ان میں موجود تھا۔ اسی لیے وہ پاکستانیوں کی اختراع اللہ حافظ کی جگہ خدا حافظ کو روایتی طریقے سے بہادر شاہ ظفر کے شعر کے حوالے کے ذریعے ثابت کرتے ہیں۔ وہ یہ بتانے میں کامیاب ہیں کہ خدا حافظ اردو کا روزمرہ ہے۔ الوداعی سلام کے معنی میں اللہ حافظ اردو کا روزمرہ نہیں ہے۔ وہ اللہ حافظ کو غلط نہیں البتہ غیر ضروری قرار دیتے ہیں۔ اس لیے کہ اردو میں اللہ حافظ عام طور پر برے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً" آپ کا کچھ نہیں ہو سکتا، اب آپ کا اللہ حافظ ہے۔" وغیرہ جیسے جملے اردو میں عام ہیں۔ اس سے پوری طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ اللہ حافظ، خدا حافظ کے معنی میں اردو میں استعمال نہیں ہوتا ہے۔

فاروقی تو اس حد تک روایت پسند تھے کہ انھوں نے کمال احمد صدیقی کی پانچ ہشت حرفی بحور جمیل، خلیل، شمیم، کشیر اور نہال جو کمال احمد صدیقی کی کتاب 'آہنگ اور عروض' کی خوبصورت دریافت ہے، کو تسلیم نہیں کیا۔ اس لیے کہ کمال احمد صدیقی کی ان بحروں کا روایتی عروض سے تعلق نہیں ہے۔ لیکن یہ اعتراف کیے بغیر چارہ بھی نہیں کہ کمال احمد صدیقی کے ہشت حرفی افاعیل نے اردو کے کئی ناقابل تقطیع اشعار کو تقطیع کے قابل بنا دیا۔ کمال صاحب کی یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دلی سے پہلی بار 1989 میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کی تیسری ترمیم شدہ اشاعت جنوری 2008 میں عمل میں آئی۔ اس کے ساتھ ہی علامہ سحر عشق آبادی نے 'مفاعلن' کو حشو دوم میں رکھ کر رباعی کے چوبیس روایتی اوزان میں 12 نئے اوزان کا اضافہ کیا۔ فاروقی نے سحر عشق آبادی کے بارہ نئے اوزان کو بھی تسلیم نہیں کیا۔ اس لیے کہ یہ اوزان رباعی کے روایتی اوزان نہیں ہیں۔ ان بارہ اوزان کو میں بھی تسلیم نہیں کرتا ہوں۔ اس لیے کہ علامہ سحر عشق آبادی نے رباعی کے بارہ نئے اوزان بنانے کے لیے رباعی کے بنیادی اوزان میں تبدیلی کی ہے۔ میرا ماننا ہے کہ کسی بھی چیز کی بنیاد تبدیل کرنے کا حق صرف بنیاد گزار کو ہے۔ تاہم کمال احمد صدیقی کے سبھی پانچوں ہشت حرفی افاعیل کے متعلق فاروقی صاحب کو اظہار خیال کرنا چاہیے۔

ہمارے شاعروں کے نزدیک شتر گربہ کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور نہ ہی شتر گربہ سے متعلق مولانا حسرت موہانی کے خیالات سے شمس الرحمان فاروقی کو کوئی اختلاف ہے۔ بجز اس کے کہ 'آپ' اور 'تم' کا اجتماع ہر جگہ شتر گربہ کا اثر نہیں رکھتا۔

اس مسئلے پر شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی معرکہ آرا کتاب عروض، آہنگ اور بیان کے صفحہ نمبر 173 پر اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے" شتر گربہ کے بارے میں مولانا کے خیالات سے مجھے کوئی اختلاف نہیں، سوائے اس کے کہ 'آپ' اور 'تم' کا اجتماع ہر جگہ شتر گربہ کا اثر نہیں رکھتا۔ بعض حالات میں 'آپ' طنزیہ معنی رکھتا ہے۔ علاوہ بریں، دہلی کی زبان میں 'آپ جاؤ' 'آپ بیٹھو' وغیرہ محاورے میں شامل ہے، لہٰذا اسے بھی عیب نہیں کہہ سکتے۔ بعض اوقات صیغۂ جمع حاضر کا مخاطب وہی شخص نہیں ہوتا جس کو 'تم' کہہ کر بھی اس شعر میں مخاطب کیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں بھی شتر گربہ کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ چنانچہ مولانا کی درج کردہ مثالوں میں مندرجہ ذیل میں شتر گربہ نہیں ہے۔"

مت یہ گھبرا کر کہو اب یاں سے بندہ جائے گا
کوئی مر جائے گا صاحب آپ کا کیا جائے گا

آپ تو زہر میں شکر کا مزہ چاہتے ہو
گالیاں دیتے ہو اور ہم سے دعا چاہتے ہو

وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے
تم نے کیوں سونپی ہے اپنے گھر کی دربانی مجھے

”اعلان نون مع عطف واضافت کے بارے میں میری رائے متقدمین کے عمل کے عین مطابق ہے کہ یہ عیب نہیں، جہاں ضرورت سمجھیں وہاں کرلیا جائے۔ نہ اس کوقبول کرنے میں اصرار ہو نہ اس کو رد کرنے پر ضد۔“

فصل بہار آئی پیو صوفیو شراب
بس ہو چکی نماز مصلّٰی اٹھائیے

محولہ بالا اشعار اوپر سے ترتیب وار جرأت، شاہ نصیر، غالب اور آتش کے ہیں۔

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کبھی کبھی شعر میں ’آپ‘ طنزیہ اور ’تم‘ بے تکلفی یا ناراضگی کا اظہار کرنے کے لیے ایک ساتھ استعمال ہوتا ہے۔

مولانا حسرت موہانی نے فارسی مرکبات میں نون کے اعلان کو غلط قرار دیا ہے۔ آج تک شاعروں پر یہ سوچ حاوی ہے۔ جب کہ نہ تو اس کی کوئی معقول وجہ پیش کی گئی ہے اور نہ ہی ایسا کرنا ہمارے اساتذہ کے نزدیک ناجائز یا حرام تھا۔ عروض آہنگ اور بیان کے صفحہ نمبر 161 پر فاروقی کا قول حسرت موہانی اور ان کے ہم نوا حضرات کے دعوے کی پول کھولتا ہے؛ ”اعلان نون مع عطف و اضافت کے بارے میں میری رائے متقدمین کے عمل کے عین مطابق ہے کہ یہ عیب نہیں، جہاں ضرورت سمجھیں وہاں کرلیا جائے۔ نہ اس کو قبول کرنے میں اصرار ہو نہ اس کو رد کرنے پر ضد۔“ اضافت کے ساتھ اعلان نون کی تائید میں غالب کے دو مصرعے درج ذیل ہیں۔

فرماں روائے کشورِ ہندوستان ہے

نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے

مزید تفصیل کے لیے ’عروض آہنگ اور بیان‘ کا مطالعہ ضروری ہے۔ صفحہ نمبر 162 پر فاروقی لکھتے ہیں ”بہر حال غالب کے زمانے تک اعلان نون مع عطف و اضافت میں کوئی عیب نہ تھا۔ بیخود موہانی کی یہی رائے ہے“۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غالب کے زمانے تک ہماری شاعری پر اس طرح کی فکر کا تسلط کم تھا۔ وقت کے ساتھ جیسے جیسے اردو شاعری اس سوچ کے زیر اثر آتی گئی اسے غیر ضروری قواعد وضوابط کی کھوکھلی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں ہمارے بہت سے اچھے شعرا شاید اپنی بہترین تخلیقات نہیں پیش کر سکے۔ میرے خیال میں یہ اردو شاعری کا نا قابل تلافی نقصان ہے۔

فارسی وار دو اور عربی وار دو الفاظ کے مابین عطف و اضافت کا مسئلہ آج تک موضوع بحث ہے۔ اس سلسلے میں بھی فاروقی نے ہماری مناسب رہنمائی کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں بنا کسی تمہید کے فاروقی کی درج کردہ مثال نقل کر رہا ہوں، جو ان کی کتاب عروض آہنگ اور بیان کے صفحہ نمبر 166 پر ہے۔ بقول غالب ع

گرم بازارِ فوجداری ہے

اس موضوع پر انھوں نے ’لغات روزمرہ‘ میں بھی اظہار خیال کیا ہے۔ اس کتاب کے صفحہ نمبر 70 پر وہ لکھتے ہیں کہ ”انیسویں صدی میں بھی دیسی اور فارسی الفاظ کے درمیان عطف واضافت لگانے کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ ضامن علی جلال کہتے ہیں۔“

ہمیشہ مستعد کارزار ہیں پلکیں
کبھی چھری کبھی تیر و کٹار ہیں پلکیں

وہ آگے لکھتے ہیں کہ انگریزی کے ساتھ اضافت کی ایک مثال دیکھیے۔ مردان علی خاں رعنا شاگرد غالب کا شعر ہے۔

مشتعل رہتی ہے آہ آتشیں مثلِ گیاس
سینۂ عشاق میں جلتا ہے بے روغن چراغ

فاروقی نے لکھا ہے کہ رعنا مرادآبادی نے درج بالا شعر میں ’گیاس‘ بمعنی Gas استعمال کیا ہے۔

حالیہ کچھ دنوں سے میرے ذاتی تجربے میں ایک بات بار بار آ رہی ہے۔ بہت سے شعرا کہاں، ہاں، نہاں، بیاباں اور جہاں جیسے الفاظ میں الف کی تخفیف کرتے ہیں۔ جبکہ ایسے الفاظ الف کی تخفیف ہر گز قبول نہیں کرتے۔ البتہ بیسواں، ساتواں، کشتیاں اور آندھیاں جیسے الفاظ الف مع نون غنہ تخفیف قبول کر لیتے ہیں۔ اس کی تفصیل کے لیے عروض آہنگ اور بیان کا صفحہ نمبر 59 ملاحظہ ہو۔

’اے‘ کو ایک حرف کے برابر شمار کرنے کے سلسلے میں فاروقی عروض آہنگ اور بیان کے صفحہ نمبر 87 پر رقمطراز ہیں ”’اے‘ کی تخفیف کو اگرچہ اساتذہ غلط کہتے ہیں، لیکن قدیم وجدید دونوں شعرا نے اسے مخفف باندھا ہے اور قطعی برا نہیں لگتا۔ ایک نمونہ قدیم اور ایک جدید ملاحظہ ہو۔“

قائم چاند پوری۔

عرض کی یوں کہ اے استاد زماں سنتے ہو

ن م راشد۔

اے غزال شب تری پیاس کیسے بجھاؤں میں

’اے‘ کے متعلق فیصلہ کرنے کا حق میں شاعروں پر چھوڑتا ہوں۔

شعر کی خامیوں میں ایک خامی حشو بھی ہے۔ حشو کی تعریف یہ ہے کہ جو لفظ شعر کے معنی میں کوئی اضافہ نہ کرے وہ حشو ہے۔ ممکن حد تک شاعروں کو اس سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ البتہ بہت مجبوری کی حالت میں اگر کبھی کوئی بے معنی لفظ استعمال کرنا پڑے تو کوشش یہ ہونی چاہیے کہ وہ لفظ مصرعے کے درمیان میں ہو۔ اس لیے کہ بے معنی یا بھرتی کا لفظ مصرعے کے بیچ میں ہونے سے قاری یا سامع کو اس کا احساس کم ہوتا ہے اور اس طرح یہ کمی ایک حد تک پوشیدہ ہوجاتی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے عروض آہنگ اور بیان میں کئی مقامات پر شعر کی خوبی اور خامی پر سیر حاصل بحث کی ہے اور قابلِ قدر نتائج برآمد کیے ہیں۔ مثلاً تکرار، تنافر، عجز بیان، تعقید اور اشکال وغیرہ سے متعلق انتہائی کارآمد مواد ان کتابوں میں موجود ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ بقول فاروقی ”قواعد یا زبان کے اغلاط، شعر کے ظاہری ڈھانچے پر جو اصول منطبق ہوتے ہیں ان کی پابندی نہ کرنا، یہ سب کمزوریاں اپنی جگہ پر مسلم ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ میں انہیں ہنسی خوشی قبول کرتا ہوں یا انہیں پسند کرتا ہوں۔ معاملہ صرف یہ ہے کہ یہ غلطیاں نفس شعر کو خراب نہیں کرتیں۔ یہ کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہوں، ان کے باوجود شعر اچھا ہوسکتا ہے۔ عیب وہ چیز ہے جو نفس شعر کو داغدار کر دیتی ہے اور عیب کا زیادہ تر تعلق اس سوال سے ہے کہ شعر کے الفاظ کو کس حد تک بامعنی یا معنی خیز بنایا گیا ہے؟“

ان بحثوں سے یہ بات کم از کم ثابت ہو جاتی ہے کہ فاروقی یقیناً روایت پسند تھے لیکن کسی بات کی اندھی تقلید کرنا ان کے نزدیک گناہ کبیرہ جیسا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کا یہ نظریہ درست تھا۔ ہر شاعر و ادیب کو ان کے اس نظریے کی پیروی کرنی چاہیے۔ یقیناً انھوں نے اپنی لازوال تحریروں سے اردو ادب کو اندھیری اور تنگ گلیوں سے نکال کر روشنی کی وسیع دنیا میں لا کھڑا کیا ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ فاروقی کے کارنامے بے مثال اور لازوال ہیں۔ ان کی رحلت سے اردو آبادی یقیناً بے سہارا اور یتیم ہوگئی ہے۔ اگر وہ چند سال اور ہمارے بیچ ہوتے تو اردو شعر وادب کا دامن مزید وسیع تر ہو جاتا۔

■

Dr. Md Aslam Parwez Aslam
Mohalla: Rajpur
Dak Khana: Suboor
Distt.: Bhagalpur - 813210
Mob.:6205628961
Email.: drmdaslamparwez@gmail.com

راشد میاں

برجستہ گوئی اور فنِ اصلاحِ شعر کا ماہر

سید محمود الحسن صولت

ہندوستان میں صوبۂ راجستھان (سابق راجپوتانہ) جہاں اپنے کثیر علاقۂ ریگزار کے لیے مشہور ہے، وہیں راجستھان کو پورے ہندوستان میں یہ امتیازی حیثیت بھی حاصل ہے کہ فی زمانہ یہ ملک ہندوستان کا رقبے کے اعتبار سے سب سے بڑا صوبہ ہے۔ راجستھان میں شعرو ادب کی آبادی کے لحاظ سے سابق ریاست ٹونک کی فضائیں بڑی زرخیز رہی ہیں۔ شعرائے ٹونک میں بھائی جان عاشق (نورتنِ داغ) اختر شیرانی وبسمل سعیدی کے علاوہ استاد سید محمود الحسن صولت کے نام نامی کی بڑی دھوم رہی ہے۔ حالانکہ ٹونک میں ان کے فن کی وہ قدر نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔ اس سلسلے میں مشہور شاعر، صحافی ونقاد مخمور سعیدی نے لکھا ہے کہ:

''صولت صاحب نے اپنی تمام عمر ٹونک میں گزار دی اگر وہ باہر نکل آتے تو ان کے کمال کی قدر یقیناً اس سے کہیں زیادہ ہوتی جتنی وطن میں رہ کر ہوئی۔ اہل وطن نے صرف یہی سمجھا کہ وہ ایک منھ پھٹ انسان ہیں، اور جب جو جی میں آئے کہہ ڈالتے ہیں۔ لیکن ان کی اس بے لاگ شخصیت کے اندر جو تعمیری روح مضمر تھی اسے کوئی نہ پہچان سکا۔''

بحوالہ جرنل جلد 3 بابت سال 84 - 83 صولت نمبر صاحبزادہ شوکت علی خاں ڈائریکٹر، عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ راجستھان، ٹونک ص 23)

فی البدیہہ شعر کہنے اور فنِ اصلاح شعر میں انھیں بڑی مہارت حاصل تھی خصوصاً برسر مشاعرہ اصلاح میں انھوں نے کبھی مروت نہیں برتی خواہ کیسے ہی پائے کا شاعر ہو ان کی مشفقانہ اصلاح کو بخوشی قبول کیے بنا نہیں رہتا۔

سید محمود الحسن صولت کی شروعاتی تعلیم ان کے گھر پر محلہ رجبن میں ہوئی۔ اس کے بعد حفظِ قرآن کی تعلیم حافظ محمد امان صاحب اور حافظ شمس الدین صاحب سے حاصل کی۔ فارسی زبان کی تعلیم مولوی عبدالکریم ولایتی اور مولوی علی رضا خاں سے حاصل کی تو عربی زبان میں مولوی عبدالقادر، مولوی احمد مجتبیٰ اور مولوی خلیل الرحمٰن استاد رہے۔ مذکورہ اساتذہ کے علاوہ انھوں نے حضرت حکیم برکات احمدؒ سے بھی تحصیل علم کیا تھا۔ صاحبزادہ شوکت علی خاں کے مطابق اس کا اعتراف صولت صاحب نے یوں کیا تھا: ''حکیم برکات احمدؒ سے میں نے بھی ابتدائی دور میں کچھ کتابیں نکالی تھی۔ مولوی ننے (حضرت مولانا محمد علی خاں) اس وقت اعلیٰ مدارج میں پڑھتے تھے، مجھے خوب یاد ہے کہ حکیم صاحب فرماتے تھے ''میرے سیکڑوں شاگرد ہیں لیکن ننے (محمد علی خاں) جیسا ذہین کوئی نہیں ہے۔'' (بحوالہ جرنل جلد 3 ص 42)

غالب کی مانند صولت ٹونکی نے تاحیات کوئی ذاتی مکان نہیں بنوایا۔ بیشتر کرائے کے مکانوں میں ہی اپنی زندگی گزاری۔ ان کا زمانۂ بچپن ونو جوانی رجبن میں گزرا۔ اس محلے سے انھیں خصوصی لگاؤ تھا۔ وہاں کی گلیاں مکان فضائیں انھیں ہمیشہ یاد آتے رہے یہاں تک کہ رجبن کے علاوہ انھیں کہیں قرار حاصل نہ ہوا بقول ان کے۔

کسی جگہ بھی زمانے میں اب قرار نہیں
بھٹکتے پھرتے ہیں جس روز سے چھٹا رجبن

صولت صاحب عربی النسل تھے ان کے والد قاری مولوی سید حامد 1896 میں بہ عہد نواب ابراہیم علی خاں مدینہ منورہ سے ٹونک تشریف لائے تھے۔ نواب صاحب نے انھیں 'معرف عرب' کے معزز عہدے پر فائز کیا۔ صولت صاحب کی ولادت ٹونک میں ہی 1898 میں ہوئی۔ بہ وقتِ انتقال ان کی عمر 70 سال تھی۔ صولت صاحب کو زمانۂ طفولیت میں ہی صاحبزادہ عبداللہ خاں کی زوجہ رقیہ بیگم نے اپنا متبنیٰ بنالیا تھا۔ تقریباً اکتیس (31) سال کی عمر تک وہ ان کے ساتھ رہے۔ رقیہ بیگم کے انتقال کے بعد انھیں زندگی کے مختلف نشیب وفراز سے دوچار ہونا پڑا۔ جہاں ان کی زندگی کے ابتدائی ایام بڑی خوشگوار فضا میں گزرے۔ جوانی بھی بے فکری اور عیش وعشرت میں بسر ہوئی، لیکن بعد کی زندگی خصوصاً بڑھاپے میں زندگی کے تلخ تجربات وآزمائش کے دور سے گزرنا پڑا۔ چونکہ رقیہ بیگم لاولد تھیں اور ان کی تمام جائداد سرکار نے ضبط کرلی تھی۔ اس جائداد میں سے بہت ہی قلیل وظیفہ صولت صاحب کو ملا کرتا تھا کچھ وظیفہ والیان ٹونک کی جانب سے اہل عرب کے لیے موقوفہ جائداد سے بھی انھیں ملتا تھا۔ قلیل آمدنی کے باوجود ان کے صبر وشکر اور قناعت کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی سے محتاجگی ظاہر نہ کی۔ بلکہ خداوندِ قدوس سے یہی آرزو اور دعا کرتے رہے۔

ہر بلندی سے ہر نشیب سے دے
پھر نہ مجھ کو کسی کی جیب سے دے
میری حاجت برآری کرنے کو
میرے پروردگار غیب سے دے

وہ مصائب وآلام کو درگزر کرتے ہوئے ہر حال میں شکرِ خدا کرتے رہے اور بندگی بجالاتے رہے۔

جو کچھ بھی ہوا اس کی ہی مرضی سے ہوا ہے
ہر حال میں صولت تو ادا شکرِ خدا کر

صولت صاحب ایک مختلف الصفات شخصیت ہونے کے باوجود گمنام زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ ان کے معیار اخلاق کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مختلف صفات سے متصف ہونے کے بعد بھی وہ خود کو انتہائی ادنیٰ اور گنہگار شخص سمجھتے، ان کے مطابق وہ۔

اچھا ہے ہر اک شخص میری نظروں میں صولت
میں کس کو برا جانوں کہ ہوں سب سے برا میں

شاعری میں صولت صاحب نے اولاً امام الشعرا حضرتِ کیف سے اصلاح لی، بعدازاں جانشینِ داغ وحالی بھائی جان عاشق کی شاگردی اختیار کی۔اس سلسلے میں ان کے شاگرد منشی عبدالحمید خاں آرزو کو دی گئی سندِ اجازت وفراغتِ اصلاح میں وہ رقم طراز ہیں :

''پرانے رسم ورواج اور دستور کے مطابق میں نے بھی یہ فن امام الشعرا حضرت عالمگیر کیف تلمیذ رشید حضرت سلیمان خاں اسد لکھنوی اور جانشینِ داغ وحالی حضرت صاحبزادہ احمد سعید خاں عاشقؒ سے حاصل کیا۔

یہ دونوں حضرات اردو کے دوممتاز شعری دبستانوں دہلی اور لکھنؤ کے سرخیل تھے۔اس طرح مجھے ان اساتذہَ کرام کے واسطوں سے شاعری کے ان دونوں اسکولوں کے خوشہ چیں ہونے کا فخر حاصل ہے۔ مجھے بچپن سے ہی شعرگوئی کا ذوق ہے اور 14 , 13 سال کی عمر سے ہی میں اس دشت کی سیاحی میں مصروف ہوں۔''

صولت صاحب صرف ایک قادرِ الکلام شاعر ہی نہیں شاعر گر بھی تھے۔ ان کے طفیل بہت سے متبدی حضرات شاعر بن گئے لیکن صولت صاحب نے ہمیشہ شہرت وناموس سے فاصلہ بنائے رکھا۔مولانا منظورالحسن برکاتی نے ایک مقام پرتحریر کیا ہے :

''صولت صاحب نے بہت کہا ہے لیکن کم اپنے لیے اور بہت دوسروں کے لیے۔ تمام ہی مشہور قدیم اساتذہَ سخن کی غزلوں پر انہوں نے غزلیں لکھی ہیں۔ مشکل سے مشکل اور سنگلاخ سے سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ ہزاروں نہیں لاکھوں شعران کی زبان وقلم سے نکلے ہیں لیکن چندغزلوں اور کچھ قصیدوں کے سِوا انہوں نے طبیعت کے استغنااور مزاج کے لاابالی پن کی وجہ سے کلام جمع کرنے اور اس کے مرتب کرنے کا اہتمام کبھی نہیں کیا، نہ معلوم کتنا کلام ضائع ہوگیا اور نہ معلوم کتنا کلام دوسروں کو بخش دیا۔''

(بحوالہ جرنل جلد 3 بابت 84 - 83 ص 89)

صولت صاحب کو فی البدیہہ اشعار کہنے پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ان کے مہارتِ فن کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اکثر مشاعروں میں فی الفور غزلیں کہہ کر پڑھیں۔ ان کی بدیہہ گوئی کا یہ عالم تھا کہ خواہ کیسی ہی مشکل زمین ہو چند ساعت میں غزل مکمل ہوجایا کرتی تھی۔اور اندازِ بیان کا معیار بھی ایسا کہ اس پر کبھی گرفت نہ ہوسکی۔

صولت صاحب نے غزل کے علاوہ نظمیں،قصیدے، قطعات و رباعیات، سہرے سہاگ و چار بیت وغیرہ اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی۔لیکن نعت گوئی پر انہوں نے خصوصی توجہ دی۔ ان کے نعتیہ اشعار سے عشق رسول کی جو والہانہ کیفیت اور وارفتگی کا اظہار ہوا ہے، وہ دیگر شعرا کے یہاں کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ دراصل صولت صاحب صوم وصلوٰۃ اور دینی شعار کے پابند ایک سچے مسلمان تھے۔آنحضرت حضورِ اکرم صلی اللہ وسلم کی ذاتِ مبارک سے آپ کو خصوصی عشق تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مشاعروں ودیگر محفلوں میں وہ نعتیہ شعر کو خصوصاً پسند کیا کرتے تھے۔مشاعروں میں وہی شاعر ان کی خصوصی توجہ کا مرکز بنتا جو نعتیہ شعر پڑھتا تھا۔ وہ ایک نعتیہ شعر کو کئی بار پوری غزل پر ترجیح دیا کرتے تھے۔

صولت صاحب کے یہاں عشق رسولؐ صرف روایت کی پاسداری یا رسم ورواج کے طور پر نہیں بلکہ یہ ان کی رگ وپے اور جسم وروح میں سرایت کیا ہوا تھا۔ یہی وجہ رہی کہ ان کے کلام میں حمدیہ ونعتیہ اشعار کے ساتھ صوفیانہ رنگ غالب نظر آتا ہے۔ وہ محافلِ میلادالنبیؐ اور مجالسِ سیرت النبی میں بڑے ذوق وشوق سے شرکت کرتے۔صولت صاحب نے کثیر تعداد میں نعتیہ اور حمدیہ اشعار تحریر کیے ہیں۔ان کا اس نوعیت کا کلام آج بھی محافل میلادالنبیؐ اور مجالسِ چار بیت کی زنیت بنا ہوا ہے۔ میلاد و چار بیت پارٹیاں محافل میں ان کو نہایت عقیدت و احترام کے ساتھ مترنم آوازوں میں پڑھا کرتے ہیں۔

صولت صاحب نے شعری اصناف میں غزل میں ہی بنیادی طور پر اپنی فکرِ طبع کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ان کی غزلیات میں دہلوی اور لکھنوی طرزِ سخن کے امتزاج کے ساتھ کلاسیکی اقدار و روایت کی پاسداری واحترام موجود ہے۔مشہور واقعہ ہے کہ جگر مرادآبادی نے صولت صاحب کی موجودگی میں کسی مشاعرے میں جب اپنا یہ مخصوص شعر ارشاد فرمایا۔

میری وحشت کی قسم آپ اٹھائیں تو نقاب
میرا ذمہ ہے کہ جلوے نہ پریشاں ہوں گے

صولت صاحب نے برجستہ فرمایا کہ جگر صاحب یوں پڑھیے یوں ۔

طور سینا کی قسم آپ اٹھائیں تو نقاب
میرا ذمہ ہے کہ جلوے نہ پریشاں ہوں گے

ایک لفظ کی تبدیلی سے صولت صاحب کی استادی نے شعر کو کہاں سے کہاں پہنچادیا۔ خاص بات یہ رہی کہ جگر جیسے بڑے شاعر نے صولت صاحب کی مذکورہ اصلاح کو بخوشی قبول بھی کیا۔

صولت صاحب غزل کو دیگر اصنافِ شاعری پر فوقیت دینے کے علاوہ اسے اردو شاعری کی جان بھی کہا کرتے تھے۔ وہ غزل کی قدیم روایات اور تراکیب کے ہمیشہ قائل رہے۔صولت صاحب نے اپنی بیشتر غزلیات میں سادہ،سلیس، آسان، بامحاورہ اور پختہ الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ الفاظ کی بندش اور مخصوص اندازِ بیان کی بدولت ان کے بعض اشعار جاذو کا سا اثر رکھتے ہیں۔بطورِ نمونہ چند اشعار پیش ہیں۔

زلف ورخ ان کے سلامت کیا غم شام وسحر
شام اک میرے لیے ہے اک سحر میرے لیے

پا کے بے پردہ انھیں بام پہ رونا آیا
حسن کی اس روشِ عام پہ رونا آیا

دیکھ کر آنکھ سے تیرے رخ وگیسو کی بہار
مجھ کو اپنے سحر و شام پہ رونا آیا

عمر بھر اتنی ہنسی بھی تو نہ آئی تھی کبھی
جس قدر اس دلِ ناکام پہ رونا آیا

دو عالم بھی قیمت نہیں تیرے غم کی
میں کب یہ متاعِ گراں بیچتا ہوں

نتیجہ کیا اگر انسان جیسی شکل پائی ہے
وہ ہے انسان جو انسان کے کام آئے مشکل میں

بھلا جو چاہا تو وہ مدتوں بھی نہ ہو سکا
برا نہ چاہا بھی ہم نے تو وہ شتاب ہوا

صولت کی غزلیات میں کہیں کہیں دہلوی رنگِ سخن کا غلبہ نظر آتا ہے تو اس کی بنیادی وجہ اولاً تو یہ ہے کہ وہ دہلوی استاد نواب مرزا خاں داغ کے شاگرد بھائی جان عاشق کے شاگردِ رشید تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ داغ کی شاعری کا چرچا اس وقت پورے ملک میں تھا۔ داغ کے رنگِ سخن کو اس عہد میں ایسا قبولِ عام حاصل تھا کہ کئی باکمال شعرا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔صولت کی شاعری پر بھی اس طرزِ سخن کا اثر پڑنا لازمی تھا۔لہذا صولت کے یہاں بھی اشعار میں طرزِ داغ کی مانند زبان دانی و محاورہ بندی، بے ساختگی وحسن پرستی جیسے موضوعات پر اشعار مِل جاتے ہیں۔ چند اشعار پیش ہیں۔

معمولی حسن والا جہاں میں نہیں ہے تو
لاکھوں میں جس کو ایک کہیں وہ حسیں ہے تو

کیوں آستیں چڑھائے ہے باندھے کیوں کمر
کیا قتل کر سکے گا مجھے نازنیں ہے تو

غزل اور نعت کے علاوہ صولت صاحب نے ٹونک کی مقبول عام صنفِ سخن چار بیت میں بھی بخوبی طبع آزمائی کی ہے۔ چار بیت میں ادبیت پیدا کرنے والے حضرات میں شمشیر جنگ، استاد آبرو، استاد حیراں، وبسمل سعیدی کے ساتھ صولت صاحب کا نام بھی سرفہرست ہے۔ مذکورہ شعرا کے علاوہ جوہر، صائب، بصر، شرر، فائز اور ابنِ احسن بزمی وغیرہ شعرا نے بھی اس سلسلے میں اہم خدمات

انجام دی ہیں۔ صولت صاحب کو غزل ہی کی طرح فنِ چار بیت اس کے رموز اور زبان و بیان پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ ان کی بعض نعتیہ چار بیتیں آج بھی محافل میں چار بیت پارٹیاں اپنے مخصوص طرز و انداز سے سنایا کرتی تھی۔ ان کی مشہور نعتیہ چار بیت کا مطلع اور بند ملاحظہ ہوں۔

سروری دونوں جہاں کی ہے سزاوار تمھیں
حق نے مختار کیا سیدِ ابرار تمھیں
ایسا رتبہ تو کسی اور نبیؐ کو نہ ملا
جس کو اللہ نے محبوب بنایا اپنا
شبِ معراج میں بلواکے اٹھا کر پردہ
خوب اللہ نے دکھلا دیا دیدار تمھیں
میں گنہگار ہوں، امت میں تمھاری تو ہوں
یہ تو ہرگز نہیں ہوگا کہ میں دوزخ میں جلوں
جاکے اب روضۂ اقدس پہ یہ صولت کہدوں
چاہیے دھیان مرا، اے مرے سرکار تمہیں

صولت صاحب نے اپنے ایام شباب کے دوران احمد آباد کا سفر کیا تھا۔ وہ وہاں کی خوبصورتی اور حسن دلفریب مناظر سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ ان کے قلم سے یہ اشعار نکل پڑے۔

دم قدم سے ہے تیرے شوکت و شانِ گجرات
اے میں قربان تیرے سرورِ دانِ گجرات
کیا کہوں میں تم سے داستانِ حسن
ہے نرالی ہر ایک شانِ حسن
تازگی یہ ہے گلستانِ حسن
احمد آباد ہے جہانِ حسن

مذکورہ اشعار کے علاوہ بعض چار بیت گو حضرات کے مطابق ان کی ایک مشہور چار بیت کا شانِ نزول بھی گجرات ہی کا ایک حسین منظر تھا۔ چار بیت میں صولت کے مظاہرۂ کمالِ فن کے ساتھ ان کے مخصوص جذبات واحساسات کی ترجمانی دل نشیں انداز میں ہوئی ہے۔ چار بیت کا مطلع یوں ہے۔

فریاد و فغاں کیا کرے تاثیر کسی کی
تدبیر سے برگشتہ ہے تقدیر کسی کی
کیا کوئی کہے سوزِ محبت کی کہانی
کس طرح دکھائے کوئی اشکوں کی روانی
مغرور ہے وہ حسن پہ اللہ رے جوانی
سنتا ہی نہیں وہ بتِ بے پیر کسی کی

چار بیت کا آخری بند اس طرح ہے۔

قسمت سے نظر آتا ہے انساں کو وہ منظر
صولت بخدا سانپ سے لہراتے ہیں دل پر
جب کوئی لبِ بام کھڑا ہوتا ہے آکر
بل کھاتی ہے جب زلفِ گرہ گیر کسی کی

یہاں سراپا نگاری کے علاوہ حسنِ بے پروا کی مغروریت و دلفریبی کے ساتھ شاعر کی قلبی کیفیت کا اظہار ہوا ہے۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے کہ صولت صاحب کو فی الفور اور برجستہ اشعار کہنے پر بڑی قدرت اور ملکہ حاصل تھا۔ ان کی بدیہہ گوئی اور برجستہ شاعری سے متعلق کئی واقعات مشہور ہیں۔ تاج الادبا فصیح الملک مولانا منظور الحسن برکاتی مرحوم نے اپنے ایک مقالے بعنوان 'صولت صاحب اور ان کی شخصیت' میں ایسے متعدد واقعات قلم بند کیے ہیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ 'شفا منزل' سے متعلق ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

اکتوبر 66 کی بات ہے کہ ایک روز صولت صاحب میرے غریب خانہ 'شفا منزل' تشریف فرما تھے۔ مختلف موضوعات زیرِ بحث تھے۔ باتوں باتوں میں 'شفا منزل' موضوعِ سخن بن گئی۔ صولت صاحب قبلہ مرحوم نے فرمایا۔ یہ بڑا تاریخی اور علمی مقام ہے... پھر خود ہی ذیل کا شعر ارشاد فرمایا۔

جس کو تم کہتے ہو شفا منزل
مرکزِ علم ہے یہ اے صولت

اس مجلس میں صولت صاحب کے شاگرد رشید جناب مراد سعیدی اور ٹونک کے ایک صاحبِ دیوان شاعر حافظ عبدالرحیم حافظ بھی شریک تھے۔ کچھ دیر کے بعد منشی احمد رضا خاں رضا بھی آگئے۔ تو صولت صاحب نے برجستہ فرمایا۔

مراد اور حافظ تو پہلے سے تھے
ہوا اور لیجے رضا کا اضافہ

اس کے بعد گفتگو کا رخ تجع گوئی کی طرف ہوگیا۔ صولت صاحب نے فرمایا میں نے قاضی الاسلام صاحب کا تجع بڑا ہی خوب اور پر معنی کہا ہے۔ اہلِ مجلس نے سننے کی خواہش کی تو فرمایا:

خود محمد قاضی الاسلام ہے

... تجع گوئی کا سلسلہ جاری تھا کہ صاحبزادہ شوکت علی خاں صاحب اور محبوب عالم صاحب ایڈوکیٹ بھی آگئے۔ قاضی جی نے کہا میاں! محبوب عالم کا بھی تجع ارشاد فرمادیں۔ صولت صاحب نے فرمایا کہ محبوب عالم صاحب کا تجع تو بعد میں کہوں گا۔ لو تم شوکت علی خاں کا تجع سن لو وہ ہوگیا۔

بابِ دیارِ علم کہا ہے حضورؐ نے
دراصل قصرِ علم کی شوکت علی سے ہے

اس کے بعد صولت صاحب نے محبوب عالم صاحب کے لیے ذیل کا تجع فرمایا ع

اپنے حسنِ خلق سے محبوبِ عالم ہوگیا

طے ہوا کہ جن حضرات کے اس وقت تجع ہوئے ہیں کل ان کی جانب سے پارٹی کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ پروگرام کے مطابق دوسرے دن پارٹی منعقد ہوئی۔ پارٹی میں دارالعلوم خلیلیہ کے مدرس جناب حافظ محمد حسین خاں اور جناب قاری محمد علی بیگ صاحب بھی شریک تھے۔ اس موقع پر صولت صاحب نے ان دونوں حضرات کے بھی فی الفور تجع ارشاد فرمائے۔

حافظ محمد حسین خاں۔

رکھتے تھے اپنے دوشِ مبارک پہ آپ کو
کرتے تھے کتنی قدر محمدؐ حسین کی

قاری محمد علی بیگ۔

بہت چاہتے تھے محمد علی کو

(بحوالہ جرنل 3، ص 117 - 115)

اسی نوعیت کے ایک اور واقعہ کا بیان اس طرح ہے کہ:

''اکتوبر 66 کی بات ہے حضرت صولت صاحب میرے غریب خانہ 'شفا منزل' میں تشریف فرما تھے۔ اتفاقاً اسی وقت میری تازہ تالیف 'بسمل سعیدی اپنے وطن میں' زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر پریس سے آئی۔ اس کتاب کی طباعت و اشاعت کے جملہ مصارف حضرت مراد سعیدی نے برداشت کیے تھے۔ حضرت صولت کی فرمائش پر میں اس کتاب کے چیدہ چیدہ حصے سنانے لگا، وہ بڑی دلچسپی اور انتہائی ذوق وشوق کے ساتھ سماعت فرمانے لگے... بڑے خلوص ومحبت سے تعریف وتوصیف کے الفاظ سے ہمت افزائی فرمائی اور بے ساختہ و برجستہ خلوص ومحبت میں ڈوبا ہوا یہ دعائیہ شعر ارشاد فرمایا۔

تا ابد قائم رہیں یارب تہہِ چرخِ کہن
قاضی الاسلام صاحب اور منظور الحسن

(بحوالہ جرنل 3 ص 117)

صولت صاحب کو ان کی زندگی کے آخری زمانے میں ان کے چہیتے فرزند احمد حسین عرف پیارے میاں داغِ مفارقت دے گئے۔ پسر کی اچانک موت نے انھیں جھنجھوڑ ڈالا۔ اس المناک حادثے نے نہ صرف ان کی کمر توڑی بلکہ زندگی میں ہی ان کی موت واقع ہوگئی۔ اب وہ صرف ایک کاغذی پیکر اور ہڈیوں کا مجسمہ رہ گئے تھے۔

دیکھ لو اب صرف کاغذی پیکر
مجھ میں اب دم و درود کچھ بھی نہیں

یہ زخمِ کاری کبھی نہ بھرنے والا تھا، لہٰذا فرماتے ہیں۔

یہ زخم کبھی بھی نہ بھریگا مرے دل کا
بس کام یہ پورا ہی کرے گا مرے دل کا
یہ کیا بتاؤں تم کو کہ کیا رنگ ہوگیا
اب عرصۂ حیات مرا تنگ ہوگیا

اِن قطعات میں انھوں نے پیارے میاں کی موت سے خود کی زندگی ختم ہونے، زندگی کے موت سے بدتر ہونے کا ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں۔

شادمانی ختم ہو کر رہ گئی
کامرانی ختم ہو کر رہ گئی
تیرے جاتے ہی مرے پیارے میاں
زندگانی ختم ہو کر رہ گئی

بے مرے اس غم سے چھٹکارا نہیں
زندگی کا اب کوئی چارا نہیں
موت سے بدتر ہے صولت زندگی
کیا جیوں گا جب مرا پیارا نہیں

مشہور اردو رسالہ شانِ ہند دہلی، اپریل 1968 کے شمارے میں مدیر سرور تونسوی صولت صاحب کی وفات سے متعلق ایک تعزیتی تحریر میں یوں بیان کرتے ہیں:

''دراصل صولتؒ کی قلبی موت تو اسی روز ہو چکی تھی جس روز ان کے چھوٹے صاحبزادے پیارے میاں اللہ کو پیارے ہوئے تھے۔ اور یہی غم انھیں چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا اور وہ اپنے جواں مرگ صاحبزادہ کی قبر سے لپٹ کر فرماتے تھے کہ بیٹا بہت جلد تیرے پاس آ رہا ہوں۔''

صولت صاحب کی برجستہ گوئی اور فی الفور شعر کہنے کا سلسلہ تادمِ آخر جاری رہا۔ شدید بیماری اور عالمِ نزع میں بھی اشعار کہتے رہے۔ اسی عالم میں اپنی آخری رباعی انھوں نے اپنے محبِ خاص و خلیفۂ عزیز صاحبزادہ شوکت علی خاں کو لکھوائی تھی۔ رباعی سے ظاہر ہے کہ موصوف کو عالمِ نزع میں بھی راحتِ جنت ملی تھی۔ یقیناً یہ ثمرۂ خداوندی تھا جو انھیں حاصل ہوا۔

ہر قطرہ ہے پانی کا ثمر خلدِ بریں کا
صدقہ ہے یہ صولت بخدا سرورِ دیں کا
ہے نزع کے عالم میں مجھے راحتِ جنت
ثمرہ ہے یقیناً یہ میرے حسنِ یقیں کا

ان کی وفاتِ پر ملال پر متعدد ہم عصر شعرا نے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ان گنت تعزیتی و تاریخی اشعار قلمبند کیے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے ہم عصر و دیرینہ رفیق مشہور کلاسیکی شاعر بسمل سعیدی نے جو اشعار بطورِ نظم تحریر کیے ہیں وہ ان کی شخصی و فنی عظمت کے آئینہ دار ہیں۔

بستے تھے دِل کے دیس میں دو چار پانچ لوگ
پھر کیا رہا جو ان میں بھی دو چار مرگئے
اونا مراد اَب نہ کسی کی غم سے کھیلنا
اے دِل بہ ہوش باش کہ غم خوار مرگئے

ذی علم و فہم، صاحب فنِ، قادر الکلام
نباضِ فکر، ناقدِ اشعار مرگئے
دل دادۂ قدامت و خلق و خلوص و خیر
ساتھ اپنے لے کے کتنی ہی اقدار مرگئے
تھا دشمنوں کی موت کا بھی ذکر ناگوار
یہ کیا کیا کہ خود ہی مرے یار مرگئے
بسمل ہم اپنی خیر منائیں گے کب تلک
اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مرگئے

صولت صاحب کے کلام کا بیشتر حصہ امتدادِ زمانہ کی نذر ہوگیا۔ زود گو شاعر ہونے کے باوجود ان کا کلام بہت کم دستیاب ہے کیونکہ انھوں نے خود کے لیے تو کم کہا اور دوسروں کے لیے بہت زیادہ ان کی اس وسیع الظرفی کے سبب بہت سے متبدی نہ صرف شاعر بلکہ صاحب دیوان تک بن گئے۔ استغنائے طبیعت کے باعث آپ نے کبھی اپنا کلام یکجا بھی نہیں کیا۔ اس طرح ان کے درہائے سخن خذف ریزوں کے مول بکے۔ ان کی بعض غزلیات اور چار بیت ٹونک کے ان سے منسلک چند باذوق حضرات میں سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے شاگردِ رشید تاریخ گو شاعر منشی عبدالبصیر بصر رقمطراز ہیں:

''آپ کا ذخیرۂ کلام گنتی کی غزلیں ہیں۔ ابتدائی دور کی غزلیں چار بیتیں ان کے اس دور کے ساتھیوں کے پاس ہیں۔ ان غزلوں اور چار بیتوں میں جو سقم و نقائص ہیں۔ وہ طالبِ علمی کے زمانے کی یادگار ہیں، ان کی اصلاح و درستی ممکن بھی نہیں وہ لوگوں کے سینوں میں محفوظ ہیں۔ اور زبانوں پر چڑھی ہوئی ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات کہنا ضروری ہے کہ جب زمانہ طالبِ علمی کی غزل، چار بیت کوئی سناتا تو آپ دشمن کے شعر کی طرح سنتے اور تنقید فرماتے تھے اچھے کو اچھا برے کو برا ہی کہتے تھے۔''

(بحوالہ جرنل جلد 3 ص 59)

البتہ صولت ٹونکی کے خلیفۂ عزیز صاحبزادہ شوکت علی خاں سابق ڈائریکٹر مولانا آزاد عربی و فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ٹونک (ادارۂ راجستھان سرکار) نے مذکورہ ادارے کے سالانہ مجلّہ 'جرنل' 3 کو نہ صرف 'صولت نمبر' کی حیثیت سے شائع کروایا۔ بلکہ اس میں صولت ٹونکی کی حمد، نعت و منقبت کے علاوہ غیر مطبوعہ 22، غزلیات کو جمع و یکجا کر کے شائع کیا۔ مذکورہ جرنل میں راجستھان و بیرونِ راجستھان کے متعدد ادبا و شعرا کے صولت صاحب سے متعلق تاثرات بھی شامل ہیں جو یوم صولت کے موقع پر ان حضرات نے تحریر کیے تھے۔

صولت صاحب کے آخری زمانے میں وفات سے کچھ ہی دن قبل قاضی شہر ٹونک کی تاریخ ساز حویلی میں خود ان کی صدارت میں شاعر سالک عزیزی کے اعزاز میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ یہاں انھوں نے اپنی غزل کے مقطع میں تقاضائے ملک الموت کا اظہار نہایت جذباتی انداز میں کیا تھا۔

سخت جاں تو بھی وہ صولت ہے کہ پرواہ ہی نہیں
کر رہا ہے ملک الموت تقاضا کب سے

اختتامِ مقالہ سے قبل بطور 'مشتے نمونہ از خروارے' صولت کی ایک غزل ملاحظہ فرمائیں۔

مضطر ہجومِ رشک سے ہیں بزمِ یار میں
کانٹوں پہ ہم تو لوٹ رہے ہیں بہار میں
کمبخت لازمی ہے محبت میں بدظنی
پیوست نوکِ خارِ خزاں ہے بہار میں
وہ مسکرا کے دیکھ رہے ہیں میری طرف
ہے آج کائنات مرے اختیار میں
اونچی نظر بھی کیجیے تبسم کے ساتھ ساتھ
فرمایئے کچھ اور اضافہ بہار میں
گیسو وہ رخ پہ ڈالے ہوئے محوِ خواب ہیں
گویا چمن ہے سایۂ ابرِ بہار میں
حق گوئی میں کسی کا ہمیں کوئی ڈر نہیں
صولت جو بات کہنی ہو کہہ دیں ہزار میں

مآخذ:

1 'جرنل' جلد 3، صولت نمبر بابت سال 84-83، مرتبہ صاحبزادہ شوکت علی خاں ڈائریکٹر و حکیم محمد عمران خاں
2 میرے عہد کی صدائیں: مخمور سعیدی 2000
3 شانِ ہند (رسالہ) دہلی، اپریل 1968 مدیر سرور تونسوی
4 ریاست ٹونک اور اردو شاعری: مختار شمیم 1976
5 تذکرہ شعرائے ٹونک: شمیم ٹونکی 1993
6 چار چاند: محمد الحیٰ فائز 1994
7 انجمن (دیوناگری میں) ہنومان سنگل 1994
8 ٹونک میں اردو کا فروغ: سید ساجد علی ٹونکی 2011
9 راجستھان میں شعری گلدستوں کی روایت: ڈاکٹر نادرہ خاتون 2011
10 راجستھان میں اردو نعت گوئی (غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ) ڈاکٹر قائد علی خاں
11 راجستھان کے موجودہ اردو شاعر (دیوناگری میں) پروفیسر پریم شنکر شریواستو 1965
12 راجستھان کے موجودہ اردو شاعر (اردو میں) مترجم و مرتب: ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی 2022

■

Dr. Rashid Miyan
Assistant Professor (Urdu)
Govt. P. G. College
Tonk- 304001 (Rajasthan)
Mob.: 7240302056
Email: rashidmiyan356@gmail.com

شاکر علی صدیقی

میر غلام نازکی

ایک غزل، دو قرآت

ادبی دنیا میں میر غلام نازکی ایک غیر معروف شخصیت کا نام ہے، لیکن ان کا کلام اپنی اصابت فکر وفن کی بنیاد پر معرفت کا حق دار ہے۔ مناسب ہے کہ پہلے ان کی شخصیت سے متعارف ہوا جائے، کیونکہ بدون شخصیت کسی کے فکر و فن کو سمجھنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ بقول آل احمد سرور ”شخصیت کا اتنا مطالعہ ناگزیر ہے جو فن کی تفہیم میں معاون ہو۔“ شخصیت کا پرتو تخلیق پر کبھی تند اور کبھی مدھم منعکس ہوتا ہے۔ کبھی تو شخصیت کی بنیاد پر متن کا مفہوم واضح ہوتا ہے اور کبھی متن کی اساس پر شخصیت نمایاں ہوتی ہے۔ لہٰذا شخصیت اور فکر وفن میں ایک عمیق ربط ہے۔

نازکی سری نگر (کشمیر) کے ایک علمی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے ان کے والد ماجد میر غلام مصطفی نازکی اپنے وقت کے ایک جید عالم اور سخن شناس تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم والد محترم کے زیر سایہ ہوئی۔ اس کے بعد بانڈی پورا کے لوور مڈل اسکول، اسلامیہ ہائی اسکول سری نگر اور پنجاب یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ منشی عالم 1931، میٹرک 1933، منشی فاضل 1935، ادیب فاضل 1937، ایف اے 1939 اور بی اے 1949 میں سند یاب ہوئے۔ حصول تعلیم کے دوران معاشی تنگی کے باعث کئی ملازمتوں سے منسلک رہے۔ بالآخر ناظم تعلیمات خواجہ غلام السیدین نے 1943 میں انھیں لٹریری اسسٹنٹ کے عہدے پر فائز کیا۔ مزید برآں ان کو ٹیچرس ٹریننگ کالج کا استاد اور پھر کچھ ہی مدت کے بعد اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز کے منصب پر مقرر کرکے 1947 تک خدمت کا موقع عنایت کیا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے کم و بیش دو سال ریڈیو کشمیر جموں میں کام کیا۔ 1950 میں ان کا ریڈیو کشمیر سری نگر تبادلہ ہوگیا اور یہیں سبکدوشی تک اپنے فرائض منصبی میں منہمک رہے۔

نازکی کا ادبی ذوق وشوق ان کے والد کا رہین منت ہے۔ بچپن ہی میں ان کی ایسی تعلیم وتربیت کا بندوبست کیا گیا کہ انھیں شعر وسخن کی نزاکتوں اور نفاستوں سے حد درجہ قلبی وابستگی پیدا ہوگئی۔ شروع میں تو فارسی شعر وادب سے گہری دلچسپی رکھتے تھے لیکن ’آب حیات‘ کے مطالعہ کے بعد اردو شاعری کی طرف اس قدر مائل ہوئے کہ اپنے جذبات اور تجربات کو اردو شعر وسخن کے قالب میں ڈھالنے لگے۔ انھوں نے اپنی سخن گوئی میں غزل، قطعہ، رباعی، نظم، مناجات اور نعت و درود وغیرہ مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی۔ ان کے کلام کا مطالعہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ وہ اپنے وقت کے ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کی شاعری سے واقف ہونے کے لیے شعری مجموعے ’نزاکت‘، ’چراغ راہ‘ اور بطور خاص دو شعری مجموعے ’دیدۂ

> **ادبی دنیا میں میر غلام نازکی ایک غیر معروف شخصیت کا نام ہے، لیکن ان کا کلام اپنی اصابت فکر و فن کی بنیاد پر معرفت کا حق دار ہے، مناسب ہے کہ پہلے ان کی شخصیت سے متعارف ہوا جائے، کیونکہ بدون شخصیت کسی کے فکر و فن کو سمجھنا نا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے، بقول آل احمد سرور ”شخصیت کا اتنا مطالعہ ناگزیر ہے جو فن کی تفہیم میں معاون ہو۔“ شخصیت کا پرتو تخلیق پر کبھی تند اور کبھی مدھم منعکس ہوتا ہے، کبھی تو شخصیت کی بنیاد پر متن کا مفہوم واضح ہوتا ہے اور کبھی متن کی اساس پر شخصیت نمایاں ہوتی ہے۔**

تر' اور 'متاعِ فقیر' کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ ابتداً ان کی شاعری کا اندازِ تخاطب اور نفسِ مضمون روایتی تھا، لیکن بعد کا کلام ایک مخصوص طرزِ فکر و فن کا گلدستہ بن گیا، جس میں شخصی تجربات و مشاہدات کی جلوہ گری ملتی ہے۔ صداقت بیانی اور خلوص و سادگی ان کے کلام کا تمغۂ امتیاز ہے۔ بہر کیف یہاں پر ان کی پوری شاعری کا احاطہ مقصود نہیں بلکہ ایک غزل کا تجزیہ آپ کے پیش نظر ہے، لہٰذا نازکی کی مندرجِ ذیل غزل ملاحظہ کیجیے۔

آج حد درجہ اداسی ہے مرا ساتھ نہ چھوڑ
التجا ایک ذرا سی ہے مرا ساتھ نہ چھوڑ
آج کی رات بھیانک ہے میرے ساتھ رہو
اور قیامت بھی بپاسی ہے مرا ساتھ نہ چھوڑ
آج اس شہر پہ نازل ہے خداؤں کا عتاب
تو بھی اس شہر کا باسی ہے مرا ساتھ نہ چھوڑ
آسماں برسرِ پیکار ہے نظریں نہ چرا
یہ زمیں خون کی پیاسی ہے مرا ساتھ نہ چھوڑ
میں اکیلا ہوں سمندر کا تلاطم ہے محیط
رات اک کالی بلاسی ہے مرا ساتھ نہ چھوڑ
کربلا آج بھی ہے دیکھ ادھر خون حسین
وہ محمد کی نواسی ہے مرا ساتھ نہ چھوڑ

پہلی قرأت

یہ غزل مسلسل مجموعی طور پر ایک مطلع اور پانچ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے قوافی 1. اداسی، ذراسی۔ 2. بپاسی، 3. باسی، 4. پیاسی، 5. بلاسی اور 6. نواسی غزل میں غیر معمولی حسن کو محفوظ کرتے ہیں۔ جہاں تک ردیف کا تعلق ہے 'ہے مرا ساتھ نہ چھوڑ' غزل کا خود مکتفی رکن ہے۔ کیونکہ شاعر کے عندیے کی تکمیل کی اساس ردیف پر ہی منحصر ہے۔ یہ شاعر کا اپنا مخصوص ہنر ہے کہ ردیف کی تکرار ہر شعر کے نت نئے معنیاتی نظام سے مربوط ہے۔ دوسری مخصوص خوبی یہ ہے کہ یہ غزل لفظ 'آج' کی قطعیت سے شروع ہوکر ماضی بعید کے تلمیحی نشان 'کربلا' پر ختم ہوجاتی ہے۔ حالانکہ یہ غزل اپنے موضوع کے اعتبار سے تنگ ہے لیکن وسعتِ فکر کے لحاظ سے بہت بلند ہے۔ اس کا بنیادی موضوع 'تنہائی' ہے، لیکن جیسے جیسے 'تنہائی' کا تعین ہوتا جاتا ہے اس کی معنوی سطح بلند سے بلند تر ہوتی جاتی ہے۔ مطلع کی قرأت کیجیے۔

آج حد درجہ اداسی ہے مرا ساتھ نہ چھوڑ
التجا ایک ذرا سی ہے مرا ساتھ نہ چھوڑ

غزل کا مرکزی کردار اپنے دل کی کیفیت 'اداسی' کا اظہار کرتے ہوئے اس بات کا متمنی ہے کہ اس کا ہم نوا، ہم خیال یا ہم مکتب دوست اس کے شریک حال رہے۔ حالانکہ شاعر نے ردیف 'مرا ساتھ نہ چھوڑ' کے ذریعے اس طرف بلیغ اشارہ کیا ہے کہ اس کا مخاطَب ساتھ دینے پر کسی طرح آمادہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر نے مصرعۂ ثانی میں لفظ 'التجا' کا التزام کرکے کردار کے خوشامدی پہلو کو نمایاں کیا ہے۔ اس شعر میں شاعر کا فن عروج پر ہے۔ ایک طرف تو اس نے 'حد درجہ اداسی' سے فائدہ اٹھاتے ہوئے غزل کے کردار کی کیفیت/ضرورت کا تعین کیا ہے، تو دوسری سمت ردیف اور لفظ 'التجا' سے مخاطِب اور مخاطَب کے مابین کشمکش/تضاد کی صورت کو دکھلایا ہے۔ اس مطلع میں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے شاعر نے دوسرے مصرعہ میں التجا کے ساتھ قافیہ 'ذراسی' کیوں کر باندھا ہے؟ 'التجا ایک ذراسی ہے' سے معلوم ہوتا ہے کہ مخاطَب اپنے مخاطِب کی مسیحائی پر قادر ہے اور اس کی عدم تنہائی کی شدتوں کا وہی بنیادی سبب ہے۔ اب یہ سوال اٹھتا ہے کہ اس کا مخاطَب کون ہے اور وہ کس حیثیت کا مالک ہے؟ یہ کسی قوم کا رہبر بھی ہوسکتا ہے!، یہ مذہبی پیشوا بھی ہوسکتا ہے!، یا پھر معشوق! بہر حال یہ کوئی بھی ہو، لیکن وہ اپنے مخاطِب کا درماں اور مسیحا ہے۔ اس لیے شاعر نے غزل کے کردار کی کلیدی کیفیت 'اداسی' کے اسباب و علل کو بڑے شد و مد کے ساتھ تفصیلاً بیان کیا ہے تاکہ اس کا مسیحا باعث وجوہ ساتھ چھوڑنے سے باز رہے، مثلاً

پہلا سبب
''آج'' کی رات بھیانک ہے،
دوسرا سبب
اور قیامت بھی بپاسی ہے،
تیسرا سبب
رات اک کالی بلاسی ہے،
چوتھا سبب
کربلا آج بھی ہے،

اب یہ سوال اٹھتا ہے کہ آج کی رات بھیانک کیوں ہے؟، قیامت کیوں کر بپا ہے؟، رات ایک کالی بلا'سی' کیوں ہے؟ اور آج کربلا کیوں کر ہے؟، تو شاعر نے اس کی بھی وضاحت شعر نمبر 2,3,5 میں کی ہے، ملاحظہ ہو:

پہلی علت
''آج'' اس شہر پہ نازل ہے خداؤں کا عتاب،
دوسری علت
آسماں برسرِ پیکار ہے،
تیسری علت
''یہ'' زمیں خون کی پیاسی ہے،
چوتھی علت
دیکھ ادھر خون حسین،

اب مذکورہ ترتیب کی روشنی میں غزل کی ایک بار پھر قرات کیجیے اور غزل کے اس کلیدی مصرعے پر ٹھہریے:

''میں اکیلا ہوں سمندر کا تلاطم ہے محیط''

اور پھر اس کے فوراً بعد اس مصرعے کی قرات کیجیے۔

''تو بھی اس شہر کا باسی ہے مرا ساتھ نہ چھوڑ''

تو ایک طرف غزل کا مفہوم بالکل واضح ہوجاتا ہے۔ تو دوسری طرف مخاطِب اور مخاطَب کے مابین ارتباطی نوعیت کا اندازہ ہوتا ہے اور دونوں کی انتشاری کیفیت بھی نمایاں ہوتی ہے۔ یہاں پر شاعر کی فنی پختگی اور اس کی چابک دستی کی داد دینی پڑتی ہے کہ یہی دونوں مصرعے بیت الغزل ہیں، جو باقی مصرعوں کے پیش خیمہ ہیں۔ جس کو شاعر نے دو متضاد کیفیات کی ترجمانی کے ذریعہ حال کو ماضی سے روشناس/متناظر کرکے اپنے خیالات کو شعر کے قالب میں ڈھالا ہے۔

دوسری قرأت

جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ نازکی نے اپنی شاعری میں بیشتر ان مضامین کو باندھا ہے جو ان کے تجربات اور مشاہدات کے غماز ہیں۔ یہ غزل بھی اسی نوع کی عمدہ دلیل ہے۔ یہ غزل عصر حاضر کی اس خاص صورت حال کی ترجمان ہے جس میں قوم انتشار پذیری کی زندگی گزار رہی ہے دوست اور دشمن میں امتیاز ختم ہوتا جا رہا ہے۔ معاشرے اور سماج میں اپنائیت نام کی چیز باقی نہیں رہی۔ بڑی تیزی سے اپنائیت غیر اپنائیت میں بدلتی جا رہی ہے اور مادی نقشوں نے قوم کو حریص الطبع بنا دیا ہے۔ اس لیے شاعر نے 'آج حد درجہ اداسی' کے ذریعے عصر حاضر کی نامساعد کیفیات کا نقشہ کھینچا ہے اور وہ متفکر ہے کہ آج قوم کے دلوں کی اداسی اور بے چینی کس طرح ختم کی جائے۔ اس نے اس کا تریاق بھی تلاش کرلیا ہے کہ اس کا واحد حل باہمی اتحاد ہے، اس لیے وہ ملتجی بن کر اصرار کرتا ہے ''مرا ساتھ نہ چھوڑ، مرا ساتھ نہ چھوڑ'' اس تکرار سے وہ ٹوٹے ہوئے رشتوں کو باہم مربوط کرنا چاہتا ہے، کیونکہ شاعر ان نتائج سے باخبر ہے جو پیش آرہے ہیں یا آنے والے ہیں، اس لیے اس نے دوسرے شعر میں ''آج کی رات بھیانک ہے'' اور ''قیامت بھی بپا ہے'' (یہ ظلم و جبر کی وہ علامت ہے جو اپنے انتہائی مراحل میں ہے) کا ذکر کرکے اپنے مدوعین کو بیدار کیا ہے۔ دوسرا نکتہ یہ بھی ہوسکتا

ہے کہ وہ اپنی قوم کو بھولا ہوا سبق یاد دلانا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تیسرے شعر کے مصرعۂ ثانی میں جھنجھوڑتے ہوئے کہتا ہے "تو بھی اس شہر کا باسی ہے مرا ساتھ نہ چھوڑ" بہر حال وہ ہر ممکن کوشش پیہم میں ہمہ تن منہمک ہے کہ آپسی ارتباط منہدم نہ ہوں۔ مزید آگے وہ اپنی قوم کو ان خدشات سے آگاہ کرنا چاہتا ہے جو ان پر دانستہ نازل کیے جا رہے ہیں۔

"آج اس شہر پہ نازل ہے خداؤں کا عتاب"
آسماں برسرِ پیکار ہے نظریں نہ چرا
یہ زمیں خون کی پیاسی ہے مرا ساتھ نہ چھوڑ
"کربلا آج بھی ہے دیکھ ادھر خونِ حسین"

پہلا مصرعہ ایک مخصوص منظر کو بیان کرتا ہے جو اس قوم کا مقدر بنا ہوا ہے، یہ حکمراں، قومی رہبر یا صاحب اقتدار ظلم و جبر کے ذریعے اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل میں مصروف ہیں اور اپنی وقتی طاقت کے باعث اپنے کو خدا سمجھ بیٹھے ہیں، شاعر نے دوسرے مصرعے میں یہ کہہ کر "تو بھی اس شہر کا باسی ہے مرا ساتھ نہ چھوڑ" قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ آج اس قوم کی بدنصیبی یہی ہے کہ دوسروں پر پڑنے والے مظالم اور مصائب کو وہ اپنا رنج و غم نہیں سمجھتا ہے، بلکہ حد تو یہ ہے کہ ان خداؤں نے ہمارے دل کو اس قدر منحرف اور مبتذل کر دیا ہے کہ ہم دوسروں کے ناگفتہ بہ مسائل کو یہ کہہ کر ٹال جاتے ہیں کہ یہ ہمارا مسئلہ نہیں۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ اس قوم کا ہر فرد دوسرے کے رنج و غم کو اپنا سمجھ کر شریک عمل رہتا اور متحد و منظم ہو کر مرتب لائحۂ عمل کے ذریعے ایسے عملی اقدام اٹھاتا جس سے باطل قوت اپنے جابرانہ رویے سے باز رہتی۔

چوتھے شعر میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ہماری قوم کی بداعمالیوں کے باعث غیبی طاقت نے ہمارا ساتھ دینے کے بجائے مخالفت کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ یہاں تک کہ آسماں بھی برسرپیکار ہے اور زمین بھی ہمارے خون کی پیاسی ہے اور ہماری بے توجہی کی انتہا یہ ہے کہ ان تمام سانحات سے نہ تو عبرت حاصل کرتا ہوں اور نہ ہی نصیحت۔ بقول غالب "بے دلی ہائے تماشہ کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق۔ بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں" نازکی نے خود طنزیہ کہا ہے کہ۔

ایماں بقدر طول امل بیچتا ہوں
لیکن ضمیر پہلے پہل بیچتا ہوں
اپنی سیاہ فردِ عمل لے کے ہاتھ میں
پیغمبر خدا کا عمل بیچتا ہوں
توحید میرے زور بیاں سے مستفید
خلوت میں جا کے لات و ہُبل بیچتا ہوں

بہر کیف مصرعۂ اولیٰ کے اس ٹکڑے پر غور کیجیے 'نظریں نہ چرا'، 'نظر چرانا' ایک اردو محاورہ ہے۔ فیروز اللغات میں یہ معنی درج ہیں: (نظر بچانا، کترانا، نظر ملا کر نہ دیکھنا، کام سے پہلو تہی کرنا۔) ان سب معنی کی بنیاد اس پر قائم ہے کہ قصداً کسی فعل/عمل سے بے پرواہی برتنا۔ جب کہ اس قوم کی یہ خوبیاں تھیں کہ یہی روئے زمین کی خلیفہ تھی، حساس قلبی اس کی بنیادی صفت تھی، اخوت و بھائی چارگی اس کی خو تھی، اعانت و معاونت اس کی فطرت تھی، عدل و انصاف اس کی سرشت میں داخل تھا اور امن و امان اس کا عمل تھا، عبادت و ریاضت اس کے مقاصد زندگی تھے۔ جب تک یہ قوم ان تمام خصوصیات کی متحمل اور نفاذ و شیوع کی پابند رہی، تو آسماں بھی اس کی موافقت پر مامور تھا اور زمیں بھی اس کی معاونت محکوم تھی۔ ہائے! لیکن جب جملہ خصوصیات سے بے توجہی اور غفلت برتی جانے لگی اور نظریں چرائی جانے لگیں تو آسماں بھی ہم سے برسرپیکار ہو گیا اور زمیں بھی ہمارے خون کی پیاسی ہو گئی، یعنی غیبی طاقت امداد کے بجائے عتاب نازل کرنے لگی۔ بحیثیت مجموعی اس شعر میں شاعر نے داعیانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے ماضی کی طرف سردست پلٹنے کی اہمیت بیان کی ہے۔

پانچواں شعر کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ شاعر نے اپنے عندیے کی تکمیل 'میں اکیلا ہوں' میں پوشیدہ رکھی ہے۔ یہاں پر 'میں اکیلا ہوں' سے مراد پوری قوم ہے۔ اور 'سمندر کا تلاطم' باطل قوت کی دیگر قومیں ہیں جو ہر ممکن اور ہر سمت سمندر کی موجوں کی طرح مسلسل اور متواتر تھپیڑیں مار رہی ہیں۔

آخری شعر میں شاعر نے 'کربلا آج بھی ہے' کے ذریعے قوم کو حق و باطل کے معرکہ خیز تصادم کے نتائج سے باخبر کیا ہے، یعنی ہر زمانے اور ہر قریے میں حق اور باطل نبرد آزما رہے، آخر کار ہمیشہ حق کو فتح اور باطل کو شکست ہاتھ آئی۔ لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوا کہ حق پر باطل غالب رہا، جب کہ حقیقتاً حق اور حق پرست بامراد ہوئے، جس کی تمثیل شاعر نے حضرت امام حسینؓ کے واقعۂ کربلا سے پیش کی۔ اس واقعے سے ایک طرف شاعر نے قومی حمیت کو للکارا ہے تو دوسری طرف قوم کے دلوں سے بزدلی، اداسی، انتشاری اور مایوسی کی کیفیت دور کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ حضرت امام حسینؓ نے عملی اقدام کسی ذاتی اغراض و مقاصد یا دولت و حکومت کی حصولیابی کے تحت نہیں اٹھائے، بلکہ انھوں نے اپنے نانا جان حضرت محمدؐ کے دین اور ان کے ماننے والے مسلمانوں کی بقا اور حفاظت کی خاطر اپنی اور اہل بیت کی گردنیں کٹوا کر اسلامی پرچم کو لہرایا تھا۔ شاعر نے مصرعۂ ثانی میں یہ کہہ کر "وہ محمدؐ کی نواسی ہے" قوم کے لیے لمحۂ فکریہ پیدا کر دیا، کیونکہ حضرت امام حسینؓ کی بہن حضرت زینبؓ نے تو اپنے دونوں بیٹے عون اور محمد کو ہمارے لیے قربان کر دیا تھا، اور آج ہم ایسے بزدل اور ضمیر فروش ہو گئے کہ دین اور قوم دونوں سے پہلو تہی اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ اسی لیے عصر حاضر میں یہ قوم نامساعد حالات سے دوچار ہے۔

بحیثیت مجموعی زیر تجزیہ غزل قوم کے عصری منظر نامے کو پیش کرتی ہے۔ نازکی نے جس مضمون کا انتخاب کیا ہے وہ ان کی قوت مشاہدات و تجربات کی جلوہ گری کی عمدہ دلیل ہے، اور انھوں نے فنی نقطۂ نظر کے تحت دو متضاد کیفیت کو اس سلیقے سے باندھا ہے کہ پوری غزل ایک خاص تحرک اور جمالیاتی احساس سے متصف ہو گئی ہے۔ شاعر کا یہ کمال ہے کہ ایک مخصوص موضوع کی ترسیل کے لیے جو وسیلۂ اظہار اختیار کیا ہے وہ پر تاثیر ہے۔ دوسرا نکتہ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ نازکی نے اپنے خیالات کی پیش کش میں نہ ہی فن کو مجروح کیا اور نہ ہی مضامین کو۔ لہٰذا یہ غزل فکر اور فن دونوں لحاظ سے بلند مرتبے کی حامل ہے۔

آخری شعر میں شاعر نے کربلا آج بھی ہے' کے ذریعے قوم کو حق و باطل کے معرکہ خیز تصادم کے نتائج سے باخبر کیا ہے، یعنی ہر زمانے اور ہر قریے میں حق اور باطل نبرد آزما رہے، آخر کار ہمیشہ حق کو فتح اور باطل کو شکست ہاتھ آئی، لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوا کہ حق پر باطل غالب رہا، جب کہ حقیقتاً حق اور حق پرست بامراد ہوئے، جس کی تمثیل شاعر نے حضرت امام حسینؓ کے واقعۂ کربلا سے پیش کی۔

■

Dr. Shakir Ali Siddiqui
Assistant Professor, Discipline of Urdu
School of Humanities,
Indira Gandhi National Open University,
New Delhi-110068
Mob.: 9891579220
Email.: sasiddiqui1@ignou.ac.in

اردو شاعرات کی نظموں میں اساطیری کردار

محمد حسین

اردو میں جدید نظم نگاروں نے جدید افکار و نظریات اور رجحانات سے سروکار رکھتے ہوئے موضوعاتی سطح پر بھی تخلیقیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ جدید نظموں کے موضوعات میں حیات و کائنات کے وہ مسائل بھی جگہ پاتے ہیں جو ایک زمانے تک شجرِ ممنوعہ تسلیم کیے جاتے تھے۔ اسی طرح جدید نظموں میں صارفی زندگی کی کھردری حقیقتیں بھی نظر آتی ہیں۔ سماجی حقیقتوں کے تخلیقی و ادبی اظہار کے لیے نظم کے سانچے کو ہی مناسب سمجھا گیا۔ اس لیے جدید نظموں کے موضوعات میں ہمیں تنوع نظر آتا ہے۔ جدید نظم نگاروں میں خواتین کی بھی خاصی تعداد ہے۔ لیکن اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ جدید نظم نگاروں کی نمائندہ نظموں کا انتخاب شائع کیا جاتا ہے تو شاعرات کے کلام کو شاذ و نادر ہی جگہ دی جاتی ہے۔ حالانکہ جدید نظم نگار شاعرات بھی اس صف میں ایک مقام رکھتی ہیں۔ شاعرات نے بھی اردو شاعری کے میدان میں اپنی منفرد نظموں سے ایک اہم اضافہ کیا ہے۔ شاعرات کی نظموں کے توسط سے اردو میں خواتین سے وابستہ مسائل کا اظہار ہونے لگا۔ کیوں کہ اردو نظم نگار شعرا کی توجہ اس جانب نہیں ہوتی تھی اس طرف خواتین نے ہماری توجہ مبذول کرائی۔ تانیثی مسائل کے اظہار میں خواتین نے سب سے زیادہ نظم کی ہیئت کو قبول کیا ہے۔ کیوں کہ نظم میں غزل جیسی ہیئتی اور میکانکی بندش واقعاتی تسلسل کے اظہار میں رکاوٹ نہیں پیدا کرتی۔ خواتین نے جہاں مرد اساس معاشرے کو بے نقاب کرنے والی بے باک نظمیں لکھی ہیں وہیں خواتین سے وابستہ مخصوص جذبات کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی ہیں، اس لیے اردو نظموں میں نسائی شاعری کے ایک الگ رنگ کا اضافہ ہوا۔ ادا جعفری سے لے کر پروین شاکر، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، شفیق فاطمہ شعریٰ، بلقیس ظفیر الحسن، فاطمہ حسن اور شہناز نبی جیسی نمائندہ شاعرات نے جدید نظموں کی دنیا میں اپنی ایک الگ پہچان بنائی ہے۔

جدید نظم نگار خواتین نے پدرسری معاشرے میں عورت کے وجود اور مقام و مرتبے کی ردِ تشکیل کا کام کیا ہے۔ ہمارا سماجی نظام جس میں عورت کا وجود ایک ثانوی حیثیت کا حامل تصور کیا جاتا رہا ہے اس کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے شاعرات نے ایسی نظمیں لکھی ہیں جن میں اس حقیقت کا برملا اظہار ملتا ہے۔ شاعرات کی نظمیں یہ اعلان کرتی نظر آتی ہیں کہ عورت بھی ایک مستقل بالذات وجود ہے اور اسے بھی اختیارات حاصل ہیں جس طرح آزاد انسان کو حاصل ہیں۔ پابندیوں اور ذمے داریوں کا بوجھ صرف اس پر کیوں لادا جائے۔ عورت کے ساتھ سماج میں برسوں سے ہو رہی ناانصافی کو شاعرات نے اپنی تخلیقات میں نظم کیا ہے۔ اسی رجحان کے تحت تخلیق پانے والی نظموں میں سیتا، مریم، عائشہ، دروپدی اور اقلیما جیسے اساطیری کرداروں کو بھی شاعرات نے شاعرانہ تخیل کے ساتھ برتا ہے۔ ان اساطیری کرداروں کو شاعرات نے بڑی معنویت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ شاعرات نے ان کرداروں کو نظم کرتے ہوئے واعظانہ انداز اختیار نہیں کیا بلکہ ان اساطیری کرداروں کے بارے میں جو کہانیاں مذہبی صحائف اور مذہبی کتب میں موجود ہیں ان کہانیوں سے ہی عورت کی مظلومی کا نقشہ کھینچا ہے۔ شاعرات نے ان اساطیری کرداروں سے ایک نیا معنوی جہان خلق کیا ہے۔

اردو کی ایک بے حد سنجیدہ اور علمی شاعری کرنے والی شاعرہ شفیق فاطمہ شعریٰ کی ایک نظم 'سیتا' کے عنوان سے ہے جس میں سیتا کی کہانی کے ذریعے عہد حاضر کی عورت کی مظلومی کا بھی نقشہ کھینچا ہے۔ نظم طویل ہے لیکن اس کا وہ حصہ یہاں درج کرنا لازمی ہے، جس حصے میں سیتا کی عفت و پاکدامنی موضوع گفتگو بنی تھی۔

سبھی جو ستم بن گئے سب فسانے/ تلافی کا اب آرہا تھا زمانہ/ ہوئی آہ لیکن یہ کیسی تلافی/ دوبارہ ملا جنگلوں میں ٹھکانہ

اور آخری بند بھی دیکھیں۔

صلیب ایک باقی جو تھی مامتا کی/ اسے بھی تو لازم تھا تنہا اٹھانا/ عجب ہیں یہ اسرار وصل و جدائی/ کہ منزل کو پا کر بھی منزل نہ پائی/ یہ کیسا ستم تھا کہ عفت کی دیوی/ ثبوت اپنی عفت کا دینے کو آئی/ وہ شعلے کی مانند شعلوں سے گزری/ وہ بجلی سی بن کر زمیں میں سمائی

سیتا نے رام کے ساتھ بن باس کی زندگی گزاری، ساری تکلیفیں اور اذیتیں برداشت کیں لیکن جب جنگل سے واپسی ہوئی تو لوگوں نے سیتا کی پاکدامنی پر سوالیہ نشان قائم کیا۔ کیوں کہ جنگل میں قیام کے دوران راون اپنے مکر کے ذریعے سیتا کو اٹھا لے گیا تھا جس کے بعد لکشمن اور رام مل کر لنکا پر چڑھائی کر کے سیتا کو واپس لائے۔ سیتا کو راون اٹھا لے گیا تھا اس لیے وہ سیتا جو عفت کی دیوی مانی جاتی ہے اس کی عفت و پاکدامنی پر سوالیہ نشان قائم کیا گیا جس کے نتیجے میں بھرے دربار میں سیتا کی اگنی پرکشا لی گئی اور یہ کہا گیا کہ اگر سیتا پاکدامن ہوگی تو آگ اسے ہرگز جلا نہیں سکتی لیکن اگر وہ پاکدامن نہیں ہوگی تو جل جائے گی۔ سیتا نے اگنی پرکشا بھی دی۔ اس اگنی پرکشا میں پاس ہونے کے بعد سیتا نے دل برداشتہ ہو کر برہما سے دعا کی کہ برہما مجھے اس دنیائے فانی سے اپنی طرف بلا لے۔ میں ایسے لوگوں میں کیوں رہوں جنھیں مجھ پر اعتبا رنہیں، جنھوں نے میری پاکدامنی پر شک کیا اور مجھے امتحان سے گزار کر مطمئن ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ برہما نے سیتا کی دعا قبول کر لی اور وہیں بھرے دربار میں زمین پھٹی اور سیتا وہیں زمین میں سما گئی۔ تبھی شفیق فاطمہ شعریٰ نے کہا ہے کہ

یہ کیسا ستم تھا کہ عفت کی دیوی/ ثبوت اپنی عفت کا دینے کو آئی/ وہ شعلے کی مانند شعلوں سے گزری/ وہ بجلی سی بن کر زمیں میں سمائی

عفت کی دیوی سیتا کو اپنی عفت کا ثبوت دینے کے لیے شعلوں سے گزرنا پڑا لیکن اس کے بعد وہ بجلی بن کر زمین میں سما گئی اور لوگ دیکھتے رہ گئے۔

ماضی کے علاوہ آج کے جدید اور متمدن عہد میں بھی بعض مقامات پر عورت کی پاکدامنی کے ٹیسٹ کے لیے Virginity test وغیرہ کی خبریں سامنے آتی رہتی ہیں وہ آج کی ہی پیداوار نہیں ہیں بلکہ عہد قدیم سے ہی پدرسری نظام نے عورت کے کردار کو شکوک و شبہات کے گھیرے میں رکھا ہے، یہاں تک کہ جو شخصیات ان کی نظر

میں پوجنے والی اور عظیم ہستیاں رہی ہیں انہیں بھی پاکدامنی کا ثبوت دینے کے لیے مجبور کیا گیا ہے۔

اردو کی ایک اور اہم شاعرہ رفیعہ شبنم عابدی نے بھی اس تھیم پر ایک نظم کہی ہے، جس کا عنوان "گواہی" ہے۔ نظم میں رفیعہ شبنم عابدی نے مختلف مذاہب کے اساطیری کرداروں کے نام شامل کر کے ان کے ساتھ ہونے والی واردات اور اب کی عورت کے ساتھ درپیش معاملات کا موازنہ کیا ہے۔ رفیعہ شبنم نے ان اساطیری اور مذہبی کرداروں کے ساتھ پیش آنے والے واقعات پر سوال قائم کرنے کے بجائے آج کی عورت کے ساتھ درپیش معاملات پر گفتگو مرکوز رکھی ہے۔

وہ کلی تھی/ اس کی قبائے عصمت چاک نہیں ہوئی تھی / وہ مریم تھی/ اس کے دامن پہ کوئی دھبہ نہ تھا/ وہ زمزم تھی/ اس کو کسی نے چکھا نہ تھا/ وہ سیتا تھی/ کوئی شعلہ اس کے جسم تک پہنچا نہ تھا/ وہ میرا تھی/ زہر اس کی رگوں میں اترا نہ تھا/ وہ آئینہ تھی/ جس پر کوئی عکس ٹھہرا نہ تھا/ میں کہ ایک عورت ہوں/ بے حسوں کی غیرت ہوں/ میں زمین جیسی ہوں/ پھل بھی دوں تو مٹی ہوں/ پاکباز ہو کر بھی/ دل نواز ہو کر بھی/ آزمائی جاتی ہوں/ میں جلائی جاتی ہوں/ سانس سانس کٹتی ہوں/ بھائیوں میں بٹتی ہوں/ داؤں پر بھی لگتی ہوں/ دن رات سلگتی ہوں۔ (اگلی رت کے آنے تک)

نظم پڑھتے ہوئے کوئی بھی آسانی سے محسوس کر سکتا ہے کہ رفیعہ شبنم عابدی نے سیتا، مریم اور میرا جیسے اساطیری کرداروں کی زندگی میں پیش آئے واقعات کو ویسے ہی خوش اسلوبی سے بیان کیا جیسے ان مقدس ہستیوں کو ماننے والے افراد کرتے ہیں۔ کوئی سوال اور کوئی اعتراض قائم نہیں کیا، لیکن آج کی عورت کی دردناک حالت کے لیے انھوں نے جو کہا ہے اس سے وہ یہ تاثر دینا چاہتی ہیں کہ آج کی عورت نہ سیتا ہے، نہ مریم ہے اور نہ میرا جن کے دامن پہ دھبے نہیں ہوں جو بالکل پاک و صاف مانی جائیں۔ کیونکہ آج کی عورت کی حالت یہ ہے کہ پاکباز ہونے کے باوجود ان کی پاکدامنی مشکوک ٹھہرتی ہے اور انہیں طرح طرح کی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ بے حسوں کی غیرت، زمین، جو لاکھ پھل دے لیکن اس کا مول تو یہی ہے کہ وہ مٹی ہے۔ عورت پاکباز اور دلنواز ہو کر بھی آزمائی اور جلائی جاتی ہیں، کبھی جہیز کے نام پر کبھی غیرت کے نام پر، اس کا وجود سانس سانس کٹتا ہے بھائیوں میں تقسیم ہوتا ہے اور اسے داؤں پر بھی لگایا جاتا ہے۔ عورت کو آزمایا جاتا ہے اور آزمائش کے بعد اگرچہ وہ پاکدامن ثابت ہو جاتی ہے لیکن اس کا وجود ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ جس کے لیے وہ سراپا قربان ہے وہ بھی اسے لائق اعتبار نہیں سمجھتا ہے۔ اس کسک اور درد کا مداوا ممکن نہیں ہے۔

بیسویں صدی کی نصف آخر میں ابھرنے والی شاعرات میں ایک اہم سنجیدہ نام شائستہ یوسف کا بھی آتا ہے۔ ان کے دو شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ 'سونی پرچھائیاں' اور 'گل خودرو'۔ شائستہ یوسف بڑی شائستگی سے اردو شاعری میں اپنا مقام بناتی ہیں ان کی شاعری میں شائستگی، سنجیدگی اور متانت ہے۔ انھوں نے ایک نظم میں ہر عہد کی عورت کا کرب بیان کیا گیا ہے۔ جب عورت کی عفت و پاکدامنی شک کے گھیرے میں آتی ہے تو اس پر کیا گزرتی ہے۔ نظم کا عنوان 'تطہیر' ہے جو ان کے شعری مجموعے 'سونی پرچھائیاں' میں شامل ہے۔

ان کے مبارک ہاتھوں نے/ میرے نام کا قرعہ نکالا/ میں اپنی قسمت پر نازاں/ ان کے ساتھ غزوے میں چل دی/ صحرا کا سفر/ اونٹوں کا قافلہ/ ان کی سرداری/ میرے عروج کا ستارہ چمکا..... میرا نازک حسین بدن/ لطافت میں اپنی مثال آپ رہا/ وہ سفر میں اپنی سرداری/ اپنی دیانت داری، اپنے فرائض میں مصروف رہے/ قافلہ رکا/ میری طبیعت میں بسی آزادی/ کھلے میدان میں / اپنی پہچان میں گم ہوئی/ ان کی محبت، ان کا ساتھ/ دونوں عالم میں اپنا مقام/ میں تمام باتوں کو سوچ کر/ لہراتی رہی/ جانے کب کوچ کا اعلان ہوا/ میرے ہار کے موتی ٹوٹ کر بکھر گئے/ میں ان کو چنتے چنتے جانے کہاں/ نکل گئی/ نیند کا غلبہ، صحرا، تنہائی، اندھیرا/ سب نے بے بہرہ اپنا کام کیا۔/ رات نے دن کا لباس پہن لیا/ تقدیر نے مہربان کو رہبر کیا/ اونٹنی نے اگلے گھٹنے ٹیکے/ میں اس کی پشت پر سوار ہوئی/ رہبر مہار تھامے ساتھ چلتا رہا/ سورج سر پر آ گیا/ قافلے میں طوفان مچ گیا/ اور میری قسمت کے چاند کو گہن لگا/ ان کی نظریں/ میرا چہرہ پڑھ نہ سکیں/ لطف والتفات کی کمی/ مجھے زندہ در گور کر گئی/ بیماری میرا بستر ہوئی/ میں دریائے عمیق میں ڈوب گئی/ اندھیرا ہی اندھیرا پھیلا/ میں گہرائی میں اترتی چلی/ انگلیوں کی حرکت، دل کی دھڑکن/ دھن کی آواز/ ہر شے کو سیاہی کھا گئی/ میرے دل نے اس نور کی تمنا کی/ جس کی معمولی سی لکیر/ اس سیاہ دائمی عذاب سے نجات دلا سکتی/ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا/ میں کیا کروں؟/ میں کہاں جاؤں؟/ میں اس طاق کو کیسے ڈھونڈھوں/ جہاں قندیل میں جلتے چراغ سے/ نور بکھر رہا ہے/ میرے اللہ میں نہیں جانتی/ کون سا مبارک تیل/ تیرے چراغ کو روشن کرتا ہے؟/ میں اس اندھیرے سے کیسے نکلوں؟/ کہیں لگاتار بہتے آنسوؤں نے/ میری بصارت کا حال/ اولاد سے بچھڑے باپ کا سا تو نہیں ہو گیا!/ محبت اور جدائی کا الم/ مجروح جذبات، سینے سے اٹھتی ٹیس/ ذہن میں سسکتی کربناک سلوٹیں/ میں کیسے پکاروں؟/ کہیں کوئی دریچہ کھلے!/ کہیں سے ہوا کا جھونکا آئے/ میری بدنامی کے اندھیرے کو/ سچ کی روشنی میں دیکھے/ میرے بے بس والدین کی گواہی/ اتنے بڑے قافلے کے آگے بے بس ہوئی/ ان کے مبارک قدم/ میری اجڑی زندگی میں/ امید کی ایک کرن لے کر آئے/ لیکن مجھ سے حق کا تقاضا نہ ہوا/ دن رات میرے/ ساتھ رہنے والوں نے/ یقین کی مہر ثبت کر دی/ مجھے اس کی عدالت اور انصاف پر/ یقین کامل تھا/ ایک ندا، ایک صدا نے میری برأت کر دی/ ایک روشن آیت میرے نام کے ساتھ/ تا قیامت جڑ گئی/ میری تطہیر ہو گئی/ ان کے لب مسکرائے/ بادل چھٹ گئے/ رات اور دن پھر/ اپنے دائرے میں تیرنے لگے/ لیکن میرے دل نے کہا/ کاش انھوں نے/ میری محبت پر یقین کیا ہوتا/ میرے خالق نے ثبوت دیا/ "عالم الغیب" صرف ایک ہے۔

شائستہ یوسف کی یہ نظم ہر عہد کی عورت کا بیانیہ ہے کہ جب اس کی عفت اور پاکدامنی پر تہمت لگتی ہے تو ساری دنیا تو اس کے خلاف ہوتی ہی ہے لیکن سب سے زیادہ تکلیف اسے اس وقت ہوتی ہے جب اس کا ساتھ وہ بھی نہیں دیتا جسے وہ سب سے زیادہ چاہتی ہے۔ اس لیے کسی بھی عورت کی پاکدامنی پر سوال قائم ہو تو اگرچہ اس کی برأت اور پاکدامنی ثابت ہو جائے لیکن اس کے دل میں یہ کسک ضرور رہ جاتی ہے کہ اس سے بے انتہا محبت کرنے والا اسے اس وقت تنہا چھوڑ دیتا ہے جس وقت اسے اس کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔

ان شاعرات کے علاوہ فہمیدہ ریاض کی اقلیما، شفیق فاطمہ شعری کی بانوئے فرعون جیسے متعدد اساطیری کرداروں کے ذریعے عورت کی مظلومی کا نقش اردو شاعری کے صفحے پر ابھارا گیا ہے۔ اساطیری کرداروں کے ذریعے شاعرات نے عہد جدید کی عورت کو بھی نظم کیا ہے۔ ان کے ساتھ پیش آنے والے مسائل، ان کی ثانوی حیثیت اور پدرسری سماج میں اس کے مقام و مرتبے اور شناخت کو ظاہر کرنے والی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ایسی نظمیں بھی لکھی ہیں جن میں اساطیری کرداروں کے ذریعے عورت کے وجود پر چھائے بادل کی سیاہی کو مزید نمایاں کیا گیا ہے۔

■

Md Hussain
Ward No: 01, Bhewa Chowk Jayanagar
Distt.: Madhubani- 847226 (Bihar)
Mob.: 9811985005

محمد ارشد

اردو مثنوی میں مشترکہ ہندوستانی تہذیب

ہندوستانی تہذیب بالخصوص ہندو مذہب اور عقیدے کے مطابق بنارس ایک مقدس مقام ہے جہاں بہت سے عقیدت مند ہندو تیرتھ کے لیے جاتے ہیں اردو شاعری میں اس کا بہت ذکر ملتا ہے دیگر اصناف کی طرح مثنوی میں بھی اس کا بیان اکثر و بیشتر ہوا ہے۔ بنارس کی تعریف میں غالب کی مثنوی 'چراغ دیر' کا شمار غالب کی بہترین مثنویوں میں کیا جاتا ہے جس میں بنارس کو شنکھ پھونکنے والوں کا کعبہ کہا گیا ہے۔ بے نظیر شاہ نے بنارس کا ذکر بہت خوش اسلوبی سے کیا ہے جس میں ہندو مذہب سے متعلق بہت سی اصطلاحوں کا خوبصورت بیان ملتا ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں۔

وہ سیلے وہ جوڑے چمکتے ہوئے
وہ کانوں میں مندرے لٹکتے ہوئے
وہ گھنٹی بجاتے ہوئے برہمن
ہیں بت خانوں میں کس طرح نعرہ زن
وہ تھالی میں سندور چندن لیے
کوئی آرہاہے عجب آن سے
کٹوری میں کوئی لیے پھول پان
کھڑی ہے وہ مندر میں مندر کی جان
چترنی کوئی تو کوئی پدمنی
کوئی ان میں رادھا کوئی جانکی
مہا دیو کو جل چڑھا کر تمام
چلی جاتی ہیں اپنے گھر شاد کام

کارتک کے مہینے میں کڑوا چوتھ کے بعد ہندوؤں کا اہم ترین تیوہار دیوالی ہے۔ اس موقعے پر گھر کی صفائی کی جاتی ہے اور نئے برتن اور نئی چیزیں خریدی جاتی ہیں اور گھروں کو سجانے کی بھرپور کوشش کی جاتی ہے اس تیوہار میں عورتیں دیواروں پر تصویریں اور فرش پر رنگولی بھی بناتی ہیں۔ دیوالی کارتک کی تاریک ترین رات کو منائی جاتی ہے اور اس رات چراغ وغیرہ جلا کر ہر طرف روشنی کی جاتی ہے۔ اردو کی متعدد مثنویوں میں دیگر ہندوستانی تیوہاروں کی طرح ہولی کا بھی خوب بیان ملتا ہے۔

بسنت پنچمی کا تیوہار ماگھ کے آخری ہفتے میں آتا ہے یہ بہار کے موسم کا نقیب ہے اور نئے سال کی بشارت دیتا ہے دوسرے مقامی تہواروں کی طرح اس کا تعلق بھی یہاں کے موسموں اور زراعتی اساس سے گہرا ہے۔ بسنت کے تعلق سے اردو شاعری میں جو حوالے ملتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہندوؤں کا خاص تیوہار ہے لیکن ان کے علاوہ ہندوستان کی دیگر قومیں بھی اس میں شریک ہوتی رہی ہیں۔ اس روز مرد عورتیں بچے سب زرد لباس پہنتے ہیں۔ فصل کے بارآور ہونے کے لیے دعا مانگی جاتی ہے اور قدیم روایات کے مطابق وشنو بھگوان کا پوجن ہوتا ہے۔ بعض علاقوں میں آم کا بور بھی پوجا جاتا ہے جو سرسبزی اور خوشحالی کا مظہر ہے۔ اردو کی دیگر اصناف کی طرح مثنوی میں بھی اس تیوہار کا بیان ہوا ہے درج ذیل اشعار میں کیا خوب منظر کشی کی گئی ہے۔

زن و مرد کرتے ہیں اس دن سنگار
مکانوں میں کرتے ہیں نقش و نگار
پروہت سے پاتے ہیں آموں کے بور
جو ہیں ان کے ججمان تحفہ کے طور
سمجھتے ہیں سب اس کو اچھا شگن
ہے یہ پھلنے اور پھولنا کا شگن
خصوصاً امیروں کے دربار میں
وزیروں کی شاہوں کی سرکار میں
دیا بور پہلے کیا پھر سلام
مبارک سلامت زباں پر کلام

طوائفیں بھی اس روز آموں کا بور لے کر امرا کے یہاں جاتی ہیں اور مبارک سلامت کے بول گاتی ہیں۔ بسنت کے روز خاص شاہی دربار منعقد ہوتا ہے اور حاضرین کی تواضع الائچی چکنی ڈلی، جوز، پھول اور پان سے کی جاتی ہے۔ ہندو امرا سے بعض کو خلعت، بعض کو پاندان اور بعض کو دوشالے بطور تحفہ دیے جاتے ہیں۔

عطا ہوتا ہے بعض کو پان دان
الائچی ڈلی جوز اور پھول پان
سوا ہوتی ہے خاص کی منزلت
کہ خلعت انھیں ہوتے ہیں مرحمت
دوشالہ بہت تحفہ کشمیر کا
باکرام ہوتا ہے ان کو عطا

جموں و کشمیر کی بسنت کا ذکر خوشی محمد ناظر نے کیا ہے یہاں بھی ہندو اور مسلمان اسے مل کر مناتے تھے، دربار منعقد ہوتا تھا، بازاروں میں ہر طرف رونق دکھائی دیتی تھی اور سب لوگ زرد لباس پہنتے تھے۔ علاوہ ازیں بہت سی

مثنوی میں اس کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔

بسنت کے کچھ عرصے کے بعد ہولی پھاگن کے مہینے میں آتی ہے۔ بعض ہندو دانشوروں کا کہنا ہے کہ ہولی دراصل ایک دراوڑی تیوہار ہے جسے بعد میں آریوں نے بھی اپنا لیا۔ پورانک روایتوں کے مطابق وشنو بھگوان نے ہندوؤں کی چار بڑی ذاتوں کے لیے چار تیوہار مقرر کیے تھے۔ راکھی پورنیا برہموں کے لیے، دسہرہ کھتریوں یا شہریوں کے لیے، دیوالی ویشوں کے لیے اور ہولی شودروں کے لیے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پرانوں کے زمانے تک ہولی کا رواج صرف شودروں میں نچلے طبقے کی ذاتوں میں تھا۔ یہ تیوہار ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مختلف طریقوں سے منایا جاتا ہے۔ اس کے آغاز کے سلسلے میں بعض روایتیں مشہور ہیں مثلاً بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہولی کا تعلق ' کاموری تیوہار' سے ہے جس پر کام دیوتا (کیوپڈ) کی پرستش کی جاتی تھی اور جو بہت کچھ بسنت سے ملتا جلتا تھا۔ ہولی کی ابتدا کے تعلق سے ایک روایت یہ ہے کہ اس روز شری کرشن نے راکھشسنی 'پوتنا' کو شکست دی تھی۔ اس طرح کی اور بہت سی روایتیں ہولی سے متعلق مشہور ہیں۔ مرد عورتوں پر اور عورتیں مردوں پر رنگ چھڑکتی ہیں اور اس سلسلے میں ہر قسم کی پابندیوں کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ جگہ جگہ عبیر اور گلال کی بارش ہوتی ہے اور گلی کوچے رنگ میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ تیوہار پھلیر ادوج سے شروع ہوتا ہے اور اگلی دوج پر ختم ہو جاتا ہے۔ آخری دن کو ہولکا اشٹک کہتے ہیں اور یہی تیوہار کا اہم ترین دن ہے۔ اس روز جگہ جگہ جو آگ روشن کی جاتی ہے وہ دراصل قدیم عقیدوں کے مطابق فصلوں کو بدروحوں کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے ہے۔

متعدد اردو مثنویوں میں ہولی کا بھرپور ذکر ملتا ہے جس سے اس تیوہار کے متعلق بہت سی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ حاتم کی 'مثنوی بہاریہ' میں ہولی اور دیوالی کا ذکر ملتا ہے۔ حاتم نے ہولی کے بہترین رنگوں کو یکجا کر دیا ہے اور کم سے کم الفاظ میں ہولی کے ایسے جمال افروز اور عشق خیز مرقعے پیش کیے ہیں کہ ہولی کی رنگینیاں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔

لگی پچکاریوں کی مار ہونے
ہر اک سو رنگ کی بوچھار ہونے
گلال ابرک سے سب بھر بھر کے جھولی
پکارے یک بیک ہولی ہے ہولی
کوئی لے رنگ پچکاری بھرے ہے
کوئی رنگین لباس اپنا کرے ہے
کوئی اپنا کھڑی دامن نچوڑے
کوئی آنکھیں لڑا کر منھ کو موڑے
گلال ایسا اڑا از صبح تا شام
ہوا رنگِ زمیں سارا شفق جام
تماشا سا تماشا ہو رہا ہے
کہ ہر اک بات سے جی دھو رہا ہے

میر تقی میر کی ہولی سے متعلق دو مثنویاں ملتی ہیں۔ یہ دونوں لکھنؤ میں لکھی گئیں اور ان میں وہاں کا رنگ نمایاں ہے ان میں سے ایک دراصل آصف الدولہ کی شادی کے موقعے پر لکھی گئی تھی اور اس میں ہولی کا ذکر ضمناً آیا ہے۔ ان مثنویوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کے بادشاہوں کی طرح لکھنؤ کے نواب بھی ہولی کی رنگ رلیوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ہولی کے روز جشن ہوتا تھا گلال کے قمقمے بھر بھر کے مارے جاتے تھے اور عبیر میں گلاب کی پنکھڑیاں ملا کر ایک دوسرے پر چھڑکتے تھے اس منظر کو میر نے بڑے خوبصورت ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔

قمقمے جو گلال کے مارے
مہوشاں لالہ رخ ہوئے سارے
خوان بھر بھر عبیر لاتے ہیں
گل کی پتی ملا اڑاتے ہیں
جشن نوروز ہند ہولی ہے
راگ رنگ اور بولی ٹھولی ہے

میر کے زمانے کے مشہور شاعر قائم چاند پوری نے اپنی 'مثنوی در وصف ہولی' میں اس تیوہار کی بہترین منظر کشی کی ہے۔

کسی پر کوئی چھپ کے پھینکے ہے رنگ
کوئی قمقموں سے ہے سرگرم جنگ
کسو نے لگائی ہے کونے میں گھات
کہ بازی میں خلوت کی ہیں لاکھ بات
ہے ڈوبا کوئی رنگ میں سر بسر
فقط آب میں ہے کوئی تربتر
زبس ہر طرف رنگ کی مار ہے
جہاں یک قلم زعفران زار ہے
الٰہی ہے جب تک یہ شور و شر
ہو عالم میں ہولی سے باقی اثر

ہندوستانی تہذیب کے دوسرے اداروں کی طرح ہندوستانی رسم و رواج بھی اپنی رنگا رنگی کے باوجود ایک داخلی ہم آہنگی رکھتے تھے لہٰذا اردو شاعری میں شادی بیاہ کی جن رسوم کا ذکر ملتا ہے۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں تقریباً ایک سی ہیں مثلاً دونوں میں شادی کا جلوس برات کی شکل میں نکلتا ہے۔ برات لڑکے والوں کی طرف سے لڑکی کے گھر جاتی ہے۔ ہندوؤں میں رواج ہے کہ ایک ورن کی شادی دوسرے ورن میں نہیں ہوتی مثال کے طور پر کھتری کا رشتہ کھتری کے یہاں اور ویش کا رشتہ ویش کے یہاں کیا جاتا ہے نچلی ذات والوں کے یہاں اعلیٰ ذات کے لوگ میل جول جائز نہیں سمجھتے۔ دونوں مذاہب والوں کے یہاں شادی سے قبل منگنی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ مسلمانوں میں منگنی کے موقع پر دلہن کو چڑھاوے کی رقمیں چڑھائی جاتی ہیں۔ ہندوؤں میں ''روپ درشن'' ادا کرتے ہیں۔ شادی کے کچھ روز پہلے مائیوں بٹھانا ایک رسم ہے مائیوں بٹھانے کے بعد اندر عورتیں اور باہر مرد ابٹنا گاتے ہیں۔ یہ رسم بہت کچھ ہولی اور رنگ پاشی سے ملتی جلتی ہے۔ شادی سے کچھ روز قبل دولہا دلہن کے گھروں میں ہم عمر لڑکیاں اور جوان عورتیں آپس میں مل کر سہاگ اور گھوڑیاں گاتی ہیں۔ زخم چشم سے محفوظ رہنے کے لیے دولہا کے یہاں کوئی ہتھیار یا چاقو دے دیتے ہیں۔ شادی سے کچھ دن پہلے مہندی کی رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔ سہاگ پڑا کاغذ کی ایک بڑی تھیلی میں بنایا جاتا ہے اس میں خوشبودار ادویات ہوتی ہیں جنھیں دولہا اور سہاگنوں سے پسوا کر دلہن کی مانگ میں بھرتے ہیں بعد ازاں دلہن کی بہنیں دولہا کے یہاں مہندی لے کر جاتی ہیں۔ سالیاں دولہا کو مہندی لگاتی ہیں اور اپنا نیگ مانگتی ہیں دولہا ان کو حسب مقدور نیگ دیتا ہے اور ڈومنیاں مبارکباد گاتی ہیں۔

گزری شب صبح کا ہوا تڑکا
ہوئی مہندی کی دھوم ہر یک جا
تھا یہ مہندی کے خوانوں پہ جوبن
شمعیں کافوری ان میں تھیں روشن
گہنے پھولوں کے ہار پھولوں کے
خوان تھے بے شمار پھولوں کے
تھی غرض واں عجیب کیفیت
ساری رسموں سے جب ہوئی فرصت
کام کرنا تھا جو وہ کر آئیں
لے کے مہندی کا نیگ گھر آئیں

ہندو معاشرے میں عورتوں کا لباس زمانہ قدیم سے ساڑی رہا ہے جو آدھی کمر سے لپیٹ کر باندھ لی جاتی ہے اور آدھی کندھے یا سر پر پلو کی شکل میں ڈال لی جاتی ہے کمر سے اوپر کا حصہ ڈھانکنے کے لیے بھی ہندوؤں میں ہزاروں سالوں سے ایک لباس رہا ہے جو شمالی ہند میں انگیا اور دکنی ہندوستان میں چولی کہلاتی ہے۔ ماتھے پر ٹیکا ہندو سہاگنوں کا خاص نشان ہے دکن کی مثنویوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں یہ بہت عام تھا اور ہندو عورتوں کے

ہندوستان وہ ملک ہے جس میں مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہیں اور سب کی اپنی اپنی مخصوص تہذیب اور کلچر ہے، لیکن اس کے باوجود یہاں کا مشترکہ کلچر جس میں سبھی مذاہب اور قوموں کا رنگ نظر آتا ہے، اپنی مثال آپ ہے، جس کی مثال دنیا کے کسی ملک و معاشرے میں نہیں ملتی۔

اثر سے بعض مسلمان عورتوں نے بھی اس کا اثر لیا شمالی ہند کی مثنویوں میں اس کا بہت کم ذکر ملتا ہے سحر البیان کا ایک شعر دیکھیے ۔

وہ ماتھے پر ٹیکے کی اس کے جھلک
سحر چاند تاروں کی جیسے جھلک

شمالی ہند کی اٹھارہویں صدی میں لکھی گئی مثنویوں میں عورتیں اکثر بھجند، پہونچی یا چوڑیاں اور کالی بانکیں پہنتے نظر آتی ہیں۔ دکن کا کنٹھ مال شمال میں منت کا طوق بن گیا۔ مثنوی سحر البیان میں میر حسن نے جوگن کا حلیہ بیان کیا ہے جس میں لباس سے متعلق خاصی معلومات ہوتی ہے ۔

پہن سیلی اور گیروا اوڑھ کھیں
چلی بن کے صحرا کو جوگن کا بھیس
پہن ایک لہنگا زری باف کا
وہ پردا ساکر اس تن صاف کا
زمرد کی سمرن کو ہاتھوں میں ڈال
اور ایک بین کاندھے پر اپنے سنبھال
چلی بن کے جوگن وہ باہر کے تئیں
دکھاتی ہو چال ہر ہر کے تئیں

اردو کی متعدد مثنویوں میں اسلامی کلچر کی جھلکیاں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ مسلمان شاعروں کی طرح ہندو مثنوی نگار شعرا نے بھی اپنی مثنویوں کا آغاز اکثر حمد و نعت اور منقبت سے کیا ہے۔ اردو کے مشہور مثنوی نگار پنڈت دیا شنکر نسیم گلزار نسیم کے آغاز میں لکھتے ہیں ۔

ہر شاخ میں شگوفہ کاری
ثمرہ ہے قلم کا حمد باری
کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسر
حمد حق و مدحت پیمبرؐ
پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے
یعنی کہ مطیع پنجتن ہے
ختم اس پہ ہوئی سخن پرستی
کرتا ہے زباں سے پیش دستی

گلزار نسیم میں جگہ جگہ اسلامی تہذیب کے نمایاں نشانات موجود ہیں عقائد اور روایات کے علاوہ مسلمانوں کی طرز معاشرت اور رسم و رواج کا ذکر بھی جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ اس مثنوی کے قصے کے بعض عناصر اسلامی حکایات سے میل کھاتے ہیں مثلاً تاج الملوک کے بھائی اس سے دعا کرتے ہیں یہ واقعہ حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ معلوم ہوتا ہے۔ پھول کو آنکھوں سے لگانے سے بینائی واپس آجاتی ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے واقعہ سے ملتا جلتا ہے۔

سحر البیان میں میر حسن نے بادشاہ کے اعتقاد کے سلسلے میں کہا ہے ۔

خدا پر زبس اس کو تھا اعتقاد
لگا مانگنے حق سے اپنی مراد

پردے کا رواج قدیم زمانے سے مسلمانوں میں چلا آرہا ہے اس کا مقصد مردوں اور عورتوں میں فاصلہ برقرار رہے اس کا مقصد یہ ہے کہ حجاب باقی رہے اور کوئی ایسی نازیبا حرکات سرزد نہ ہوں جس سے سماج کا شیرازہ بکھر جائے۔ مسلم معاشرے میں اکثر خواتین گھر میں ہی رہا کرتی تھیں اگر کوئی بہت ضروری کام آپڑا تو باہر نکلنے کے لیے اس طرح کا اہتمام کیا جاتا تھا کہ کسی غیر مرد کی ان پر نگاہ نہ پڑ سکے۔

سہرے کا رواج ہندوستان کی مشترکہ معاشرت کی ایک دلچسپ مثال ہے اس کا چلن مسلمانوں میں بھی خوب ہے ۔

شور صاحب کے بندھا آج جو سر پر سہرا
دوسرا تھا یہ مقدر میں مقرر سہرا

مسلمانوں میں آرسی مصحف شادی کی ایک رسم ہے اسے 'جلوہ' بھی کہا جاتا ہے۔ دولہا دلہن کو سر جوڑ کر آمنے سامنے بٹھاتے ہیں۔ بیچ میں تکیہ اور تکیے پر قرآن شریف رکھا جاتا ہے دولہا سورۂ اخلاص پڑھ کر دلہن کو سناتا ہے اور پھر اس پر دم کرتا ہے۔ بعد ازاں قرآن پر آئینہ رکھ کر دولہا دلہن کے اوپر کوئی کپڑا ڈال دیتے ہیں تاکہ شرمائی ہوئی دلہن آئینے میں اپنے شوہر کا دیدار کرلے دکن کی مثنویوں میں اس کا ذکر عام طور پر ملتا ہے۔ وجہی نے اس کا بیان یوں کیا ہے ۔

سوجلوا لگے دینے سب شاہ کو ں
سلکھن سکی مشتری ماہ سوں
مشاطہ ہو حو رآئے جنت تے بھل
کہ پردا ہے اسمان تارے سو پھل

میر حسن نے اس رسم کی منظر کشی یوں کی ہے ۔

ہوا جب نکاح اور بٹے ہار پان
پلا سب کو شربت دیے خاصدان
ہوا لیکن اس وقت دونا مزا
کہ دولہا دلہن جب ہوئے ایک جا
عروسی وہ گہنا وہ سوہا لباس
وہ مہندی سہانی وہ پھولوں کی باس
ملا سرخ جوڑے پہ عطر سہاگ
کھلے مل کے آپس میں دونوں کے بھاگ
دکھا مصحف اور آرسی کو نکال
دھرا بیچ میں سر پہ آنچل کو ڈال

شادی بیاہ کے علاوہ اسلامی کلچر سے متعلق مختلف چھوٹی چھوٹی رسموں، روایتوں اور عقائد وغیرہ کا ذکر ملتا ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو کی اکثر مثنویوں میں دیگر تہذیبوں کے ساتھ ساتھ مسلم معاشرے کی بھرپور عکاسی ملتی ہے اگر تلاش کیا جائے تو اردو کی مختلف چھوٹی بڑی مثنویوں میں یہ عناصر مل جائیں گے لیکن یہاں اہم اور مشہور رسوم کا ہی بیان ملحوظ خاطر تھا۔

اردو میں مذہبی مثنویاں کثرت سے لکھی گئی ہیں نیز دیگر موضوعات پر لکھی گئی مثنویوں میں جگہ جگہ اس کا عکس نظر آتا ہے۔ اردو کی مثنویاں کسی ایک مذہب سے متعلق نہیں بلکہ مختلف و متعدد مذہبوں کے تعلق سے لکھی گئی ہیں۔

ہندوستان وہ ملک ہے جس میں مختلف مذاہب کے لوگ آباد ہیں اور سب کی اپنی اپنی مخصوص تہذیب اور کلچر ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہاں کا مشترکہ کلچر جس میں سبھی مذاہب اور قوموں کا رنگ نظر آتا ہے، اپنی مثال آپ ہے۔ جس کی مثال دنیا کے کسی ملک و معاشرے میں نہیں ملتی۔ اردو شاعری میں یہاں کے مختلف و متعدد مذاہب کے لوگوں کے عقائد، رسم و رواج، کھان پان اور رہن سہن کا بھرپور ذکر ملتا ہے، جس کی بہترین مثال صنفِ مثنوی نے قائم کی ہے۔ اس صنف میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی اور یہاں کی دیگر تہذیبوں اور مخصوص کلچر کا بیان اکثر و بیشتر کیا گیا ہے۔ شالی اور جنوبی ہند، دونوں مقامات کی مثنویوں میں عکاسی ملتی ہے۔

مآخذ

1 ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری: گوپی چند نارنگ
2 دیوان زادہ (ملمی) حاتم لٹن لائبریری علی گڑھ
3 مثنوی عالم
4 ہندوستان کی تحریک آزادی: گوپی چند نارنگ
5 بیگمات اودھ: شیخ تصدق حسین
6 بستن عقد منہر و مد مالتی: نصرتی
7 اردو مثنوی شالی ہند میں: گیان چند جین

■

Dr. Mohd Arshad
Dept of Urdu
Haleem Muslim P G College
Kanpur - 208001 (UP)
Mob.:6395284531

ادب شناس شہر وانمباڑی

محمد طیب علی

شہر وانمباڑی ایک ادب شناس شہر ہے جسے جنوب کا علی گڑھ بھی کہا جاتا ہے۔ اردو زبان و ادب کے اعتبار سے شہر وانمباڑی کا علاقہ بہت ہی مشہور و معروف ہے۔ یہاں کی زمین اردو زبان و ادب کے لیے بڑی زرخیز ثابت ہوئی ہے۔

شہر وانمباڑی صدیوں پرانی تہذیب و ثقافت کا شہر ہے۔ یہاں کی تعلیمی، مذہبی، ادبی، سماجی و سیاسی تہذیب و تمدن اپنی انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔ اس شہر کا نام اور شناخت اساطیری کہانیوں سے تعلق رکھتا ہے۔ وانیامپاڈی = وانی امائی + پدی سے ماخوذ ہے جو کہ 'وانی امائی' دیوی سرسوتی کے نام کی نشان دہی کرتا ہے۔

اس شہر کی وجہ تسمیہ بتاتے ہوئے ریاست تمل ناڈو کے مشہور و معروف صحافی، ادیب و شاعر جناب اکبر زاہد لکھتے ہیں:

''ایک روایت کے مطابق وانمباڑی کا نام 'وانیاز' سے نکلا ہے۔ جو ایک قوم کا نام ہے جو یہاں مسلمانوں کی آمد سے قبل بسا کرتی تھی۔ مشہور سیاح لے فانو نے بھی یہی لکھا ہے کہ چونکہ یہ بستی تیلیوں (وانیاروں) کی تھی، اس لیے اسے وانمباڑی کہا جانے لگا۔''

(عکس وانمباڑی، اکبر زاہد، ص 11، وانمباڑی اردو اکیڈمی، جنوری 2012)

شہر وانمباڑی کی تاریخ زائد ہزار سال قدیم ہے۔ یہ شہر ہندو مسلم گنگا جمنی تہذیب کا ایک گہوارہ ہے۔ ہر قوم کے لوگ آپس میں مل جل کر شیر و شکر کی طرح رہتے ہیں۔ چولاؤں، پانڈینوں، ہوسیالا، چیراؤں، گلا سیکھرا، خلجی، تغلق، وجیانگر، مراٹھوں سے ہوتا ہوا یہ شہر سلطنت خداداد کے بانی حیدر علی کے بیٹے ٹیپو سلطان اور سلطنت والا جاہ کے دور حکومت پھر انگریزوں کے زیر تسلط رہا اور کئی ایک اعتبار سے یہ خطہ اہم رہا ہے۔ یہ شہر انگریزوں کے خلاف لڑائیوں کی تاریخ میں ایک معروف مقام حاصل ہے۔ حیدر علی اور ٹیپو سلطان برطانوی سلطنت کے خلاف اپنی جنگوں کے دوران وانمباڑی میں خیمہ زن تھے۔ اس وقت ٹیپو سلطان کی عمر صرف سترہ (17) سال تھی، جہاں انہوں نے انگریزوں کے خلاف پہلی جنگ لڑی تھی۔ جہاں ٹیپو سلطان نے فتح کا پرچم بلند کیا تھا اور برطانوی حکومت نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

تحریک آزادی خصوصاً ترک موالات میں اس شہر کا اہم حصہ رہا ہے۔ احمد آباد میں اس تعلق سے منعقد ہونے والے اجلاس میں دیگر قومی رہنماؤں کے ساتھ وانمباڑی کے بھی متعدد سیاسی رہنما شریک ہوئے تھے۔

جناب اکبر زاہد صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اس تاریخ ساز اجلاس (احمد آباد گجرات) میں وانمباڑی سے جناب متور عبدالقادر صاحب خالص اور گنڈ و عبدالستار صاحب اور دیگر کئی لوگوں نے شرکت کی۔ اس کے بعد صوبہ مدراس کے علاقوں میں گھوم پھر کر جنگ آزادی کا جذبہ عوام کے دلوں میں پیدا کیا اور دلوں میں جوش پیدا کیا۔ جب مدراس میں پرنس آف ویلز ایڈورڈ کی آمد ہوئی تو ان کا بائیکاٹ کیا گیا جس میں شہر وانمباڑی سے 200 سے زیادہ افراد نے مولانا فضل اللہ صاحب مرحوم کی قیادت میں حصہ لیا۔'' (ایضاً، ص 59،60)

شہر وانمباڑی سرسید تحریک سے بھی متاثر رہا ہے۔ 1916 میں جنوبی ہند مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس وانمباڑی میں ہوا تھا جس میں سرسید کے جانشین سر راس مسعود، سر اکبر حیدری اور بابائے اردو مولوی عبدالحق نے بطور خاص شرکت کی تھی۔

شہر وانمباڑی کو شہر سخن بھی کہا جاتا ہے۔ بڑے بزرگوں کے ساتھ ساتھ نوجوان نسل اور بالخصوص خواتین میں شعر و ادب کا ذوق بہت زیادہ ہے۔ محترمہ حجاب امتیاز علی تاج (پیدائش: 1907) جو مشہور و معروف ڈرامہ انار کلی کے خالق، امتیاز علی تاج کی اہلیہ تھیں۔ ان کی پیدائش اسی شہر میں ہوئی ہے۔ ان کی والدہ عباسی بیگم بھی (پ: 1881، و: 1928) یکساں طور پر نثر و نظم میں مہارت رکھتی تھیں جن کا مجموعہ کلام 'گل صحرا' ہے۔ گنڈ و عبدالقادر شاکر اور خطیب قادر باشاہ یہاں کے قدیم شعرا ہیں۔ یہاں بکثرت اردو شعرا و ادبا موجود ہیں۔ قدیم و جدید شعرا و ادبا کی ایک طویل فہرست ہے جو تقریباً ہر صنف ادب میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ادبی جرائد و رسائل 1906 سے شروع ہو چکے تھے۔ بیس 20 کے قریب ان کی تعداد تھی۔ ابھی بھی کئی رسائل یہاں سے شائع ہوتے ہیں۔ کئی ایک ادبی انجمنیں موجود ہیں جن کے زیر اہتمام کئی ادبی اجلاس اور مشاعرے بہت اہتمام سے منعقد کیے جاتے ہیں۔

بقول مختار بدری صاحب جب ابر احسنی مرحوم وانمباڑی آئے تھے تو انھوں نے کہا تھا کہ ''اردو کو شمال کے لوگ یہاں سے لے گئے تھے۔ اب وہاں حالات بگڑے ہوئے ہیں۔ لہٰذا یہ امانت آپ کو لوٹانے آیا ہوں۔ مجھے یقین ہے یہاں کے جیالے اردو کی بقا کے لیے سب کچھ کریں گے اور اردو یہاں زندہ رہے گی۔!''

ایک شاداب چمن ہی تو ہے وانمباڑی
منبع حکمت و فن ہی تو ہے وانمباڑی
شاکر و قادر و مسرور کا یہ شہر عظیم
مرکز علم و سخن ہی تو ہے وانمباڑی
میں تو کہتا ہوں یہ دلی ہے تمل ناڈو کی
یعنی اردو کا وطن ہی تو ہے وانمباڑی
بے بسی اور نراشاؤں کے اندھیاروں میں
ایک تابندہ کرن ہی تو ہے وانمباڑی

(مختار بدری)

بقول ڈاکٹر سید سجاد حسین صاحب ''تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ یہاں کی سرزمین علم و ہنر اور زبان و ادب کے لیے ابتدا ہی سے سازگار رہی ہے۔ یہاں ہر زمانے میں ممتاز عالم، قادرالکلام شاعر، اولیا و اصفیا اور علمی و ادبی شخصیات پیدا ہوئیں جن کی پرخلوص خدمات کا سلسلہ کافی پرانا اور قابل قدر ہے۔''

شہر وانمباڑی میں قدیم عصری تعلیمی ادارے، مساجد، دینی درس گاہیں، خانقاہیں اور فلاحی ادارے موجود ہیں۔ یہاں کی خواتین میں پردہ کا اہتمام زیادہ ہے، لڑکیوں کے لیے علاحدہ سے خصوصی اسکول، کالج، شادی خانوں میں الگ نشست گاہیں اور بطور خاص خواتین کی تفریح کے لیے ایک باغ بھی بنا گیا تھا۔ چند مشہور مساجد، مدارس اور تعلیمی وفلاحی ادارے یہ ہیں: مسجد نیلی کھیت (1835)، مدرسہ مفید عام (1873)، مدرسہ اعظم، قلعہ (1886)، مدرسہ معدن العلوم (1888)، محمدیہ ریڈنگ روم (دارالمطالعہ) (1894)، انجمن خیر خواہ عام مدرسہ نسواں (1904)، وانمباڑی مسلم ایجوکیشن سوسائٹی (1901) (اسی ادارہ کے تحت اسلامیہ اسکول، اسلامیہ کالج مرادانہ، اسلامیہ کالج زنانہ وغیرہ چلتے ہیں، اور NCPUL کے تحت قومی کتاب میلہ 2023 منعقد ہورہا ہے۔)، یتیم خانہ اہل اسلام (1907)، انجمن خدام الاسلام (1916)، اسلامیہ انڈسٹریل ٹریننگ سنٹر (1970)، اسلامی بیت المال (1972)، انجمن رفاہ ملت (1974)، اس کے بعد مدرسہ ناصر الاسلام، مدرسہ دارالحفاظ، مدرسہ احیاء العلوم، وفاق المکاتب، قائد ملت کمیٹی، مدرسہ قائد العلوم، خیالی مرکز وغیرہ قائم کیے گئے۔ ان کے علاوہ 1933 میں شہر وانمباڑی کے سرکاری اور امدادی آٹھ (8) اسکول قائم کیے گئے جہاں خالص اردو ذریعہ تعلیم ہے۔

افضل العلما ڈاکٹر تیکا شعیب عالم صاحب اپنی کتاب Arabic, Arwi and Persian in Sarandib and Tamil Nadu میں وانمباڑی کے قدیم اردو شاعر کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خطیب قادر بادشاہ (1853-1914) نے وانمباڑی میں اردو نعتیہ مشاعروں کے انعقاد کی روایت سن 1882 میں شروع کی اور انھوں نے ہی کمیونٹی کے لیے سب سے پہلا اسکول 1886 میں قائم کیا۔ خطیب قادر بادشاہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں نظمیں تحریر کرتے تھے۔ انھوں نے شعری تصانیف اور دو نثری کتابیں چھوڑی ہیں۔

شہر وانمباڑی کی ادبی خدمات کے مختلف گوشوں پر یہاں کے ادبا و شعرا کی تخلیقات پر مختلف موضوعات کے تحت جنوبی ہند کی قدیم 'مدراس یونیورسٹی' میں کئی تحقیقی مقالے لکھے جاچکے ہیں اور کئی تحقیقی کام چل رہے ہیں۔ کثیر التصانیف ادیب، بابائے اردو تمل ناڈو محترم علیم صبا نویدی نے دو ضخیم جلدوں میں 'تاریخ ادب اردو تمل ناڈو' شائع کی ہے جس میں شہر وانمباڑی کے قدیم و جدید شعرا و ادبا اور ان کی تمام تر تخلیقات کا تذکرہ کیا ہے۔

شہر وانمباڑی پہلے ضلع آرکاٹ اور ضلع ویلور کا حصہ رہا۔ لیکن پھر موجودہ ضلع ترپاتور میں شامل کیا گیا جو ریاستِ تامل ناڈو کے صدر مقام مدراس (چنئی) سے دو سو کیلومیٹر (200) اور ریاستِ کرناٹک کے صدر مقام بنگلور سے 178 کیلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ شہر ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں سے سڑک اور ریل کے ذریعے جڑا ہوا ہے۔ شہر سے ریلوے لائن اور نیشنل ہائی وے روڈ (نمبر 46) گزرتی ہیں۔ قریب ترین گھریلو ہوائی اڈہ ویلور ہے اور بین الاقوامی ہوائی اڈہ چنئی اور بنگلور کا ہے۔ گرچہ یہ ایک قصبہ ہی ہے جو تقریباً دس کیلو میٹر مربع پر پھیلا ہوا ہے۔ مشہور پہاڑی اسٹیشن 'ایلےگری' شہر سے تقریباً 20 کیلو میٹر کے فاصلے پر موجود ہے۔ وانمباڑی میں شرح خواندگی تقریباً 81 فیصد ہے۔ یہاں کی سرکاری زبان تمل ہے لیکن پورے شہر میں اردو زبان بولی جاتی ہے بلکہ یہاں کے غیر مسلم بھی اردو اچھی طرح بولتے اور سمجھتے ہیں۔

شہر وانمباڑی اطراف و اکناف میں پہاڑیوں اور جھاڑیوں سے گھرا ہوا ہری بھری کھیتیوں اور باغوں کا علاقہ ہے۔ یہ ایک زرخیز زمینی علاقہ ہے جہاں آس پاس چاول، مکئی، گیہوں، گنے کی کاشت کی جاتی ہے۔ آم اور خصوصاً ناریل کے درخت بکثرت پائے جاتے ہیں۔ قدیم سو سالہ قدیم پالار ندی اس شہر سے ہوکر گزرتی ہے۔ یہاں کی آب ہوا بہت خوش گوار ہے۔ مارچ تا مئی سب سے زیادہ گرم موسم ہوتا ہے۔ نومبر تا جنوری سرد موسم ہوتا ہے۔ جون تا ستمبر مغربی مانسون ہوتا ہے۔ شمال مشرقی مانسون اکتوبر تا دسمبر رہتا ہے۔

قابل دید مقامات میں ایشیا کی دوسری سب سے بڑی دوربین ''انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایسٹرو فزکس (Asia's second -largest telescope, Vainu Bappu Observatory of the Indian Institute of Astrophysics) وانمباڑی سے قریب 'کاولور' Kavalur میں واقع ہے۔

'سندرا ور راجا پیرول' اور 'تھیشو راز مندر زائرین کے لیے اس قصبے کے اہم مقامات میں شامل ہے۔ اس تاریخی قصبے میں قرون وسطیٰ کے ساتھ ساتھ جدید اسلامی طرز پر تعمیر کی گئی متعدد مساجد بھی موجود ہیں۔ حضرت مستان اولیاؒ کی درگاہ تمام مذاہب کے عقیدت مندوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔

اسی طرح یہاں ایلاگیری پہاڑی ہل اسٹیشن زائرین کو اپنے قیام کی دعوت دیتے ہیں جہاں کا موسم نہایت پرسکون اور صحت مند و ہوادار ہوتا ہے۔ ایلاگیری کا گارڈن اور لیک نہایت خوبصورت ہیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ پہاڑی پر مختلف ہوٹل اور رسورٹ بھی ہیں۔ پہاڑی علاقے کے قبائلی لوگ شہد اور دیگر دیہاتی چیزیں فروخت کرتے ہوئے اپنی طرف راغب کرتے ہیں۔ ایکسٹریم ایڈونچر، ایلاگیری نیچر پارک، ویلڈ زون وغیرہ قابل دید ہیں۔

ویسے شہر وانمباڑی چمڑے کی تجارت کے لیے بھی کافی مشہور ہے۔ وانمباڑی تمل ناڈو میں چمڑے کی بر آمدات کا ایک اہم مرکز ہے۔ یہاں چمڑے کی صنعت بہت زیادہ ہے۔ بنیادی کاروبار چمڑے کا ہے۔ چمڑے کے مختلف سامان جیسے: گارمنٹس، دستانے، موزے، جوتے، چپل، خواتین کے بیگ، سفری بیگ اور دیگر ملبوسات کو پوری دنیا میں برآمد کرکے ہندوستانی معیشت میں لاکھوں ڈالر کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ وانمباڑی میں تقریباً 150 ٹینریز (Tanneries) اور دو (2) واٹر ٹریٹمنٹ پلانٹس (Effluent water treating plants) موجود ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وانمباڑی کے پکوان، مٹھائیاں اور بالخصوص بریانی ہندوستان بھر میں مشہور ہے۔

شہر وانمباڑی کا نام یونانی میڈیسن کی دنیا میں بھی کافی مشہور ہے۔ ایک صدی سے زائد عرصہ سے طب نبوی اور طب یونانی کے ساتھ علاج و معالجہ کے حوالے سے یہاں کے اطبا بہت معروف ہیں۔ نسل در نسل یہ گرانقدر خدمات انجام دیتے آرہے ہیں، جن کی فہرست طویل ہے۔ حاذق دوراں ڈاکٹر حکیم اکبر کوثر صاحب کا تعلق بھی اسی شہر سے ہے۔ جناب اکبر زاہد صاحب کے بقول:

''وانمباڑی کا شمار ایک صدی سے طب یونانی کے اہم مرکز کے طور پر ہوتا رہا ہے۔ اس شہر نے ہمیشہ سے طب یونانی کے فروغ میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ اور آج بھی کرتا چلا آرہا ہے۔'' (عکس وانمباڑی، ص 76)

وانمباڑی کے عوام و خواص اپنے شہر سے بڑا پیار کرتے ہیں۔ یہاں دینی و عصری شعور نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ یہاں کے رئیس، تاجر حضرات اکثر کار خیر میں دامے درمے سخنے حصہ لیتے ہیں۔ خرچ کرنے کا جذبہ زیادہ ہے۔ بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں۔ علما، صلحا، ادبا و شعرا کے قدر دان ثابت ہوئے ہیں۔ احمد حسین مرحوم (متوفی 1948) نے کیا خوب کہا ہے۔

دنیا میں نہیں ثانی وانمباڑی ہر جا ہے ثنا خوانی وانمباڑی
یہ فوقیت اس کو ہے اللہ اللہ ہے حق سے نگہ بانی وانمباڑی

■

Dr.Mohd Tayyab Ali
Asst. Professor, Dept of Urdu
The New College, Chennai, #147, Peter's Road,
Royapettah, Chennai, 600014, Tamil Nadu
Email ID: tayyabali@thenewcollege.edu.in
Mob.: No.8870612461

سمیرا بانو

ترجمہ نگاری کے مراکز قائم کرنے کی ضرورت ہے

اردو رسائل میں عموماً ان ادبی مباحث اور مسائل پر زیادہ ارتکاز ہوتا ہے جن سے عوام یا معاشرے کا زیادہ گہرا رشتہ نہیں ہوتا۔ اردو زبان کے تعلق سے جو بھی گفتگو ہوتی ہے ان سے حقیقی صورتِ حال کا ادراک نہیں ہوپاتا۔ زبان کی زمینی صورت حال کیا ہے اس سے آگہی کے لیے ضروری ہے کہ تحریکات و رجحانات کے بجائے ان بنیادی مسائل پر توجہ دی جائے جن کا زبان کے فروغ اور تحفظ سے تعلق ہے۔ عموماً اردو کے حقیقی مسائل سے اجتناب کیا جاتا ہے اور یہ جاننے کی کوشش نہیں کی جاتی کہ کن کن علاقوں میں اردو کی حقیقی صورتِ حال کیا ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں سوال نامے کے ذریعے دراصل اردو زبان کے بنیادی مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ ملک کے مختلف علاقوں میں تعلیم، تدریس اور دیگر سطحوں پر اردو زبان کی صورت حال کیا ہے اور وہاں کس طرح کی دشواریاں اور مشکلات پیش آرہی ہیں۔ جب تک اردو زبان کے بنیادی مسائل پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا جائے گا تب تک اردو زبان کے تحفظ اور بقا کے لیے مربوط لائحہ عمل تیار کرنا مشکل ہوگا۔

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

ج: زبان ہماری وراثت، ہمارا اثاثہ اور ہماری شناخت ہے۔ زبان کی موت رفتہ رفتہ آتی ہے، جس کی کئی وجوہات ہیں۔ سب سے پہلی اور بڑی وجہ زبان کے متعلق اس کے بولنے والوں میں احساس کمتری ہے۔ جب ایک زبان کے بولنے والوں میں اپنی زبان کے تئیں احساس کمتری پیدا ہوتی ہے تو اس سے زبان کی بقا اثر انداز ہوتی ہے۔ زبان کے ساتھ تعصب برتنا بھی زبان کی موت کا سبب بن سکتا ہے۔ کسی بھی زبان میں روزگار کی عدم دستیابی بھی اس کے باشندوں میں عدم اعتمادی پیدا کرتی ہے اور وہ اپنی زبان سے لاتعلق ہوکر کسی دوسری زبان کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ یہ زبان کی موت کی ایک بڑی وجہ ہے۔ زبان کی تدریس میں قابل اور ماہر اساتذہ کی عدم دستیابی بھی زبان کی موت کی وجہ ہے۔ زبان سے منسلک ماہرین کی زبان کے متعلق بے فکری اور لاپرواہی بھی زبان کی موت کی وجہ ہوسکتی ہے۔ ایک اور وجہ زبان کو کسی مخصوص مذہب کے ساتھ جوڑ دینا بھی زبان کی موت کا سبب بن سکتی ہے۔

س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟

ج: زبان کو زندہ رکھنے کے لیے اس کی اہمیت سے نئی نسل کو واقف کرانا ضروری ہے کیونکہ زبان نہ صرف ہمارے درمیان رابطے کا کام کرتی ہے بلکہ زبان ہی ہماری تہذیب وثقافت اور ہمارے کلچر کی امانت دار ہوتی ہے۔ اگر ہم نے اس امر کو سمجھنے میں لاپرواہی برتی تو اس سے زبان کا وجود متاثر ہوسکتا ہے۔ اپنی زبان کو محفوظ و زندہ رکھنے کے لیے ہمیں اپنے گھروں میں دفتروں اور دوسرے مقامات پر اپنی زبان کے استعمال کو معمول بنانا ہوگا۔ زبان کو روزگار کے ساتھ جوڑنے سے بھی زندہ رکھا جاسکتا ہے۔ یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ جس زبان میں ہمیں روزگار ملے گا اس کی جانب ہم زیادہ متوجہ ہوں گے اور جس میں اس کی کمی ہوگی اس زبان کی طرف ہم بے فکر ہوں گے۔ لہٰذا کسی بھی زبان کو زندہ رکھنے کے لیے حکومت وقت کو اس زبان میں روزگار کے وسائل دستیاب رکھنے چاہیے۔ عصر حاضر میں زبان کو جدید سہولیات سے ہم آہنگ کرانا بھی زبان کو زندہ رکھنے میں معاون ثابت ہوسکتا ہے۔ وقت کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں اپنی زبان میں بچوں کی دلچسپی کے مطابق چھوٹی چھوٹی کہانیوں پر مبنی کارٹون پروگرام بنانے چاہیے، جو ٹی وی اور یوٹیوب پر نشر ہونے چاہیے جسے دیکھتے دیکھتے نئی نسل کے بچے محظوظ بھی ہو جائیں گے اور زبان بھی سیکھ جائیں گے جو زبان کی بقا کے لیے میرے خیال میں کارآمد ثابت ہوسکتا ہے، کیونکہ شاید ہی ہمارے گھروں میں کوئی بچہ ایسا ہوگا جو موبائل فون نہیں استعمال کرتا ہے اور اس پر کارٹون پروگرام نہیں دیکھتا ہوگا۔

س: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟

ج: زبان ہماری تہذیب وثقافت کا آئینہ ہے۔ زبان ہی سے ہم اپنے ماضی کی بازیافت کر پاتے ہیں۔ ہماری تہذب وثقافت ہمارا کلچر کیا ہے؟ اس کے متعلق ہماری رسائی زبان ہی کے ذریعے تو ممکن ہے۔ ہماری قدریں، ہمارے اسلاف کی عظمت وشان وشوکت جس پر ہم فخر کرتے ہیں اگر ہماری زبان میں ان کی حکایات درج نہ

ہوتیں تو ہم کیسے جان سکتے تھے۔کسی بھی قوم کی تاریخ و تہذیب اور کلچر وثقافت کی صحیح اور حقیقی عکاس اس کی زبان ہی ہوتی ہے۔ ہماری تہذیب و ثقافت ہی ہمارا اثاثہ ہوتا ہے جس کو ہم زبان کی صورت میں محفوظ کرتے ہیں۔گویا زبان اور تہذیب وثقافت ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں اور دونوں کے درمیان رشتہ گہرا، اٹوٹ اور مستحکم ومربوط ہے۔

س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

ج: جی بالکل!

ظاہری بات ہے ہم جس زبان میں سوچتے ہیں محسوس کرتے ہیں تصور کرتے ہیں اور پھر اظہار کرتے ہیں اگر وہی زبان زوال کا شکار ہورہی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ انسانی وراثت بھی خطرے میں ہے۔ہمیں اپنے ورثے پر فخر ہے الحمد اللہ لیکن ساتھ ہی ہماری ذمے داری بھی ہے کی ہماری آنے والی نسلیں بھی اس پر فخر کریں لیکن یہ تبھی ممکن ہے جب آج ہم اپنی زبان کی ترقی اور بقا کے لیے کوشاں اور سرگرم عمل رہیں۔اس کی ترویج واشاعت میں اپنی حیثیت سے بڑھ کر حصہ لیں۔ورنہ بعض اردو داں حضرات ایسے بھی دیکھے ہیں جو اردو کی بدولت لاکھوں کماتے ہیں لیکن پانچ روپے کا اخبار اور تیس روپے کا رسالہ نہیں خریدتے ہیں۔

س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

ج: زبان ہی کی بدولت ہم مختلف علوم وفنون کو سمجھتے ہیں۔یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جس زبان میں شرح خواندگی اور مختلف علوم وفنون سے متعلق مواد جتنا زیادہ دستیاب ہوگا اتنی وہ زبان ترقی کرے گی اور جس میں جتنا کم ہوگا وہ پیچھے رہے گی۔یہ بہت ہی افسوس کا مقام ہے کہ ہماری اردو زبان میں اس جانب بہت ہی کم توجہ دی جاتی ہے۔اس میں سائنسی اور سماجی علوم سے متعلق مضامین پر نہیں کے برابر مواد دستیاب ہے۔ظاہر ہے جب مواد مہیا نہیں تو اگر طلبا اردو زبان کے ذریعے ان مضامین کو پڑھنا بھی چاہیں تو نہیں پڑھ سکتے ہیں۔جس سے زبان کی بقا پر بہت زیادہ منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ہندی والے اس جانب متوجہ ومتفکر ہیں جس کے نتائج ہم سب کے سامنے ہیں۔

س: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

ج: بے توجہی اور تعصب اردو زبان کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ایک خطرہ اردو کے وہ نام نہاد پروفیسر صاحبان ہیں جن کے منہ سے کبھی اردو کے حق میں یا اردو کے مستقبل کے حوالے سے ایک جملہ بھی نہیں سنا گیا۔ اردو اخبارات کی اشاعت کی کمی ایک اور خطرہ ہے۔جس کا ذمے دار میں اپنے آپ کے ساتھ ان ہزاروں لاکھوں پڑھے لکھے اردو میں سند یافتہ افراد کو ٹھہراتی ہوں جو ایک اردو اخبار نہیں خرید رہے ہیں۔اس حوالے سے ایک واقعہ سنا ہے کہ ایک عالم کے گھر میں ایک مراٹھی عورت کام کرنے آتی تھی عالم صاحب اس کو ناخواندہ سمجھتے تھے ایک دن وہ کام پر ایک مراٹھی اخبار ساتھ لائی تھی عالم صاحب نے دریافت کرتے ہوئے پوچھا کیا آپ کو پڑھنا آتا ہے تو اس عورت نے جواب دیا نہیں لیکن یہ ہماری قوم کا اخبار ہے اس لیے میں روز ایک اخبار خریدتی ہوں اس سے ہماری زبان زندہ رہے گی۔ یہ سن کر عالم صاحب کو تعجب ہوا اور سبق بھی ملا۔مراد یہ کہ ناخواندہ اپنی زبان کے تحفظ و بقا کے لیے متفکر ہیں اس کے برعکس ہماری زبان میں پڑھے لکھے بھی غافل اور لاپرواہ ہیں۔اردو ٹی وی چینلوں کی عدم موجودگی بھی اردو کی بقا میں کسی خطرے سے کم نہیں ہے۔اردو میں روزگار کے مواقع نہیں کے برابر ہیں ایسے میں نئی نسل کو اس کی جانب راغب کرانا بہت مشکل کام ہے جو اردو کے مستقبل کے لیے بڑا خطرہ ہے۔ بیشتر اُردو مشاعروں میں منتظمین میرے خیال سے احساس کمتری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشتہارات اور سائن بوڑز اردو کے بجائے ہندی یا انگریزی زبان میں لکھواتے ہیں جو اردو کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی ہے۔

س: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہورہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟

ج: یہ کہتے ہوئے بہت دکھ ہوتا ہے کہ اردو کا چہرہ مسخ ہورہا ہے۔اس کی شکل بھی متاثر ہورہی ہے۔ میں کشمیر کے جس علاقے میں رہتی ہوں یہاں آج سے قریب دس بیس برس پہلے اردو زبان میں سرکاری وغیر سرکاری دفاتر پر اردو سائن بورڈ لگے ہوئے ہوتے تھے۔لیکن آج اس کی جگہ انگریزی زبان کے سائن بوڑ بازاروں میں دکانوں سرکاری اور غیر سرکاری دفاتر پر دیکھنے کو ملتے ہیں۔اور جو اردو میں لکھے ہوئے بھی ملتے ہیں وہ اردو رسم الخط میں نہیں بلکہ رومن رسم الخط ہوتے ہیں۔جس سے زبان کی شکل وصورت مجروح ہوتی ہے۔اتنا ہی نہیں صورت حال اتنی افسوس ناک ہے کہ اسکول اور کالج میں بعض طلبا اردو مضمون پڑھنے کے باوجود لکھتے وقت رومن رسم الخط کا استعمال کرتے ہیں۔جو اردو زبان کے رسم الخط اور اس کے مستقبل کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔جس کے متعلق ماہرین ومفکرین زبان اردو کو قبل از وقت ہی ٹھوس اقدامات کرنے چاہیے۔ ورنہ اگر صورت یہی رہی تو ہم اردو زبان کا مسخ شدہ چہرہ دیکھنے سے زیادہ دور نہیں ہیں۔

س: اُردو کا مستقبل کیا ہے؟

ج: : اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو کا ماضی شاندار اور قابل رشک رہا ہے۔جس پر ہمیں فخر ہے۔لیکن جہاں تک اردو کے مستقبل کا تعلق ہے اس حوالے سے یہ کہتے ہوئے کلیجا منہ کو آتا ہے کہ اس زبان کا مستقبل تاریکی کی جانب گامزن ہے۔شاید آپ میری بات سے اتفاق نہیں کریں گے لیکن اردو کے مستقبل کو تصور میں رکھتے ہوئے مجھے مایوسی ہی ہوتی ہے۔ میں ایک معلّمہ ہوں آج سے دس برس قبل اسکولوں اور کالجوں میں اردو مضمون پڑھنے والے طلبا کا جو رجحان تھا آج اس سے آدھا بھی نہیں ہے۔ جب ہماری نئی نسل موجودہ دور میں ہی اس زبان سے دور ہورہی ہے تو مستقبل میں ہم کیا توقع رکھ سکتے ہیں۔

اپنی زبان کو محفوظ و زندہ رکھنے کے لیے ہمیں اپنے گھروں میں دفتروں اور دوسرے مقامات پر اپنی زبان کے استعمال کو معمول بنانا ہوگا۔ زبان کو روزگار کے ساتھ جوڑنے سے بھی زندہ رکھا جاسکتا ہے۔یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ جس زبان میں ہمیں روزگار ملے گا اس کی جانب ہم زیادہ متوجہ ہوں گے اور جس میں اس کی کمی ہوگی اس زبان کی طرف ہم بے فکر ہوں گے۔لھٰذا کسی بھی زبان کو زندہ رکھنے کے لیے حکومت وقت کو اس زبان میں روزگار کے وسائل دستیاب رکھنے چاھیے۔عصر حاضر میں زبان کو جدید سھولیات سے ھم آھنگ کرانا بھی زبان کو زندہ رکھنے میں معاون ثابت ھوسکتا ھے۔

س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہورہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟

ج: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہورہا ہے اس کو روکنے کے لیے زبان کے خیر خواہوں کو آگے آنا ہوگا۔اسکولوں اور دوسرے تعلیمی اداروں میں ماہر اساتذہ کے تعین کو لازمی بنا دینا چاہیے۔دیکھا یہ گیا ہے بہت سارے ادارے ایسے ہیں جہاں صرف اردو مضمون پڑھانے کے لیے کسی کو بھی

مامور کیا جاتا ہے۔ اب آپ ہی بتائیں جو خود زبان کی بنیادی باتوں سے نابلد ہو اس سے ہم زبان کی ترویج و اشاعت کی کیا توقع کر سکتے ہیں۔ زبان کے ماہرین کو قومی ٹیلی ویژن چینلوں پر مدعو کیا جانا چاہیے جو زبان کی اہمیت اور اس کی بقا کے لیے اپنے مفید مشوروں سے قوم کو باخبر کریں۔ اخبارات کے مدیران کو بھی اپنی ذمے داری احسن طریقے سے نبھانی چاہیے بعض ملکی اور علاقائی اخبارت میں املا کی ایسی غلطیاں دیکھنے کو ملتیں ہیں جو تشویش ناک ہے۔ مثال کے طور پر تقدس کو تکدس، عافیت کو آفیت، تقدیر کو تکدیر، تصویر کو تسویر، اتفاق کو اتفاک، نصیب کو نسیب وغیرہ اس طرح کا املا جب ایک سنجیدہ قاری دیکھتا ہے تو بہت افسوس اور زبان کے تئیں مایوس ہوتا ہے۔ اخبارات اور سوشل میڈیا کی پہنچ ایک کثیر آبادی تک ہوتی ہے لہٰذا اس سے منسلک اردو داں حضرات کو اس بات کی جانب خصوصی توجہ دینی چاہیے تحریری زبان میں املا کے لیے سنجیدہ اور ماہر زبان کا ہی تقرر عمل میں لایا جانا چاہیے۔ اگر کسی بھی اخبار یا سوشل میڈیا کے کسی بھی پلیٹ فارم پر اس طرح کی زبان استعمال ہوتی ہوئی نظر آئے تو ایک ذمے دار کے بطور اس متعلقہ اخبار کے مدیر کو مطلع کیا جانا ضروری ہے تاکہ وہ آئندہ اس بات کا خیال رکھے۔ اسکولوں اور کالجوں میں اردو زبان کے املا اور تلفظ پر وقتاً فوقتاً سمینار اور ورکشاپوں کا انعقاد کیا جانا چاہیے۔ جس سے میرے خیال میں زبان کو بہت فائدہ ہو سکتا ہے۔

س: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

ج: جی ہاں! یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ آئے دن بازار میں نئی کتابیں دیکھنے کو ملتی ہیں جن میں ننانوے فی صد صرف اور صرف ادب کی زلف میں کنگھی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ لیکن ادب جس زبان میں تخلیق ہو رہا ہے اس کے متعلق اس کی ترقی و بقا کے بارے میں کتابیں خال خال ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ آج کے اس دور میں ہر کسی کو مصنف بننے کا شوق ہے مفکر بننا پسند نہیں۔ مصنف بننا آسان ہے کیوں کہ کسی بھی موضوع سے متعلق چند کتابیں اور مضامین پڑھیے ان میں کچھ ترمیم و اضافہ کیجیے اور اپنے نام سے چھاپیے تو بن گئے آپ مصنف۔ لیکن مفکر بننے کے لیے تدبر و تفکر اور مطالعہ لازمی ہے مسائل کی تہہ تک پہنچنا از حد ضروری ہے جس کے لیے کوئی تیار نہیں ہے۔ جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ جہاں ہزاروں کی تعداد میں ملک بھر میں ادب سے متعلق کتابیں اشاعت پذیر ہوتی ہیں وہاں خالص زبان سے منسلک ایک یا دو کتابیں ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔

س: کیا کلاسکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

ج: کلاسکیت، جدیدیت، ترقی پسندیت، مابعد جدیدیت پر گفتگو سے اردو زبان کا براہ راست کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا ہے۔ اس سے ادب کے طلاب مستفید ہو سکتے ہیں جو اردو ادب میں یا تو ایم اے یا پھر ایم فل یا پی ایچ ڈی کی سند حاصل کر رہے ہوں۔ کیونکہ ان تحریکات اور رجحانات کے اثرات سے اردو ادب میں کیا کچھ تبدیلیاں رونما ہوئیں وہ ایک ادب کے طالب علم کے لیے جاننا لازمی ہے۔ لیکن جہاں تک بات ہے زبان کے فائدے کی اس بحث سے زبان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا ہے۔

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

ج: کشمیر میں شاید ہی کوئی اسکول ایسا ہوگا جہاں اردو ایک لازمی مضمون کے طور پر دسویں جماعت تک نہ پڑھایا جاتا ہوگا۔ جہاں تک بات خالص اردو ذریعہ تعلیم اسکولوں کی ہے ایسا ہمارے یہاں کوئی اسکول نہیں ہے۔ اگر چہ میں نے بچپن میں پانچویں جماعت تک ایک سرکاری اسکول میں اردو میڈیم میں ہی پڑھا تھا لیکن سنہ 2022 سے یہاں سبھی سرکاری وغیر سرکاری اسکولوں میں اردو کی جگہ انگریزی زبان کو ہی ذریعہ تعلیم بنایا گیا۔ اس وقت سے سبھی اسکولوں میں انگریزی زبان میں ہی پڑھایا جاتا ہے۔ چونکہ اردو مضمون کو پڑھایا تو جاتا ہے لیکن اس کے لیے خاطر خواہ اقدامات نہیں کیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اردو زبان کے لیے اساتذہ کا تقرر نہیں کے برابر ہے۔ یہاں سائنس کے اساتذہ بھی بعض اسکولوں میں گلو خلاصی کے لیے اردو کو آسان سمجھ کر پڑھانے کی ذمے داری لیتے ہیں۔ جس سے اردو زبان کے مستقبل پر برا اثر پڑ رہا ہے۔

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

ج: ہمارے علاقے میں تین لائبریریاں ہیں۔ یہ بات نہایت ہی افسوس کے ساتھ کہنی پڑ رہی ہے کہ میں جس کالج میں پڑھا رہی ہوں وہاں کوئی بھی اردو اخبار نہیں آرہا ہے رسائل وجرائد کی تو بات ہی نہیں۔ یہی صورت حال دیگر لائبریریوں کا ہے جہاں گنے چنے اردو اخبارات تو آتے ہیں لیکن پابندی کے ساتھ نہیں۔ جہاں تک رسائل و جرائد کا تعلق ہے مقامی سطح پر نہیں کے برابر شائع ہوتے ہیں۔ اب جو شائع بھی ہوتے ہیں ان کی کاپیاں بہت محدود ہوتی ہیں۔ لیکن ملکی سطح پر شائع ہونے والے جرائد میں ''اردو دنیا'' اور'' آج کل'' بعض لائبریریوں میں نظر آتے ہیں۔

س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمین ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟

ج: ہمارے علاقے میں کثیر اللسانی ادبی انجمنیں دو تین ہیں۔ جو اردو، کشمیری اور انگریزی ادب کی ترقی و ترویج کے لیے کام کر رہی ہیں۔ یہ انجمنیں تقریباً ایک ہی نہج پر کام کر رہی ہیں۔ مشاعروں کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ افسانوی نشستیں کرائی جاتی ہیں۔ کبھی کبھی کسی موضوع پر سمینار بھی کراتی ہیں۔ اس کے علاوہ مقامی قلم کاروں کی نئی شائع شدہ کتابوں کی تقریب رسم اجرا بھی کرائی جاتی ہیں۔

س: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

ج: ہمارے علاقے کی اردو سے جڑی ادبی شخصیات کی خدمات کا اعتراف اگر چہ مقامی سطح پر ہوا ہے لیکن قومی سطح کے ناقدین اور محققین نے ان کی طرف اتنی توجہ نہیں دی ہے جس کے وہ مستحق ہیں۔

س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟

ج: جیسا کہ اس سے قبل بھی عرض کر چکی ہوں کہ میں اردو زبان و ادب کی طالبہ اور معلمہ بھی ہوں۔ کالج سطح پر اردو پڑھنے والے طلبا کی تعداد میں ہر برس کے ساتھ کمی واقع ہو رہی ہے۔ اس کے پیش نظر میں کالج میں داخلہ لیتے وقت داخلہ کمیٹی میں بیٹھتی ہوں اور طلبا کو اردو مضمون انتخاب کرنے کے لیے راغب کر رہی ہوں۔ الحمدللہ اس کے اچھے نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔ اگر اسی طرح دیگر اردو اساتذہ بھی داخلے کے وقت مضامین کا انتخاب کرتے وقت بچوں کی رہنمائی کریں گے اس سے خاطر خواہ نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر اپنے گھر کے بچوں کو اردو پڑھاتی ہوں۔ اردو سے متعلق مختلف موضوعات پر مضامین لکھتی ہوں۔

س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

ج: اردو کے فروغ کے لیے میرا پہلا مشورہ یہی ہے کہ اپنی جگہ تمام اردو والے اپنی اپنی ذمے داری محسوس کریں اور پھر بساط بھر نبھائیں۔ اردو اخبارات پڑھنے کا معمول بنائیں۔ آج کا دور ٹیکنالوجی کا دور ہے جس سے زبانوں کی ترویج واشاعت میں برق رفتار تبدیلیاں رونما ہو رہی

ہیں۔اردو اسکولوں میں کمپیوٹر کی تعلیم کو لازمی قرار دینا چاہیے۔اردو مضمون پڑھنے والے تمام طلبا کے لیے اردو سافٹ ویئر 'ان پیج اردو' کا استعمال ضروری ہونا چاہیے۔ اردو مضمون میں سند یافتہ اساتذہ کی تقرری ہر اردو بستی میں عمل میں لائی جائے۔قومی سطح پر اردو زبان کے ٹی وی چینلز کا اجرا کیا جانا چاہیے۔ملک کے طول وعرض میں جہاں جہاں اردو اکثریت والے علاقے ہوں وہاں جدید طرز کے اردو میڈیم اسکول قائم کیے جانے چاہیے۔اردو ایک شیریں زبان ہے جس کا اعتراف اردو والوں کے علاوہ غیر اردو داں حضرات بھی کرتے ہیں ان کی دلچسپی کے لیے علاقائی اور قومی سطح کے شاندار مشاعروں کا انعقاد کیا جانا چاہیے۔اپنے موبائل فون میں اردو سافٹ ویئر استعمال کرنے کو معمول بنائیں۔گھر میں دفتر میں بازار میں جہاں لوگ اردو سمجھ سکتے ہیں وہاں ہمیشہ اردو زبان کو بروئے کار لانا چاہیے۔اپنی نئی نسل کو اردو کی جانب متوجہ کریں۔اسکولوں اور کالجوں میں غزل گوئی اور بیت بازی کے پروگرام کرانے چاہیے۔اردو کے مشہور ڈراموں کو اسکول اور کالج کے بچوں کے لیے اسٹیج پر کھیلا جائے۔بلکہ طلبا کو ہی مختلف کرداروں کو نبھانے کا کام سونپا جانا چاہیے۔املا اور تلفظ کی اصلاح کے ریڈیو اور قومی ٹیلی ویژن چینلوں پر ماہر زبان کو مدعو کیا جانا چاہیے۔نومشق شعرا اور دیگر قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ہو سکے تو بعض تنگ دست ادیبوں کو اپنی نگارشات کی اشاعت کے لیے مالی مدد بھی کرنی چاہیے۔ ہمارے عہد میں وحیدالدین سلیم جیسے مدبر اور مفکر اردو نظر نہیں آتے ہیں۔ جو ہماری زبان کی وسعت اور ہمہ گیری کے لیے نئی نئی اصطلاحات وضع کرنے کا بیڑا اٹھائیں۔آئے دن ہماری زبان میں دوسری زبانوں کے الفاظ من وعن استعمال ہوتے ہیں جن کا متبادل تیار یا تلاش کرنے کی ہم چنداں ضرورت محسوس نہیں کرتے ہیں۔ہمیں اس کی جانب سنجیدگی سے سوچنا چاہیے قومی سطح پر اس کے لیے کوئی ادارہ قائم کرنا چاہیے جہاں نئے الفاظ اور اصطلاحات وضع کرنے کے لیے ماہرین زبان کا تقرر کرنا چاہیے۔

س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟

ج: بغیر کسی تعصب اور جانب داری کے مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ میری اردو سے دلچسپی کی ایک اہم وجہ اس کا خوبصورت رسم الخط ہے۔یہ بہت ہی دکھ کی بات ہے کہ بعض ماہرین زبان اردو بھی کہتے ہیں کہ اردو کی بقا کے لیے اس کا رسم الخط بدل دینا چاہیے۔یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی ایک زبان کی بقا اور ترقی کے لیے رسم الخط کی تبدیلی سے کیا فرق پڑ سکتا ہے۔چینی زبان کا رسم الخط ظاہری طور پر مجھے بہت ہی مشکل نظر آتا ہے۔لیکن آج تک کسی سے یہ نہیں سنا گیا کہ اس کا رسم الخط بدل دینا چاہیے۔ اردو کے رسم الخط میں جو دلکشی ہے وہ بہت ہی کم زبانوں میں نظر آتی ہے۔آج کل سوشل میڈیا پر استعمال ہونے والی اردو زبان سے دل افسردہ ہوتا ہے۔وٹس ایپ اور فیس بک پر اکثر صارفین اردو زبان سے منسلک ہونے کے باوجود انگریزی رسم الخط میں اردو لکھتے ہیں جو میری نظر میں اردو کے خیر خواہ نہیں۔

س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟

ج: ہندوستان ایک کثیر اللسان ملک ہے۔یہاں کشمیر سے لے کر کنیا کماری تک متعدد زبانیں اور بولیاں رائج ہیں۔لیکن اردو کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس کا استعمال تامل ناڈو میں بھی ہوتا ہے اور وادی کشمیر میں بھی ہوتا ہے۔مطلب یہ کہ ہند کا شاید ہی کوئی علاقہ ایسا ہوگا جہاں کم از کم اردو زبان کے بولنے یا سمجھنے والے موجود ہیں۔ ایک دفعہ راحت اندوری صاحب سے کہتے سنا کہ''میں اگر چہ اردو زبان کا شاعر ہوں لیکن میرے مداحوں میں اکثریت کی تعداد ایسے افراد پر مشتمل ہے جو اردو رسم الخط سے ناواقف ہیں لیکن اردو کی شیرینی اور سحر انگیزی سے بے انتہا متاثر ہیں۔''یہاں یہ سبق ملتا ہے کہ دوسری علاقائی زبانوں کے باشندے اردو زبان سے لطف اندوز ہوتے ہیں ان کی دلچسپی کے لیے مشاعروں اور دوسری اردو ادبی محفلوں کا انعقاد کیا جانا چاہیے۔اردو کے خیر خواہوں کو چاہیے کہ اپنے اپنے علاقوں میں ترجمہ نگاری کے مراکز قائم کریں جہاں مقامی زبان وادب کا مواد اردو میں اور اردو زبان وادب کا مواد متعلقہ علاقے کی زبان میں ترجمہ کیا جاسکے۔اس سے دونوں زبانوں کا فائدہ ہوسکتا ہے۔

س: آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا، پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

ج: جی ہاں میں اور میرے شوہر دونوں اردو زبان وادب کی درس وتدریس سے وابستہ ہیں۔کالج میں اردو مضمون پڑھا رہے ہیں۔اس کے علاوہ ہمارے گھر کے سبھی افراد اردو زبان سے واقف ہیں۔الحمد اللہ وہ نہ صرف اردو بولنا اور پڑھنا جانتے ہیں بلکہ لکھنا بھی جانتے ہیں۔

س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

ج: جی ہاں بالکل رہے گی۔

س: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

ج: میرے علاقے میں پانچ کالجز ہیں۔الحمدللہ ہر کالج میں اردو زبان وادب کی درس وتدریس کا معقول اور تشفی بخش انتظام ہے۔کشمیر میں شاید ہی کوئی کالج ایسا ہوگا جہاں اردو پڑھنے والے طلبا موجود نہ ہوں۔ہمارے علاقے کے سبھی کالجز میں اردو مضمون پڑھنے والے طالب علم کہیں کم اور کہیں زیادہ تعداد میں موجود ہیں۔

س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟

ج: غیر سرکاری تنظیموں سے اردو زبان کے فروغ میں مختلف طریقوں سے مدد لی جاسکتی ہے۔ایسے ادارے اگر چاہیں تو ملکی سطح کے اردو پڑھنے والے طلبا کو وظیفہ فراہم کر سکتے ہیں۔قومی سطح کے مقابلہ جاتی امتحانات کی تیاری کے لیے اردو میڈیم اور مدارس سے پڑھنے والے طلبا کے لیے کوچنگ کا انتظام کرا سکتے ہیں۔اردو اکثریت آبادی والے علاقوں میں اردو کتاب میلوں کا انصرام کرا سکتے ہیں۔ مدرسوں اور اردو میڈیم اسکولوں میں پڑھانے والے اساتذہ کی حوصلہ افزائی کے لیے کبھی کبھی یوم اساتذہ کے موقع پر انھیں انعامات واعزازت سے نواز سکتے ہیں۔ٹی وی اور سوشل میڈیا پر بعض ایسے پروگراموں کو پیش کیا جائے جہاں اردو کی نامور شخصیات کو مدعو کیا جائے جو اردو کی تاریخ وحال و مستقبل کے حوالے سے اپنے مشوروں سے نوازا کریں گے۔اردو کیلی گرافی کے کورسس کرانے کے لیے ادارے قائم کر سکتے ہیں۔کمپیوٹر اور دیگر جدید ذرائع میں اردو کے استعمال کے حوالے سے کام کر سکتے ہیں۔ اخبارات اور ٹی۔وی چینلز شروع کر سکتے ہیں۔اردو زبان پر مشتمل کہانیوں کو کارٹون پروگراموں کی صورت میں بچوں کی دلچسپی کے پیش نظر نشر کر سکتے ہیں۔ ملک کے مختلف اردو اور غیر اردو حلقوں میں نامور اردو شعرا کو مدعو کر کے مشاعروں کا اہتمام کر سکتے ہیں۔ترجمہ کاری کے کورسس متعارف کرا سکتے ہیں۔جس سے روزگار کے مواقع بھی فراہم ہوسکتے ہیں۔

س: سینٹرل اسکولوں اور نو ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ج: جی ہاں! بالکل ہے۔

■

Dr. Sameera Banoo
Lecturer Department Of Urdu
GDC Kulgam Kashmir.
71,Ganaie Mohallah Samboora, Pampore
Distt: Pulwama - 192304 (J&K)
Mob.: 9682379561
Email :drgulsameera@gmail.com

تابش مہدی

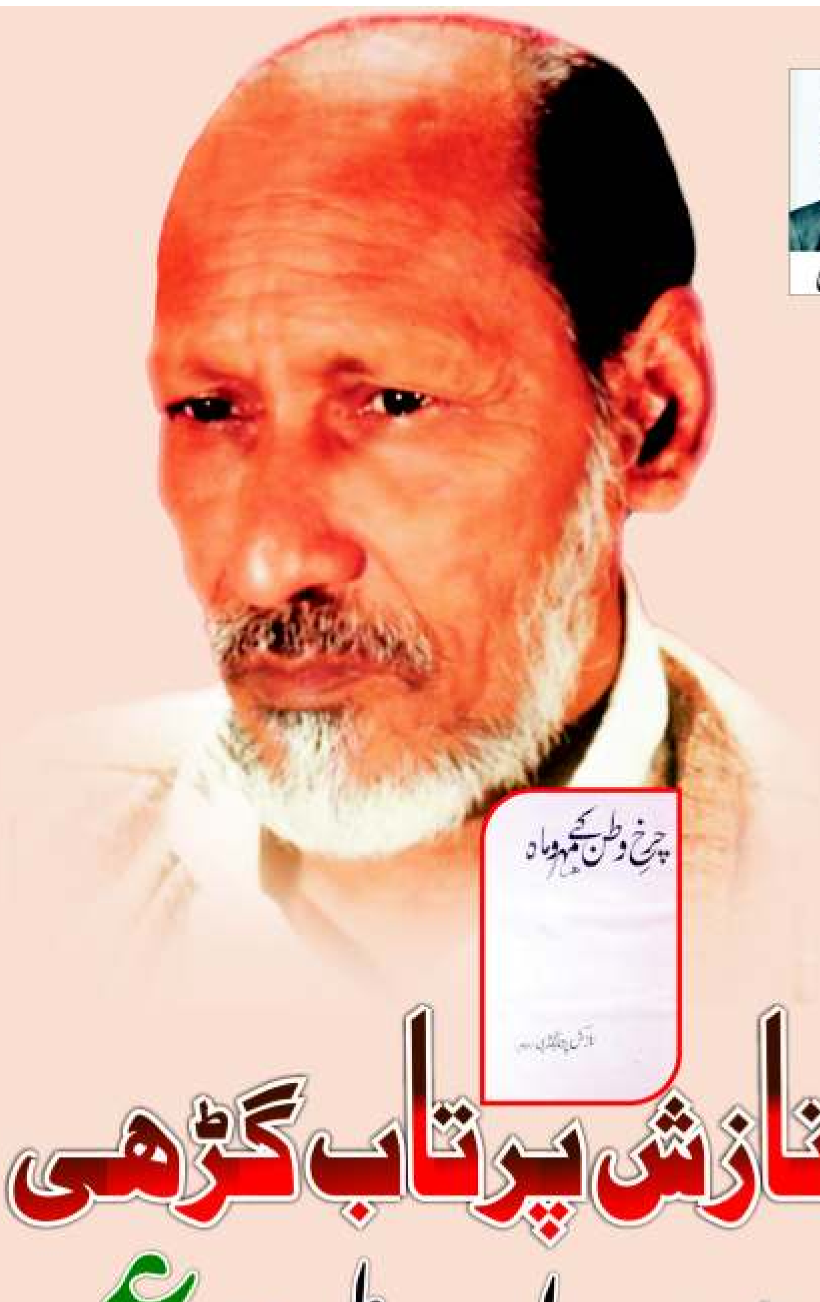

نازش پرتاب گڑھی

انسانیت اور حب وطن کا شاعر

حضرت نازش پرتاب گڑھی (1924-1984) گزشتہ صدی کے عظیم، کہنہ مشق، مقبول ترین اور استاذ شاعر تھے۔ اُنھوں نے اپنی غیر معمولی وغیر مشروط مشق و مزاولت سے اردو دنیا کے ایک بڑے حصے کو اپنی شاعری کی طرف متوجہ کرلیا تھا۔ وہ ان خوش نصیب وکامیاب شعرا میں تھے، جنھوں نے اپنی شاعری سے مشاعروں کے اہل نظر سامعین کو بھی متاثر کیا اور موقر وقابل ذکر جرائد و رسائل کے قارئین کو بھی۔ وہ جتنی کثرت سے جرائد ورسائل میں چھپتے تھے، اتنی ہی کثرت سے چھوٹے بڑے اور باوقار مشاعروں میں بھی مدعو کیے جاتے تھے۔ وہ جس طرح اپنی معیاری شاعری، گہری سوچ اور فکری وفنی بلندی کے لیے مشہور تھے اور ارباب علم و دانش کے حلقوں میں عزت وتوقیر سے دیکھے جاتے تھے، اسی طرح وہ اپنی خاندانی شرافت ونجابت اور سادگی و بے ریائی کے لیے بھی جانے پہچانے جاتے تھے۔ ہر مذہب وملت کے لوگ انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، شیعہ، سنی غرض کہ انسانی برادری کے ہر طبقے میں انھیں عزت حاصل تھی۔ سب لوگ انھیں ایک بڑے شاعر کی حیثیت سے بھی اہمیت دیتے تھے اور ایک اچھے، بھلے اور بے ضرر انسان کی حیثیت سے بھی۔ ہندستان خصوصاً سرزمین اودھ کا ہر ہندو ومسلمان انھیں فخر واعتبار کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ کسی نے فخر پرتاب گڑھ کہا تو کسی نے 'نازش اودھ'۔

نازش پرتاب گڑھی 14 جولائی 1924 کو شہر پرتاب گڑھ سے پچھم کی جانب تقریباً آٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر سٹی پرتاب گڑھ کے نام سے مشہور ایک قصبے میں وہاں کے ایک معزز، متمول اور زمین دار گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ آج ہم جسے پرتاب گڑھ کہتے ہیں، اسے ان دنوں بیلا کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بل کہ آج بھی قرب و مضافات میں اُسے بیلا پرتاب گڑھ ہی کہا جاتا ہے۔ مطلقاً پرتاب گڑھ کے نام سے وہی قصبہ جانا جاتا تھا، جسے ہم اب سٹی پرتاب گڑھ کہتے ہیں اور جو حضرت نازش پرتاب گڑھی کا مولد ہے۔

نازش صاحب نے اپنے وطن ہی میں تعلیم وتربیت پائی۔ ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد بہ وجوہ یہ سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا۔ وہ طبعی وفطری طور پر شاعر تھے۔ ان کے خاندان اور اعزہ واقربا میں بھی کسی نہ کسی درجے میں علم و ادب کا ذوق پایا جاتا تھا۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور خلیفہ اور اپنے زمانے کے استاد شاعر محترم مولوی نجم احسن نگرامی ثم پرتاب گڑھی ان کے سگے پھوپھا تھے، جو تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔ وہیں وفات پائی۔ خاندان کے مخصوص ماحول نے ان کے ذوق شعری کو پروان چڑھایا اور وہ بہت کم عمری سے شعر کہنے لگے۔ ان کا اصل نام تو شیخ محمد احمد تھا، لیکن اپنے تخلص یا قلمی نام نازش پرتاب گڑھی کے نام سے پوری دنیا میں وہ جانے گئے۔

نازش پرتاب گڑھی شاعری میں فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کے شعری وفنی جانشین علامہ سیماب اکبر آبادی کے شاگرد تھے۔ اپنی اس نسبت پر وہ ہمیشہ فخر کرتے تھے۔ جب استاذ نے انھیں فارغ الاصلاح کردیا تو استاذ کے ایما سے انھوں نے چھتر پور میں ادارۂ اصلاح ومشورہ کے نام سے ایک ادبی انجمن قائم کی اور اس کے نظام کے تحت انھوں نے بھی نومشق اور مبتدی شعرا کو اصلاح دینی شروع کردی۔ کافی دنوں تک یہ سلسلہ رہا۔ اپنے زمانے کے مشہور شاعر محسن زیدی، مشتاق پردیسی، حبیب مغموم اور رامش پرتاب گڑھی ان کے مشہور تلامذہ میں ہیں۔ ہمارے زمانے کے مقبول ترین اور بزرگ سخن ور حضرت مہدی پرتاب گڑھی گو کہ ان کے باضابطہ شاگرد نہیں ہیں، لیکن انھوں نے بھی ان سے استفادہ کیا ہے۔ اپنے پرتاب گڑھ کے دوران قیام میں میں نے بعد نماز عصر ہمیشہ انھیں ان کے پاس پرتاب گڑھ ریلوے اسٹیشن

کے پلیٹ فارم اے۔ ایچ وھیلر بک اسٹال پر بیٹھا دیکھا ہے۔ وہ انھیں وہی عزت وتوقیر دیتے تھے، جو کسی استاذ کو دینی چاہیے۔

نازش پرتاب گڑھی نے ہمیشہ اپنے محترم استاد حضرت سیماب اکبرآبادی کی عظمت وبلندی کا اعتراف کیا، ان کے دیے ہوئے مشوروں اور ہدایات کا احترام کیا اور انھیں پیشِ نظر رکھا۔ محترم استاذ کے ادب واحترام کا عالم یہ تھا کہ انھوں نے کبھی استاذ کی کسی زمین میں غزل نہیں کہی۔ سیماب صاحب کے مصرعوں پر منعقد ہونے والے قومی یا مقامی طرحی مشاعروں میں شرکت سے انکار کردیتے تھے۔

نازش صاحب کو ہمیشہ اپنے وطنی لاحقے پر فخر رہا۔ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ پرتاب گڑھ فلاں وفلاں یا فلاں زمین دار ورئیس کی وجہ سے نہیں مشہور ہوا، یہ بندۂ ناچیز نازش کی وجہ سے پوری دنیا میں مشہور ہے۔ ان کا بہت مشہور شعر ہے۔

وطن کے ذی حشم لوگوں سے اتنا بھی نہ ہو پایا
اُجالا کم سے کم پرتاب گڑھ کا نام ہی میں نے

ایک موقعے پر انھوں نے اہلِ وطن سے گلہ کرتے ہوئے کہا ہے۔

نازش دیار غیر میں مشہور ہوگیا
پرتاب گڑھ کے لوگ اُسے جانتے نہیں

یہ شعر بھی اسی قبیل کا ہے۔

نازش! اِس شہر میں میری کوئی وقعت ہی نہیں
جس کو جانا گیا دنیا میں مرے نام کے ساتھ

اِس سلسلے کا یہ تغزل سے بھرپور شعر بھی سنتے چلیے۔

شہروں سے تو ہے شہر کی مٹی اچھی
کم سے کم لپٹی تو رہتی ہے مرے نام کے ساتھ

نازش پرتاب گڑھی ادبی طور پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ترقی پسند تحریک سے میری وابستگی فیشن کے طور پر نہیں ہے، بل کہ اس کے شعری وادبی رنگ ومزاج سے میں خود کو ہم آہنگ پاتا ہوں۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے ترقی پسندی کے انتہائی عروج کے زمانے میں بھی اخلاقی، سماجی، سیاسی اور اجتماعی شعور کے غیر شخصی اظہار کے ساتھ ایسے اشعار کثرت سے کہے ہیں، جن میں ان کی شخصیت، انفرادیت اور داخلیت کا اظہار ملتا ہے۔ انھوں نے جس وقت شاعری شروع کی تھی، ترقی پسند، غیر ترقی پسند، سماجی، اصلاحی اور انقلابی وغیرہ کے عناوین لگاکر شاعری کو مصنوعی طور پر تقسیم کرنے کی کوشش شباب پر تھی۔ لیکن انھوں نے اس کی پروا نہیں کی۔ انھوں نے اپنے اشعار میں وہی بات پیش کی، جو ان کے مزاج وطبیعت کا تقاضا تھا۔

جو لوگ غزلیہ شاعری کو محض عشق وعاشقی کی داستان پارینہ سمجھتے ہیں اور نئے زمانے کے لیے اُسے ناموزوں قرار دیتے ہیں، وہ اگر نازش پرتاب گڑھی کی غزلیں پڑھیں گے تو انھیں اپنی رائے پر نظر ثانی کرنی پڑے گی۔ نازش پرتاب گڑھی کا کمال ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انھوں نے غزل سے نظم کا بھی کام لیا ہے، لیکن تغزل کی روایت کو پامال نہیں ہونے دیا۔ اس لیے کہ ان پر یہ بات پوری طرح منکشف تھی کہ غزل ہی وہ صنفِ سخن ہے، جس میں خارجی رجحانات، افکار اور خیالات کو اپنے ذاتی احساسات میں تحلیل کرنے کی پوری گنجائش ہے۔ قاری جب ان کے یہ اشعار پڑھے گا تو اُسے میرا ہم خیال ہونا پڑے گا۔

بول اے خلوصِ درد! کہاں لے چلوں تجھے
کہتے ہیں اِک ضرورتِ شعری ہے ذکرِ غم

کچھ اور کھل کے غم دیگراں کی بات کہی
جب اپنی ذات کے اندر اتر گیا ہوں میں

اپنی شکست مان گیا بات بات پر
یاروں سے میری معرکہ آرائی کم ہوئی

اجداد کے افسانوں پہ تقریظ بھول جا
اپنے پہ کوئی نقد و نظر کرسکے تو کر

لوگوں کا ہے کام بنائیں میری بھلی تصویر ان سے
میں نے تو کاغذ پر نازش! صرف لکیریں کھینچی ہیں

میں نے نمونے کے طور پر چند اشعار نقل کیے ہیں۔ انھیں پڑھ کر قاری اِس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہے گا کہ نازش پرتاب گڑھی بیسویں صدی کے ان شعرا میں تھے، جنھوں نے اردو غزل کو جمالیاتی احساس اور شائستگی سے ہم کنار کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے صرف اپنی مخصوص سوچ، وسیع جہت فکر اور لہجہ واسلوب کی شگفتگی کی بنیاد پر غزل کے عظمت و وقار کو آگے بڑھایا ہے۔ منقولِ بالا اشعار گواہی دیتے ہیں کہ نازش پرتاب گڑھی نے اپنی غزلیہ شاعری کے ایک ایک شعر سے وہ کام لیا ہے، جس کے لیے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہوتی ہے۔ انھوں نے غزل کی روایت سے انحراف کیے بغیر اپنے عہد کی سچائیوں اور حقیقتوں کی ترجمانی کی ہے۔

ناقدین نے نازش پرتاب گڑھی کی غزلیہ شاعری کو تحسین وپسندیدگی کی نگاہ سے اس لیے دیکھا ہے کہ وہ اپنے حقیقی خط وخال کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ انھوں نے اس کے حسن وجمال کو کچھ اس طرح سنوارا ہے کہ کہیں اس کا رنگ متاثر نہیں ہوا ہے۔ بل کہ اس میں ایک طرح کا نکھار ہی پیدا ہوا ہے۔ خود انھیں بھی اپنی اس انفرادیت کا احساس تھا۔ کہتے ہیں۔

ہمارے دور کے اہل قلم نے
جو کچھ دیکھا ہے وہ لکھا نہیں ہے

نازش پرتاب گڑھی کے کلام کی نمایاں خصوصیت اس کی اثر آفرینی بھی ہے۔ اس میں اپنی پوری شاعرانہ شان و شوکت کے ساتھ جو منظم سا غم گھلا ہوا ملتا ہے، وہ دل میں پیوست ہوجاتا ہے۔ ان کے اشعار گراں بار یا بوجھل نہیں محسوس ہوتے۔ ان کے کلام میں نہ ان کے مزاج کی تندی ملتی ہے اور نہ ان کی گفتار کی تیزی، جو کہ ایک طرح سے ان کی پہچان بن گئی تھی۔ ان کے یہاں ہم ضبطِ غم پاتے ہیں اظہارِ غم خال خال ہی پاسکیں گے۔ اِس ذیل میں یہ بات خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے کہ ان کے یہاں جو اظہارِ غم ملتا ہے، اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ انداز نہ ملتجیانہ ہوتا ہے اور نہ دادخواہانہ۔ ان کے الفاظ سے ایسی بے بسی یا بے چارگی سامنے نہیں آتی کہ وہ رحم وکرم کی بھیک کے طالب نظر آئیں۔ نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ کریں۔

یہ مانا آئینہ جھوٹا نہیں ہے
مگر یہ تو مرا چہرہ نہیں ہے

لاکھ برہم ہو اپنے ماضی سے
آدمی مڑ کے دیکھتا ہے ضرور

جس راہ سے موجِ غم گئی ہے یارو
دنیا کی نگاہ کم گئی ہے یارو

تم جس کو سمجھتے ہو غزل کا اک شعر
لفظوں میں کراہ جم گئی ہے یارو

اک عمر میں جلاتا رہا ہوں چراغِ دل
جب جاکے روشنی میں مرے دوست آئے ہیں

یہ حادثے رونے نہ رلانے کے لیے ہیں
سویا ہوا احساس جگانے کے لیے ہیں

ہر صفحۂ تاریخ جنوں اس کا ہے شاہد
دیوانے سبھی صاحبِ افکار رہے ہیں

تاوقتے کہ ہاتھوں میں ہے دم لکھتے رہیں گے
گزرے گی جو انساں پہ وہ ہم لکھتے رہیں گے

قرطاس نہ پائیں گے تو صد پارۂ دل پر
تاریخ ستم، قصہ غم لکھتے رہیں گے

میں چپ رہوں تو اپنی نظر سے گرا رہوں
کھولوں زباں تو دوڑ کے سچائیاں ڈسیں

نازش پرتاب گڑھی کے شعری ذخیرے میں ایسے اشعار بہ کثرت ملتے ہیں، جن سے ان کی وفاشعاری اور احباب نوازی کا پتا چلتا ہے۔ دلّی میں نازش صاحب کے ایک دوست دیرینہ جناب مشہود مفتی مرحوم رہتے تھے۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے شعبۂ تدریس سے وابستہ تھے۔ ایک بار کسی مشاعرے کے سلسلے میں وہ دلّی تشریف لائے اور کئی روز تک ان کے یہاں قیام کیا۔ انھوں نے ایک غزل کے مطلع میں مفتی صاحب کے خلوص و محبت کو اس طرح یاد کیا ہے۔

نازش! خلوصِ دوست کا مظہر کہیں جسے
دلّی میں جاکے ملتے ہیں، اس آدمی سے ہم

جناب غلام ربانی تاباں سے بھی ان کا دوستانہ تھا۔ ان کے کسی احسان کو اپنی ایک غزل کے مقطعے میں انھوں نے یوں یاد کیا ہے۔

نازش! اک انسان سے ملنے کو آئے ہیں یہاں
ورنہ دلّی سے ہمارا واسطہ کوئی نہیں

نازش پرتاب گڑھی نے کم و بیش ساٹھ سال کی عمر پائی۔ انھوں نے پوری عمر شعر و شاعری میں گزار دی۔ وہ گرچہ چھت اڑانے والے یا اسٹیج پر دھوم مچانے والے شاعر نہیں تھے۔ نہ یہ فن انھیں آتا تھا اور نہ اس قسم کی باتوں کو وہ پسند کرتے تھے۔ وہ ان شعرا میں تھے، جو نقیب مشاعرہ کی دعوتِ سخن پر بڑی سنجیدگی سے مائک پر آتے ہیں اور کسی تمہید یا وضاحت کے بغیر کلام سنانا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن سامعین انھیں بڑی سنجیدگی اور وقار کے ساتھ سنتے تھے اور بھرپور داد و تحسین سے نوازتے تھے۔ افسوس کہ یہ روایت اب تقریباً مفقود ہو چکی ہے۔ مشاعروں میں اُن کی نظمیں خصوصیت کے ساتھ پسند کی جاتی تھیں۔ ان کی نظموں میں اردو کی خدمت متاعِ قلم، لفظوں کا المیہ، زبان سے نفرت کیوں اور آخری بات اپنے دور کی معرکہ آرا نظمیں تھیں۔ مشاعروں میں بہت مقبول تھیں۔ فرمائش کرکے سنی جاتی تھیں۔ ان کی نظم 'آخری بات' کا یہ شعر تو آج تک زبان زد ہے۔

مرے قلم کو مرے ساتھ دفن کر دینا
کہ یہ عذاب نئی نسل تک پہنچ نہ سکے

ہم نازش پرتاب گڑھی کی خواہ غزل پڑھیں، خواہ نظم یا کچھ اور ہر جگہ ان کی حب الوطنی اور انسان دوستی نمایاں رہتی ہے۔ یہ ان کا ایسا امتیاز ہے، جو ان کے کسی ہم عصر کے یہاں کم ہی دیکھنے کو ملے گا۔ ان کی ایک طویل نظم ہے 'جواب آں عزیزم'۔ یہ نظم انھوں نے 1964م میں لکھی تھی۔ اس سال کے اوائل میں ہندستان کے مختلف مقامات پر ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کی اطلاعات سے نازش صاحب کے وہ اعزہ و اقربا بہت متاثر تھے، جو تقسیم ملک کے وقت یہاں سے ہجرت کر گئے تھے۔ وہ ان فسادات کے موقعے پر نازش صاحب اور ان کے خاندان کے سلسلے میں بے حد فکر مند تھے۔ انھیں ہر وقت تشویش رہتی تھی۔ ان کا مشورہ تھا کہ نازش صاحب بھی آل اولاد کے ساتھ پاکستان ہجرت کر جائیں۔ اس سلسلے میں ان کے چھوٹے بھائی نے تفصیلی خط لکھا تھا۔ یہ نظم دراصل اسی خط کا منظوم جواب ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی کی پیش کش اور مشورے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا ہے۔

مگر عزیز برادر! تمھیں یہ کیا معلوم
کہ میں نہ بے کس و بے بس ہوں اور نہ ہوں مغموم

یہ ظالموں کا وطن ہے، لکھا ہے تم نے مگر
مجھے تو صرف دعائیں ملی ہیں ہونٹوں پر

مختلف آسانیوں اور خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

یہ میرا ملک ہے، میرا وطن ہے، میری زمیں
یہاں سبھی مرے اپنے ہیں کوئی غیر نہیں

آگے چل کر فرمایا۔

ہے واقعہ کہ جگر ہوں کوئی نہ جوش ہوں میں
پلیٹ فارم پر ادنیٰ کتب فروش ہوں میں

مگر خلوص بھی مجھ کو ملا محبت بھی
مجھے نصیب ہے عزت بھی اور شہرت بھی

کتابی سائز کے گیارہ صفحات پر مشتمل یہ طویل نظم اپنے اندر حب وطن اور انسان دوستی کا گراں قدر خزانہ سمیٹے ہوئے ہے۔ اس نظم سے نازش پرتاب گڑھی کی حب الوطنی اور انسان دوستی کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اس کا ایک ایک شعر تاریخ ہند کا اہم سرمایہ ہے۔ وہ خواہ کسی بھی تحریک یا گروہ سے تعلق رکھتے رہے ہوں، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک سچے اور پکے محبِ وطن تھے۔ انھوں نے اپنے حب وطن کے جذبے کو کبھی مغلوب نہیں ہونے دیا۔

نازش پرتاب گڑھی نے اپنی عمر کا بڑا حصہ مشاعروں میں صرف کیا۔ بلکہ یہی چیز ان کے لیے ذریعۂ معاش کے درجے میں آگئی تھی۔ اس لیے کہ ان کا اور کوئی خاص کاروبار بھی نہیں تھا۔ جب کہ مصارف زیادہ تھے۔ لیکن انھوں نے خود داری، وضع داری اور اپنی مزاجی وطبعی شرافت و نجابت کو کبھی داؤ پر نہیں لگایا۔ ہمیشہ عزت و وقار کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کی، کسی بڑے یا چھوٹے مشاعرے کے لیے نہ کبھی کسی سے سفارش کرائی اور نہ کسی کنوینر مشاعرہ کی خوشامد کی۔ شرکت کا دعوت نامہ ملا، منظوری دے دی۔ نہ کبھی دعوت نامے کے جواب میں نذرانے یا اعزازیے کے سلسلے میں کوئی شرط لگائی اور نہ ختم مشاعرہ کے بعد مشاعرے کی کمیٹی والوں سے اعزازیے کی کمی بیشی پر لڑے یا بحث کی۔ جب وہ اسٹیج پر بیٹھتے تھے تو بڑی خاموشی اور متانت کے ساتھ بیٹھتے تھے۔ اور تمام شعرا کا کلام سنتے تھے۔ مشاعروں میں بیٹھ کر اغل بغل کے لوگوں سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنا یا کسی قسم کی کانا پھوسی انھیں بالکل پسند نہیں تھی۔ اسٹیج پر کسی شاعر کی غیر سنجیدہ حرکت پر اسے پہلے ایک دو بار سمجھاتے تھے پھر ڈانٹ دیا کرتے تھے۔

نازش پرتاب گڑھی کی شاعری کا بڑا کمال یہ ہے کہ وہ کسی ایک صنفِ سخن میں قید نہیں رہے۔ انھوں نے غزلیں بھی کہیں اور نظمیں بھی قصائد بھی کہے اور نعت و مناقب بھی اور قطعات و رباعیات بھی۔ ان کے عہد کے بڑے بڑے ناقدین فن اور ادب فہم دانش وروں نے ان کی قدرتِ کلام اور مہارتِ فن کا اعتراف کیا ہے۔ اس سلسلے میں نیاز فتح پوری، ماہرالقادری، غلام ربانی تاباں اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے نام بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ نیاز فتح پوری نے رسکن کا قول نقل کیا ہے کہ ''اچھی اور حسین عورت کہیں بھی ہو یا جو بھی ہو میرا اس سے رابطہ ازلی ہے۔'' — پھر لکھتے ہیں: 'یہی عقیدہ میرا شاعری کے سلسلے میں ہے کہ اچھا شاعر کہیں بھی ہو، کسی بھی خطہ و دیار سے اس کا تعلق ہو، میں اُسے اپنا رفیق و انیس سمجھتا ہوں۔ نازش پرتاب گڑھی کا کلام پڑھ کر میں ایسا ہی محسوس کرتا ہوں۔'

نازش پرتاپ گڑھی 14 جولائی 1924 کو اس جہانِ رنگ و بو میں وارد ہوئے اور 10 اپریل 1984 کو تقریباً ساٹھ برس تک شعر و ادب سے بھرپور زندگی گزار کر رخصت ہوگئے۔ ان کو اس دنیا سے رخصت ہوئے چالیس برس ہونے کو ہیں۔ لیکن اپنے انقلاب آفریں اشعار، معرکہ آرا نظموں اور تغزل و تفکر سے لبریز غزلوں کی وجہ سے وہ اب بھی زندہ ہیں اور اس وقت تک زندہ رہیں گے، جب تک شعر و ادب کی روایت زندہ رہے گی۔

■

Dr. Tabish Mehdi
G5/A - Abul Fazl Enclave
Jamia Nagar, New Delhi - 110025 (INDIA)
Cell: 9818327947
E-mail: drtabishmehdi@gmail.com

حمیرا حیات

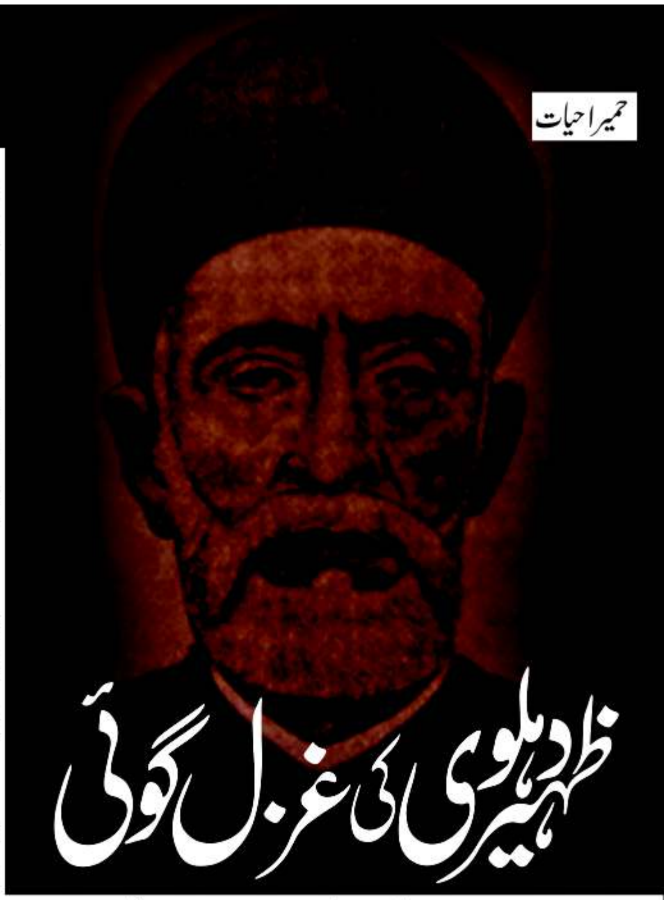

ظہیر دہلوی کی غزل گوئی

ہنگامہ غدر 1857 کے بعد دہلی کو خیر باد کہنے والے شاعروں میں سید ظہیر دہلوی کا نام قابل ذکر ہے۔ظہیر دہلوی کی ولادت 1835 میں دہلی میں ہوئی۔ان کے والد میر جلال الدین حیدر اپنے عہد کے اچھے خوش نویسوں میں شمار ہوتے تھے۔جلال الدین حیدر کو بادشاہ ابوظفر نے مرصع رقم صلاح الدولہ کا خطاب دیا تھا۔ظہیر دہلوی نے ابتدائی تعلیم مختلف اساتذہ سے حاصل کی۔دوران تعلیم ہی شعروسخن کی ابتدا ہو چکی تھی۔سب سے پہلی غزل حافظ قطب الدین صاحب مشیر شاگرد شاہ نصیر کے منعقد کردہ مشاعرے میں پڑھی۔تیرہ برس کی عمر میں آپ نے شاہی ملازمت اختیار کی اور بائیس برس کی عمر تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ظہیر دہلوی دہلی کے اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جب دہلی اجڑ رہی تھی۔دہلی کی بزم شعرا دوسرے شہروں میں منتقل ہو رہی تھی۔ہنگامہ غدر 1857 میں ظہیر نے بھی دہلی کو خیر باد کہا۔پانی پت میں کچھ روز قیام کیا پھر بریلی تشریف لے گئے۔لیکن کہیں بھی عافیت نظر نہیں آئی۔آخر نواب یوسف علی خاں والی رام پور کے دربار میں پناہ لی۔ظہیر تقریباً چار سال کے قریب رام پور ہی میں رہے۔اس کے بعد پھر دہلی آئے لیکن دوبارہ قیام دہلی ان کے لیے سودمند ثابت نہ ہوا۔کیونکہ دہلی میں اب پہلی جیسی نہ رونقیں تھیں نہ آرام،حالات بد سے بدتر تھے۔دہلی بری طرح ویران ہو چکی تھی۔ظہیر دہلوی کو دہلی کے مٹنے کا بہت غم تھا۔اس غم کو وہ اپنی غزلوں میں کچھ یوں بیاں کرتے ہیں۔

ہم نشیں قصہ دہلی نہ سنانا ہرگز ۔۔۔ زخم نو داغ کہن پر نہ لگانا ہرگز
بھولے ہوئے افسانہ دل یاد کریں گے ۔۔۔ اجڑی ہوئی بستی کو پھر آباد کریں گے
بہہ گئے سیل فنا میں شہر والے اے ظہیر ۔۔۔ بے کسی آباد ہے اب تو جہاں آباد میں

کچھ دن بلند شہر کے'جلوہ طور'اخبار میں بطور ایڈیٹر کام کیا۔لیکن دہلی میں ان کو سکون نہ ملا کوئی نہ کوئی دکھ پریشانی ان کی جاں کے ساتھ لگے رہتے۔فرماتے ہیں۔

کہیں آرام سے دو دن فلک رہنے نہیں دیتا ۔۔۔ ہمیشہ اک نہ اک سر پر مصیبت آ ہی جاتی ہے
سخت جانی کی بدولت طے ہوئے سب مرحلے ۔۔۔ کام جو دشوار تھے آساں سے آساں ہو گئے

الور کے مہاراجہ شیودان سنگھ علم دوست اور ادب پرور تھے۔خود بھی عالم تھے اور عالموں کی قدر کرتے تھے۔انھوں نے بہت سے ادبا اور شعرا کو اپنے دربار سے وابستہ کر لیا تھا۔ظہیر کی علمیت و قابلیت سے متاثر ہو کر مہاراجہ نے انھیں الور بلا لیا۔چار سال ملازمت کرنے کے بعد دہلی آ گئے۔دہلی میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے مراسم تھے لہٰذا ان کی سفارش پر ریاست جے پور کے محکمہ پولیس میں تھانیدار ہو گئے۔انیس سال تک ملازمت کی اور پھر سبکدوش ہو گئے۔ریاست ٹونک کے نواب محمد ابراہیم علی خاں نے اپنے پاس بلا لیا۔پندرہ سولہ برس ٹونک میں رہے۔شعر و شاعری کے لحاظ سے یہ دور بہت ہی خاص رہا۔ٹونک میں ان کی شاعری بہت مقبول ہوئی۔ایک باوقار شاعر کی حیثیت سے وہاں رہے۔اسی دوران شاگردوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔جن میں سے بعد میں کئی شاگرد مقبول ہوئے۔اس کے بعد حیدرآباد بھی گئے آخر کار 27 مارچ 1911 کو دنیائے فانی سے رخصت ہوئے۔

ظہیر دہلوی کی زندگی کا بڑا حصہ صدموں اور پریشانیوں میں گزرا۔ان کی غزلوں میں اس داستانِ حیات کی بدحالی کا بیان ملتا ہے۔

پھر گئیں چشم زدن میں وہ نگاہیں کیسی ۔۔۔ دیکھتے دیکھتے بدلا ہے زمانہ کیسا
یہ طاقت ہے یہ قدرت ہے اسی ناچیز مٹی کو ۔۔۔ فلک سے جو نہیں اٹھتا اسے انساں اٹھاتے ہیں
کون بنتا ہے مکیں اس خانہ برباد کا ۔۔۔ یہ دل ویراں نمونہ ہے جہاں آباد کا

ظہیر دہلوی نے غزلیں،قصائد،قطعات،اور رباعیات تقریباً سب ہی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔لیکن وہ بنیادی طور پر ایک غزل گو شاعر تھے۔ان کے شعری سرمائے میں تین دیوان موجود ہیں۔پہلا'گلستان سخن 1899 ٹونک میں مرتب ہوا جس کے انتخاب وترتیب کا کام انھوں نے اپنے شاگرد عزیز عاشق ٹونک کے سپرد کیا تھا۔اس دیوان میں حمدیہ اور نعتیہ غزلیں،شہر آشوب،رباعیات،قصائد،سہرا،تاریخی قطعات بھی شامل ہیں۔لیکن اس میں تاریخی ترتیب نہیں ہے۔باوجود اس کے اس دیوان میں غدر کے بعد اور ٹونک کی ملازمت کے دوران جتنا شعری سرمایہ تھا تقریباً سب ہی جمع ہو گیا ہے۔

بقول عاشق''استاد صاحب نے شاگرد نوازی فرما کر مجھے عزت بخشی۔میں نے نہایت شرم سے اس کام کو کیا''(ہماری زبان،دہلی شمارہ یکم ستمبر 74،ص 8)

جگن ناتھ پرشاد فیض تذکرہ'گلزار سخن'میں لکھتے ہیں کہ:

''آپ کے تین دیوان ریاست ٹونک میں شائع ہو چکے ہیں۔چوتھا بھی قریب اختتام ہے۔''(گلزار سخن از جگن ناتھ پرشاد فیض،مطبوعہ 1908،ص 278)

گلستان سخن کے علاوہ ظہیر دہلوی کے دو دیوان'شبستان عبرت 1329ھ،دفتر خیال 1330ھ ان کی حیات ہی میں حیدرآباد میں ترتیب پائے گئے تھے۔ظہیر نے ان دونوں دواوین اور ایک قلمی مسودے کا ذکر اپنی خود نوشت میں کیا ہے۔

''تا زمان انطباع دیوان دوم بھی ترتیب پا گیا۔مگر بعد اس قدر استطاعت نہ ہوئی کہ وہ بھی چھپوایا جاتا۔اب عنایت ایزدی سے تین دیوان کا ذخیرہ میرے پاس موجود ہے اور ایک جلد کے قریب مرثیے،سلام،رباعیات وغیرہ فراہم ہو گئے ہیں۔خداوند تعالیٰ اپنے خزانہ غیب سے کوئی سامان مہیا کر دے گا تو وہ بھی طبع ہو جائیں گے۔ظاہراً تو کوئی سامان مہیا نظر نہیں آتا۔(داستان غدر،ص 313)

ظہیر دہلوی کے چوتھے دیوان کے متعلق کوئی خاص معلومات تو حاصل نہیں ہوتی۔لہٰذا ان کے چوتھے دیوان کے حوالے سے مدبر علی زیدی فرماتے ہیں۔

''دیوان چہارم شائع نہیں ہو سکا اور 1947 کے ہنگامہ میں ضائع ہو گیا''

(تنقیدی جائزے،مدبر علی زیدی،ص 152)

نثر کے حوالے سے ظہیر دہلوی کی تصنیف'داستان غدر'ایک اہم کتاب ہے۔جو 1910 میں شائع ہوئی۔داستان غدر ایک خود نوشت سوانح حیات ہونے کے ساتھ ساتھ غدر کی مستند تاریخ بھی ہے۔اس کتاب میں ظہیر نے غدر کے چشم دید حالات نہایت

روانی وسادگی سے بیان کیے ہیں۔ نہ صرف غدر بلکہ وہ واقعات بھی ہیں جو ان کے گھر والوں پر بیتے تھے۔ اس وقت کے بیتے ہر منظر کو بیان کرتی ہے جو خود ظہیر کی زندگی سے جڑے تھے۔ انگریزوں کے سیاسی قانون، عوام اور بادشاہ کے ساتھ کی گئی سیاست، فسادات، وغیرہ کا ذکر بھی اس کتاب میں ملتا ہے۔ علاوہ ازیں دوسری طرف قلعہ معلی کی معاشرت، آداب ورسوم مجلسی اور ان کے ہمعصر شعرا کی زندگی اور شاعری کے حوالے سے مفید اور اہم معلومات کتاب میں پیش کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں والیان ریاست کے مزاج، فیاضیوں اور ان کے عادت واطوار کی عکاسی بڑے دلچسپ انداز میں بیان کی ہے۔ ظہیر دہلوی نے اس دور میں ریاستوں کی تہذیب ومعاشرت کی سچی تصویریں پیش کی ہیں۔

جہاں تک شعری دیوان کا تعلق ہے ظہیر دہلوی کے دیوان اول میں جو لطف تغزل ہے وہ باقی دواوین میں نہیں ملتا۔ شاید اس کی وجہ دیوان اول کی تکمیل کے زمانے میں ظہیر دہلوی ذہنی و مالی اعتبار سے پریشان حال نہ ہونا تھا۔ جبکہ دیوان دوم، سوم کے زمانے میں وہ بہت پریشانیوں میں مبتلا رہے۔ خیر وجہ جو بھی رہی ہو لیکن ان کی شاعری اور انداز بیان دبستان دہلی کے صف اول کے شعرا میں بلند مقام دلانے کے لیے کافی ہے۔

ظہیر دہلوی نے شاعری کی ابتدا ایک ایسے دور میں کی جب اردو شاعری میں غالب، مومن، ظفر اور ذوق کی شاعری کا طوطی بول رہا تھا۔ ظہیر بھی ان شعرا کی صحبت سے فیضیاب ہوئے۔ ذوق کی شاگردی اختیار کی ساتھ ہی مومن کے رنگ سخن سے متاثر تھے لہذا اس طرز کو اختیار کرنے کی کوشش کی۔ بہادر شاہ ظفر کی سرپرستی میں ہونے والے مشاعروں اور دوسری ادبی و علمی محفلوں میں ظہیر بھی شرکت کرتے تھے ذوق، غالب، مومن کی صحبتوں سے انھیں خوب فیض حاصل ہوا۔ ان صحبتوں سے ظہیر کی علمی تشنگی، ذوق مطالعہ پیدا ہوا ساتھ ہی ان کی ذاتی صلاحیت نے ان کی شخصیت کو جلا بخشی جس سے ان کے مزاج میں علم وادب کا میلان رچ بس گیا۔

ظہیر دہلوی اپنے عہد کے معیار شعر سے آگاہ تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ شعر میں الفاظ کی نشست، محاورے کے برجستہ استعمال، روزمرہ کے جادو اور تخیل کی کیا قدر و قیمت ہے۔ اس دور کے شعرا کے کلام کی سب سے اہم خوبی لطف زبان ہے۔ یہی ان کی غزلوں کی سب سے اہم خصوصیت بھی ہے۔ ان کے کلام میں کلاسیکی روایات کا پرتو نظر آتا ہے۔ زبان کی صفائی، روانی اور سلاست ان کے کلام کو پر اثر بناتی ہے۔ ظہیر دہلوی نے الفاظ وتراکیب کی بندش وچستی، محاورے، صنائع و بدائع کا استعمال پر خاص توجہ دی ہے۔ ظہیر اپنا مخصوص لب ولہجہ رکھتے ہیں۔ تکرار لفظی، رعایت لفظی اور صنعت تضاد کے استعمال سے شعر میں لطف اور حسن پیدا کردیتے ہیں۔ روزمرہ اور محاوروں کے برجستہ استعمال میں انھیں ماہرانہ قدرت حاصل ہے۔ ان اشعار سے ان کے رنگ سخن کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً

تم تھے جہاں جہاں وہیں دل بھی ضرور تھا — میں بدگمانیوں سے بہت دور دور تھا
دیکھیے کیا گل کھلائے فصل گل آئی تو ہے — ہاتھ ابھی سے بڑھتے ہیں جیب ودامں کی طرف

ظہیر ایک فطری شاعر تھے مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کرنا ان کے لیے مشکل نہ تھا۔ یوں لگتا ہے اپنے پیش رو شاعر اور استاد شعرا ذوق، غالب اور مومن کی زمینوں میں شعر کہنے میں انھیں لطف آتا ہے۔ اپنے استاد ذوق کی طرح ہی وہ قافیہ پیمائی کا ہنر دکھاتے ہیں۔ ان شعرا کے انداز بیان کو بڑی خوبی سے نبھاتے ہوئے اپنا جوہر چمکاتے ہیں۔ مثلاً

کیا نباہی طرز مومن اے ظہیر — طاق ہیں لاریب اپنے فن میں ہم
سودائے محبت میں جو سر جائے تو اچھا — یہ بوجھ میرے سر سے اتر جائے تو اچھا
یہ کانٹا بھی نکل جائے شب ہجر — کہ دم کے ساتھ کھٹکا ہے سحر کا

ظہیر دہلوی اساتذہ کی زبان کی تقلید کا دامن تھامے ہوئے اپنی غزلوں میں روایتی علامتیں، تشبیہات، استعارات کا خوب استعمال کرتے ہیں۔ کلام میں زور بیان روانی اور ترنم پیدا کرنے کے لیے تکرار لفظی، رعایت لفظی اور صنعت تضاد بھی جا بجا مل جاتے ہیں۔ مثلاً

ہوتے ہوتے ہی کہیں صبر کی عادت ہوگی — رفتہ رفتہ ہی سنبھلتے ہیں سنبھلنے والے
اک اک خطا شعار کو رحمت سے ہے لگاؤ — الجھا ہے خار خار سے دامن نسیم کا
تمھارے دل میں ہو کس طور سے گزر میرا — نہ شوق ہوں نہ محبت نہ اعتبار ہوں میں

اپنے ہم عصر شعرا مومن و داغ کی طرح ظہیر دہلوی نے شوخی وطنز وتعریض کو اس طور برتا ہے کہ یہ رنگ تقلیدی و رسمی معلوم ہوتا ہے۔ غور کریں تو ان کے کلام میں حسن و عشق کی نیرنگیوں اور ان سے متعلق نازک ولطیف جذبات واحساسات کی دلکش عکاسی ملتی ہے لیکن یہ رنگینی، شوخی، طنز وتعریض کا یہ رنگ اس حد تک نہیں ہے جتنا مومن و داغ کے یہاں ملتا ہے۔ مثلاً

کب وہ سنتے ہیں کہ ہے کون دہائی دیتا — اونچے لوگوں کو ہے اونچا ہی سنائی دیتا
خوش ہوئے تو کہہ دیا چل دور ہو — واہ کیا اخلاص ہے کیا پیار ہے

ظہیر دہلوی کے رنگ تغزل میں چند ایسی امتیازی خصوصیات ہیں جو انھیں دوسرے شعرا سے منفرد کرتی ہیں۔ ان میں سب سے اہم دہلی کی ٹکسالی زبان ہے۔ ظہیر دہلوی کو اس پر قدرت حاصل تھی۔ دہلی کی زبان، صفائی اور سادگی، ترنم اور شیریں بیانی یہ وہ عناصر ہیں جو ان کے کلام میں تاثیر پیدا کرتے ہیں۔ چونکہ انھوں نے اپنے اسلوب کے لیے ذوق کی زبان، غالب کی بندش اور مومن کی طرز کو مستعار لیتے ہوئے اپنی راہ جدا نکالنے کی کوشش کی ہے اس لیے روزمرہ محاورے کی صفائی زبان وبیان کی شستگی اور طرز ادا میں ایک تاثیر پیدا ہوگئی ہے۔ تغزل کی چاشنی اور سوز وگداز ان کے کلام میں پر اثر انداز میں موجود ہے۔

کیوں کسی سے وفا کرے کوئی — خود برے ہوں تو کیا کرے کوئی
موت کا نام بے وفائی ہے — ہائے کب تک وفا کرے کوئی
درد اور درد بھی جدائی کا — ایسے بیمار کی دعا کب تک

جہاں تک بات غزل کے داخلی پیکر کی ہے تو اس کو سجانے وسنوارنے میں صنعت گری کے علاوہ رمز و کنایہ، نازک خیالی، جدت ادا، فصاحت و بلاغت، سوز وگداز اور جمالیاتی کیف کی اہمیت زیادہ نظر آتی ہے۔ چونکہ تغزل کا تعلق وجدان اور ذوق سے ہے اس لیے اس کی کوئی منطقی تعریف ممکن نہیں ہے۔ بعض اوقات الفاظ کے بہترین انتخاب، دلی جذبے کی سچی ترجمانی سے بھی تغزل کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ بہ شرط شعر میں تاثیر ہو اور سیدھا دل میں اتر جائے۔ ظہیر دہلوی کے کلام میں جمالیاتی کیفیت اور نازک خیالی کی کمی نہیں ہے۔ مثلاً

ہوتی ہے حسن و عشق میں کتنی مناسبت — میرے بیاں کا رنگ تمھاری ادا میں ہے
قیامت پر نہ رکھو فیصلہ دل کا خدا جانے — تمھارے منہ سے کیا نکلے ہمارے منہ سے کیا نکلے

مختصر یہ کہ دبستان دہلی کے شعرائے متاخرین میں صف اول کے شعرا میں جن شعرا کو بلند وممتاز مقام حاصل ہوا ان میں ظہیر دہلوی کا نام بہت اہم ہے۔ ظہیر دہلوی کے معاصرین میں اسد لکھنوی، مضطر خیرآبادی، راقم، قربان علی بیگ سالک، محمد علی تشنہ جیسے اساتذہ فن شامل ہیں۔ اردو غزل کو سنوارنے وسجانے اور مقبول عام بنانے میں ان شعرا نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ظہیر کے شاگردوں میں صاحبزادہ احمد علی خاں رونق، مولوی نادر علی برتر، منشی نجم الدین ثاقب بدایونی، صاحبزادہ احمد سعید خاں عاشق ٹونکی اول درجے میں شمار کیے جاتے ہیں۔

ظہیر دہلوی نے اپنے کلام سے نا صرف دہلی بلکہ الور، جے پور اور ٹونک کی ادبی فضاؤں میں ایک نئی روح پھونکی۔ اردو زبان خاص طور پر دہلی کی شیریں زبان کو دوسری ریاستوں میں پھیلانے میں ظہیر دہلوی نے ایک نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

■

Humera Hayat
Guest Faculty, Dept of Urdu, Delhi University
Delhi-110007

شاہ نواز فیاض

مہابھارت کے اردو تراجم

(جلال افسر کے ترجمے کے حوالے سے)

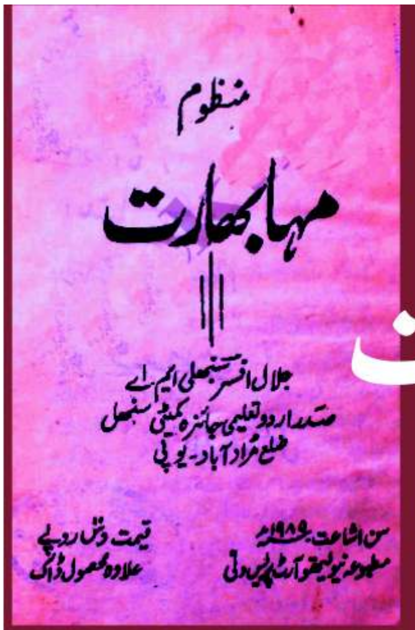

زبان کے حیرت انگیز کارناموں میں سے ایک اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ وہ عوام الناس کے افکاروخیالات سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کراتی ہے۔ دنیا میں تقریباً تمام علوم کی کتابوں کا مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے، اس کا جو فائدہ ہے وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ اسی طرح سے مذہبی کتابوں کا بھی دنیا کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ کیا گیا ہے، جس سے مذہب کو سمجھنے میں آسانی ہوئی۔ بات صرف مہابھارت کے حوالے سے کی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اردو میں مہابھارت سے متعلق اور اس کے تراجم کے حوالے سے تقریباً تین درجن کتابیں موجود ہیں۔ میری معلومات کے حساب سے اردو میں مہابھارت کا پہلا ترجمہ طوطا رام نے 1862 میں کیا تھا، جسے نول کشور پریس نے شائع کیا تھا۔ اس کتاب پر کہیں سنہ اشاعت درج نہیں ہے، لیکن کتاب کے بالکل آخری صفحے پر تاریخ طبع کتاب درج ہے، جس کا مادہ 1862 نکلتا ہے، اسی طرح سے ہجری میں 1278 درج ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ مہابھارت کا پہلا اردو ترجمہ 1862 میں شائع ہوا۔ نند کشور وکرم نے عالمی ادب کے دھارمک نمبر میں اس ترجمے کا سنہ اشاعت 1874 لکھا ہے، جب کہ قطعۂ تاریخ سے کچھ اور واضح ہوتا ہے۔ دھارمک نمبر کے حساب سے اردو میں مہابھارت کا پہلا ترجمہ سی۔ پی۔ کھٹاو نے کیا ہے، جبکہ حقیقت اس سے مختلف ہے۔ دوسرا ترجمہ سی پی کھٹاو نے 'مہابھارت' کے عنوان سے 1867 میں کیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے اردو ترجمے کے ابتدائی زمانے میں مذہبی صحائف کے ترجمے کو اولیت کا درجہ حاصل تھا۔

مہابھارت کو بچوں کے لیے بھی پیش کیا گیا، اس سلسلے میں شیوناتھ رائے کی کتاب 'بچوں کے لیے مہابھارت' کافی اہم ہے۔ اس طرح کے کام کو اس لیے بھی اہم قرار دیا جاسکتا ہے کہ بچوں کے لیے جو کتابیں تیار کی جاتی ہیں، اس کا مقصد صرف کتاب تیار کرنا نہیں ہوتا ہے، بلکہ بچوں کی نفسیات کو سامنے رکھ کر کتاب کچھ اس طرح سے مرتب کی جاتی ہے کہ مکمل طور پر کتاب کا مقصد پورا ہو سکے۔ اس طرح کی کتابوں سے بچوں کی ذہن سازی میں بہت مدد ملتی ہے۔

مہابھارت ہندومت کا ایک بے حد معروف و مشہور رزمیہ ہے۔ دراصل مہابھارت ہندوستان کی بہت قدیم اور طویل منظوم داستان ہے، جسے ہندومت کے مذہبی صحائف میں بڑا اعتبار حاصل ہے۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ بے حد متنوع ہے، کیونکہ اس میں جنگ، راج دربار، محبت اور مذہب سب کچھ شامل ہے یا یہ کہیں کہ مہابھارت چار بنیادی مقصد حیات دھرم، کام، ارتھ اور موکش کا مرکب ہے۔ مہابھارت سنسکرت کے مشہور عالم وید ویاس کی تصنیف ہے، البتہ اس سلسلے میں بعض محققین کا خیال ہے کہ اصل مہابھارت میں بعد کے علما نے اضافہ کیا ہے، جس سے اس کے شلوکوں کی تعداد ایک لاکھ سے تجاوز کر گئی ہے، یہ ایک تحقیق طلب امر ہے۔ اس کے اصل مصنف کے بارے میں سب متفق ہیں۔ مہابھارت کی کہانی کوروؤں اور پانڈوؤں کے خاندان اور ان کے مابین ہونے والی جنگ ہے۔ اس میں حق کی باطل پر جس طرح سے جیت دکھائی گئی ہے، وہی کتاب کے مصنف کا اصل مقصد اور اس کا مرکزی موضوع بھی ہے۔ مہابھارت میں شری کرشن جی کی جو اہمیت ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ چونکہ شری کرشن جی ان دونوں کے قریبی رشتے دار ہیں، اس لیے انھوں نے خود کو غیر جانب دار رہنے اور ہتھیار نہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ البتہ شری کرشن جی نے ارجن کو جو درس دیا ہے، وہ غیر معمولی اور آفاقی ہے۔ انھوں نے ارجن کو روح کی عظمت اور حق کی حفاظت کے لیے جان تک کی بازی لگا دینے کا درس دیا۔ مہابھارت میں ہندو مذہب کے نصائح کے ذخیرے کے ساتھ ساتھ نہایت ہی اعلی خیالات موجود ہیں۔ اردو میں مہابھارت کے کئی تراجم منظر عام پر آئے، جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، اسی سلسلے کا ایک ترجمہ جلال افسر سنبھلی کا بھی ہے، جو 1989 میں منظر عام پر آیا۔ اس ترجمے کے متعلق جلال افسر نے لکھا ہے:

''اس نظم میں نہایت اعلی خیالات اور ہندو نصائح کا ذخیرہ موجود ہے اس لیے اس کے ترجمے متعدد زبانوں میں ہو چکے ہیں مگر پھر بھی عوام الناس اس لافانی نظم سے فیض یاب نہیں پائے..... راقم الحروف نے مہابھارت کو سلیس اردو زبان میں مختصراً پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔''

(مہابھارت، مترجم جلال افسر سنبھلی 1989، ص،6-5)

جلال افسر کا اصل نام جلال الدین ہے۔ ان کی پیدائش یکم دسمبر 1949 میں ہوئی۔ انھوں نے بیسک ایجوکیشن بورڈ کے جونیئر ہائی اسکول میں بحیثیت استاد اپنی خدمات انجام دیں۔ انھوں نے تین مجلوں کی ادارت کی، دو کتاب ترتیب دی اور چھ ایسی کتابیں ہیں جو ان کی باقاعدہ تصنیف اور ترجمے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ ایک شاعر تھے۔ مہابھارت کا ترجمہ کرتے وقت انھوں نے کمال کی فنی ہنر مندی کا ثبوت دیا ہے۔ جلال افسر نے جس طرح سے اس کا ترجمہ کیا ہے، ایسا لگتا ہے کہ یہ ترجمہ نہیں تخلیق ہے، منظوم تراجم میں تخلیقی ہنر مندی سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مہابھارت میں کرشن جی کی نورانی شخصیت ارجن کو جو درس حیات دیتی ہے، وہ آج بھی حیات انسانی کی منزل مقصود ہے۔ کرشن جی نے ارجن کو کس طرح سے درس دیا ہے، اس حصے کو جلال افسر نے کچھ اس انداز میں نظم کیا ہے۔

فکر باطل کی نہ کر، بزدل نہ ہو، ناداں نہ بن
موت سے ڈرتے نہیں ہیں رہروِ حق جان من
حق امر ہے اس کا کوئی مارنے والا نہیں
اور باطل اپنی کوئی اہمیت رکھتا نہیں
اس لیے حق کی حفاظت فرض ہے ہر شخص پر
زندگی اور موت کا اس پر نہیں ہوتا اثر
کون ہے وہ جس کو ارجن ایک دن مرنا نہیں
کون ہے جس کو عدم کی راہ طے کرنا نہیں
جسمِ خاکی کی حقیقت کچھ نہیں ہے جان لے
روح صادق ہے حقیقت میں اسے پہچان لے

یہ واقعہ ہے جب ارجن میدان جنگ میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا اور خون کا

پیاسا دیکھتے ہیں، تو وہ جنگ کے مقصد کو لے کر پیش وپیش میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ جنگ وجدل سے کیا فائدہ؟ مہابھارت کے پورے اخلاقی ڈرامے میں نفسیاتی طور پر یہ نقطہ بہت اہم ہے۔اس حصے کا جلال افسر نے جس انداز میں ترجمہ کیا ہے، اس کو اوپر ملاحظہ کیا گیا ہے۔روح کی عظمت اور غیر فانی حیثیت کے بارے جو کچھ کہا گیا ہے، اس کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔

عنصری قالب کی ناداں فکر کرتا ہے عبث
جنگ سے باطل پرستوں کی تو ڈرتا ہے عبث
جس طرح انساں بدلتا رہتا ہے اپنا لباس
روح بھی بالکل یونہی اپنا بدلتی ہے لباس
روح آتش سے کسی حالت میں جل سکتی نہیں
آب کیا سیلاب سے بھی یہ تو گل سکتی نہیں
اس پہ بادِ تند کا کوئی نہیں ہوتا اثر
کاٹنے میں روح کو عاجز ہے تیغ تیز تر
مارنا اس کو الگ ہے دیکھنا بھی ہے محال
ہے وجود اس کا مرے نزدیک ارجن لازوال

جلال افسر نے جس طرح سے مہابھارت کو اردو میں نظم کیا ہے، وہ اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ انھوں نے اس ترجمے کے ذریعے اردو زبان وادب میں ایک گرانقدر اضافہ کیا ہے، لیکن کیا کہا جائے کہ جلال افسر کے اس ترجمے کی جتنی پذیرائی ہونی تھی، وہ ہو نہ سکی۔ وجوہات کچھ بھی ہوں، لیکن زبان وادب میں شاعری کی جو اہمیت ہے، وہ اپنی جگہ مسلم ہے۔جلال افسر نے بہت ہی عام فہم الفاظ کا سہارا لیا ہے، جس سے یقیناً خواص کے ساتھ ساتھ عوام مستفید ہوسکتے ہیں۔ابتدا میں انھوں نے کہاں کی اور کس کی کہانی ہے کے ساتھ کیسے چھوٹے بیٹے کو باپ کی جگہ ملتی ہے، اس حصے کو کچھ یوں نظم کیا ہے۔

ہستنا پور کی کہانی وہاں دو بھائی تھے
ایک نابینا تھے دیگر صاحب بینائی تھے
دونوں بھائی پرتوِ نورِ نگاہِ شاہ تھے
اور جنتا کی نظر میں دونوں ہی ذی جاہ تھے
شاہ جب رخصت ہوا دنیا سے تو اٹھا سوال
کون کرسکتا ہے ملک وقوم کی اب دیکھ بھال
عالموں کے سامنے جب مسئلہ رکھا گیا
کافی غور وخوض کرنے پر ہوا یہ فیصلا
اندھا ہونے کے سبب پہلے کو مستثنیٰ رکھو
اور چھوٹے بھائی کو سب لوگ راجہ مان لو
اس طرح پانڈو کو آخر تاج والد مل گیا
مژدہ یہ سن کر سبھی کا غنچۂ دل کھل گیا

دھرت راشٹر بڑے تھے، بنیادی طور پر تاج والد ان کا حق تھا، لیکن اندھے پن کی وجہ سے انھیں محروم کر دیا گیا اور چھوٹے بھائی پانڈو کو راجہ بنا دیا گیا۔

مہابھارت کے مطالعے سے ہمیں جو سبق ملتا ہے، یقیناً اس پر عمل کر کے بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا۔ کیونکہ ہمارا موجودہ سماج بہت سی برائیوں سے دوچار ہے۔کاش کہ مہابھارت کے درس کو عام کیا جاتا تو ہم بہت سی برائیوں سے بچ سکتے ہیں۔مثال کے طور پر لالچ ایک بری عادت ہے، کیونکہ یہ کسی کو بھی تباہ وبرباد کر دینے کے لیے کافی ہے۔اس سے نہ صرف وہ خود نقصان اٹھاتا ہے، بلکہ حمایتی کو بھی نقصان پہنچاتا ہے۔ مہابھارت میں اگر دریودھن لالچ نہ کرتا اور یدھشٹر اور اس کے بھائیوں کو اس کا حصہ دے دیتا تو لڑائی ہی ممکن نہ ہوتی اور اپنی جان دے کر لالچ کی قیمت نہیں چکانی ہوتی۔اس نے روپیوں کا لالچ کیا اور اپنی جان کے ساتھ ساتھ بہت کچھ نقصان کر گیا۔

مہابھارت سے دوسرا سبق یہ ملتا ہے کہ آپسی اتحاد کبھی ختم نہیں کرنا چاہیے، بلکہ بھائیوں کا اتحاد اور بڑے کو اہمیت دینا بسا اوقات کامیابی کی ضمانت ہے۔مہابھارت میں پانڈووں کو کس طرح سے پیار ومحبت سے رہتے ہوئے دکھایا گیا ہے، ارجن، بھیم، نکل اور سہدیو نے ہمیشہ اپنے بڑے بھائی یدھشٹر کی بات مانی اور بڑا بھائی بھی چھوٹوں پر شفقت ومحبت کا مظاہرہ کرتا رہا۔اس اتحاد کا جو نتیجہ ہے وہ ہم سب کے سامنے ہے۔مہابھارت کے مطالعے سے ایک سبق یہ بھی ملتا ہے کہ حق کی ہمیشہ جیت ہوتی ہے، چاہے کتنی ہی مشقت کیوں نہ اٹھانی پڑے۔ دریودھن کے پاس کس چیز کی کمی تھی۔ فوج، ہاتھی، گھوڑے اور جرنیل کتنی تعداد میں تھے، لیکن اسے شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اسی طرح سے کبھی کسی کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے، بعض حالات میں مذاق ایک بڑی مصیبت کا سبب بن جاتا ہے۔اس کے علاوہ ایک سبق اور ملتا ہے کہ عورتوں کی عزت کرنا چاہیے، کبھی کسی عورت پر بری نگاہ نہیں ڈالنی چاہیے۔گویا کہ مہابھارت میں عقل وخرد رکھنے والوں کے لیے بہت سے درس ہیں۔

مہابھارت میں دریودھن کے مرنے کے ساتھ ہی جنگ کا خاتمہ ہوا۔جنگ کے خاتمے کے بعد بھیشم نے یدھشٹر سے جو پند ونصائح کیے ہیں، وہ یقیناً ایک کامیاب اور باوقار زندگی کے لیے ضروری ہیں۔ اس حصے کو جلال افسر نے آسان لفظوں میں کچھ اس انداز سے شعری قالب میں ڈھالا ہے۔

اس کے مرنے پر ہوا جنگ وجدل کا اختتام
اور مظفر پانڈووں کو مل گئی فتح دوام
بھیشم دادا ان دنوں بھی تیروں کے بستر پہ تھے
اس لیے ان سے یدھشٹر پہلی فرصت میں ملے
بھیشم نے اس دم یدھشٹر کو بتائے کچھ اصول
اور پھر بخشے ہدایت کے انھیں انمول پھول
جن کی خوشبو سے معطر ہوگیا ان کا دماغ
اور تا وقتِ اجل جن سے رہے وہ باغ باغ
بھیشم کے پند ونصائح کا تھا یہ لب لباب
راہِ حق کے راہرو ہوتے ہیں ہر سو کامیاب
بھیشم نے یہ بھی یدھشٹر کو بتایا تھا تبھی
دھرم کے رستے پہ چل کر ملتی ہے آسودگی
اس لیے کرنا حکومت دھرم اور انصاف سے
اور ہر اک کام کرنا دامنِ حق تھام کے
یاد رکھنا یہ ہمیشہ دھرم ہوتا ہے جہاں
کامیابی اور ظفر کا راج ہوتا ہے وہاں
سیکھ کر باتیں بہت سی بھیشم سے وہ باوفا
ہستنا پور کی حکومت اس طرح کرنے لگا

بھیشم جی نے جس طرح سے یدھشٹر کو ایمانداری سے کام کرنے کا درس دیا ہے، اس میں بیک وقت بہت کچھ چھپا ہے۔ایک کامیاب حکومت کے لیے بھیشم جی کے درس بہت معاون ثابت ہوسکتے ہیں، اگر ان پر عمل کیا جائے تو، بصورت دیگر انجام سے بے پرواہ لوگ ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں۔

مہابھارت میں زندگی کے فلسفے کو بہت خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ جلال افسر کا کارنامہ یہ کہ انھوں نے فلسفیانہ بلاغت کے ساتھ پیش کی گئی اس مثنوی کی روح کو اشعار کی شکل میں کچھ اس انداز میں کیا ہے کہ مہابھارت میں پوشیدہ رموز ونکات سے عوام مستفید ہوسکیں۔ یقیناً جلال افسر اپنے اس مقصد میں بہت حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔انھوں نے قصے کو بہت خوبی سے نظم کیا ہے، جس کو پڑھنے سے تسلسل میں کوئی فقدان نظر نہیں آتا۔ البتہ مہابھارت کے جتنے بھی منظوم تراجم منظر عام پر آئے ہیں، ان سب کا موازنہ ہونا چاہیے، تاکہ اندازہ ہوسکے کہ مترجم کس حد تک کامیاب ہوسکے ہے۔

مذہبی کتابوں کے حوالے سے لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ ان صحائف میں انسانیت اور بھائی چارے پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔حقوق العباد سے صرف نظر کرنے کے لیے کسی بھی مذہب نے تائید نہیں کی ہے۔

■

Dr. Shahnewaz Faiyaz
Guest Faculty, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025
Mob.: 9891438766

بلویندر سنگھ

اردو شاعری میں گیتا

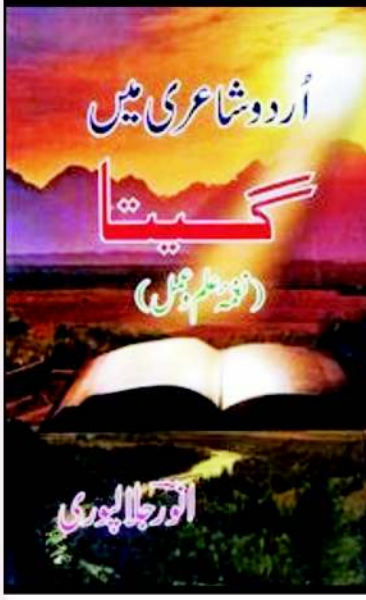

اردو زبان کی شعری و نثری تخلیقات میں ہندو مذہب اور فلسفے کی کار فرمائی ابتدائی زمانے سے ہی نظر آتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو زبان وادب کے قلمکاروں نے ہندوستانی مذاہب کے رموز و نکات سے دلچسپی لی بلکہ اس کے فروغ میں بھی حصہ لیا۔ بالخصوص ہندو مذہب کی کتابوں کے تراجم اِس بات کا بین ثبوت ہیں کہ اردو ادیبوں اور شاعروں نے ہندو مذہبی اور تہذیبی روایات کو اپنی تخلیقی اور تنقیدی تحریروں کا حوالہ بنایا۔

اردو چونکہ ہندوستان میں پیدا ہوئی اور اس کی نشو ونما یہاں کی مٹی میں ہوئی۔ لہٰذا یہاں کے تہذیب وتمدن کے اثرات کا اردو پر پڑنا فطری اَمر ہے۔ ہندوستان کا سب سے بڑا اور قدیم ترین مذہب سناتن مذہب ہے، جس کی مقدس کتابیں سنسکرت میں موجود ہیں۔ اردو زبان کی شعری ونثری تخلیقات میں ہندو مذہب اور فلسفے کی کارفرمائی ابتدائی زمانے سے ہی نظر آتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو زبان وادب کے قلمکاروں نے ہندوستانی مذاہب کے رموز ونکات سے دلچسپی لی بلکہ اس کے فروغ میں بھی حصہ لیا۔ بالخصوص ہندو مذہب کی کتابوں کے تراجم اِس بات کا بین ثبوت ہیں کہ اردو ادیبوں اور شاعروں نے ہندو مذہبی اور تہذیبی روایات کو اپنی تخلیقی اور تنقیدی تحریروں کا حوالہ بنایا۔

آج وید، پران، شری مد بھگوت گیتا، رامائن، مہابھارت، رام چرت مانس جیسی سنسکرت زبان کی کتابیں اردو میں بہ آسانی دیکھی جا سکتی ہیں۔ آزادی سے قبل ہندو، مسلمان دونوں فرقوں نے مل کر اردو علم و ادب کی آبیاری کی تھی۔ اردو کے شعرا و ادبا نے سنسکرت اور ہندوستان کی دوسری مقامی زبانوں کے ترجمے بڑی فراخ دلی سے کیے ہیں۔ اِس سلسلے میں بالخصوص شری مد بھگوت گیتا، رامائن اور مہابھارت کے جتنے بھی ترجمے اردو زبان میں کیے گئے ہیں شاید ہی ہندوستان کی کسی دوسری علاقائی یا مقامی زبان میں کیے گئے ہیں۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ آزادی کے بعد ہندوؤں نے اردو زبان کی ترقی وترویج سے بے اعتنائی سے کام لینا شروع کر دیا ہے اور آج یہ حالت ہے کہ گنگا جمنی تہذیب کی یہ زبان صرف مسلمانوں کی زبان بن کر رہ گئی ہے۔

آزادی سے پہلے ہندوؤں کے بہت سے مذہبی گرنتھوں کے اردو میں منثور یا منظوم ترجمے شائع ہوا کرتے تھے۔ آریہ سماج چوں کہ ہندو سماج کا ایک تبلیغی حصہ تھا اور ہے، اِس لیے آریہ سماج کے لٹریچر کی نشر و اشاعت کے لیے آریہ سماج کی طرف سے باقاعدہ کتابیں، کتابچے اور اخبارات شائع کیے جاتے تھے۔ کانپور کا مشہور علمی و ادبی ماہنامہ 'زمانہ' منشی دیا نرائن نگم کی ملکیت تھا، جس میں شری مد بھگوت گیتا، رامائن، مہابھارت، رام چرت مانس سے متعلق مضامین تواتر کے ساتھ شائع ہوتے رہے۔

شری مد بھگوت گیتا، وہ صحیفۂ آسمانی ہے جو دھرم چھیتر کروچھیتر میں پرم برمھ ماتما روحِ مطلق کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ کرہ ارض پر آباد ان تمام انسانوں کی رہنمائی کے لیے جو پریشان حال ہیں اور فرائض کی ادائیگی سے فراری اختیار کرنے کی حد تک مایوس ہیں، وسیلہ بنا ہے۔ بھگوان شری کرشن اور مہارتھی ارجن کے درمیان کلام متدام، بمقام میدانِ جنگ، مابین افواج مستعد بر سرِ پیکر، بھگوان شری کرشن کے احکام وارشادِ اقدس کو مہارشی 'ویدویاس' نے دیووانی سنسکرت کے ساتھ 700 اشلوکوں میں قلم بند کیا جس کا اسم مبارک 'شری مد بھگوت گیتا' ہے۔ شری مد بھگوت گیتا کے رموزِ یزدانی کو سمجھنے کے لیے کپل منی کے سانکھیہ درشن (فلسفہ) کے بنیادی اصلوں کی جانکاری درکار ہے۔ لیکن ماوشما کے لیے تو ایسی رمز شناسی جوئے شیر لانے کے مصداق ہے۔

آٹھویں صدی عیسوی میں آدی شنکر آچاریہ نے بڑے عالمانہ انداز میں شانکر بھاشیہ، (سنسکرت میں

'بھگوت گیتا' کی تفسیر)لکھی۔ شانکر آچاریہ ایک اعلیٰ سنیاسی بزرگ تھے جن کی تشریحات کو سمجھنا معمولی آدمی کے بس کے باہر کی بات تھی۔ پوری گیتا کی دانشورانہ تشریح 'سانکھیہ یوگ' سے کم نہ تھی۔

جہاں تک اردو ترجمہ کا تعلق ہے اس کی ایک متمول روایت موجود ہے۔ بیسوی صدی میں بال گنگا دھر تلک کے 'گیتا رہسیہ' نے تو بھگوت گیتا کی تشریح کے ذریعے 'کرم یوگ' کا وہ شنکھ ناد کیا کہ ہندوستانی عوام کا ارجن جنگ آزادی کے کروکشیتر میں گانڈیو بکف ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر تو شری مد بھگوت گیتا کی تشریحات و تراجم کی وہ باڑھ آئی کہ گویا ساری عالمی زبانیں سیراب ہو گئیں۔

یہاں اکیسویں صدی میں شری مد بھگوت گیتا کے ایک ایسے منظوم ترجمے کا تذکرہ ضروری ہے جو بے حد مقبول ہوا۔ یہ انور جلالپوری کی 'تفسیر اردو شاعری میں گیتا' ہے۔

''شری مد بھگوت گیتا کا پہلا ترجمہ فارسی میں اکبر کے درباری شاعر علامہ فیضی نے کیا تھا جو منظوم اور آزاد ترجمہ ہے۔ یعنی اس میں ہر شعر کا ترجمہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ پورے پورے باب کے مفہوم کو فارسی میں نظم کر دیا گیا ہے۔''[1]

مندرجہ بالا اقتباس مشہور محقق اور نقاد شارب ردولوی کے مضمون 'نسیم عرفان' سے لیا گیا ہے جو دہلی کے اردو رسالہ 'آج کل' کے اکتوبر 1968 کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ آگے چل کر شارب ردولوی نے اس ترجمے کے علاوہ دو اردو ترجموں کا تذکرہ کیا ہے جو لچھمن پرشاد صدر لکھنوی کی 'بھگوت گیتائے منظوم'، اور عالم مظفر نگری کی 'بھگوت گیتا' کے نام سے ان کی فہرست میں درج ہیں۔

کہاں دربار اکبری، کہاں علامہ فیضی اور کہاں زبان فارسی۔ یہ حسن اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے کہ اکیسویں صدی میں انور جلالپوری نے بھی شری مد بھگوت گیتا کے مفہوم کو آزادانہ طور پر، کئی کئی شلوکوں کے مفہوم کو ایک ساتھ متعدد اشعار میں نظم کر کے مکمل بھگوت گیتا کے مفہوم کا اردو میں منظوم ترجمہ پیش کر دیا ہے۔ علامہ فیضی کی فارسی 'آہنگِ سرمدی' اور اس کے دونوں اردو ترجمے بھلے ہی آج کامیاب یا نایاب ہو چکے ہوں، مگر انور جلالپوری کے ترجمے کے نغمۂ علم و عمل کی بازگشت اردو داں طبقے کے گوش فہم و ہوش میں برابر گونجتی رہے گی۔

انور جلالپوری لکھتے ہیں:

''نہ جانے کیوں بچپن سے ہی شری مد بھگوت گیتا کی باتوں سے اور اس کے واقعات سے مجھے بڑا ذہنی اور دلی لگاؤ تھا۔ گیتا کا فکر اور فلسفہ میرے اعصاب پر چھایا رہا۔۔ پانچ برس پہلے مجھے پھر ایک دھن سوار ہوئی اور میں شری مد بھگوت گیتا کے مطالعے میں لگ گیا۔۔۔ میں نے ہندی اور انگریزی کے ذریعے بہت کچھ سمجھنے کی کوشش کی۔۔۔''[2]

مذکورہ بالا اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مختلف مذہب، کلچر و زبان کے ہوتے ہوئے بھی انور جلالپوری کو شری مد بھگوت گیتا کے فکر و فلسفے سے بچپن سے ہی بڑی گہری دلچسپی تھی۔

یہاں اس بات کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں خود گیتا پڑھنے، سمجھنے اور اس کے راہ عمل پر چلنے کے مراحل سے گذر رہا ہوں اس لیے اس کی دشواریوں سے بخوبی واقف ہوں۔ میں بچپن سے ہی شری مد بھگوت گیتا کا مطالعہ کرتا آ رہا ہوں۔ گیتا میں فلسفۂ عمل، فلسفۂ زندگی اور فلسفۂ کائنات کو انتہائی غنائی جاذبیت، فکری بلندی اور جمالیاتی رعنائی، برنائی اور جس توانائی سے پیش کیا گیا ہے، میں اس صحیفۂ متبرک سے ہمیشہ متاثر ہوتا آیا ہوں۔

بہر کیف، انور جلالپوری نے جس لگن، جس مشقت اور جس عقیدت کے ساتھ جتنی جان دہی سے 'پہاڑ' کو کاٹ کر دودھ کی شاعرانہ نہر' نکالی ہے اور سارے اردو داں طبقے کو شری مد بھگوت گیتا کے فلسفۂ حیات سے روشناس کرایا ہے، وہ بے مثال ہے، انوکھا ہے۔ انوکھا اس لیے ہے کہ شری مد بھگوت گیتا کے منثور اور منظوم تراجم، تشریحات و تصریحات اور ترجمہ در ترجمے کی تعداد سیکڑوں تک پہنچ گئی ہے۔

ڈاکٹر اے جے مالوی جی نے بھگوت گیتا کے جن ترجموں پر تحقیق کیا ان کی ایک لمبی فہرست بہ عنوان 'اردو میں شری مد بھگوت گیتا کے تراجم پر ایک نظر' درج کی ہے۔ انھوں نے 82 تراجم کا تذکرہ کیا ہے۔ جن میں سے 61 تراجم خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ میں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ رضا لائبریری، رام پور میں پانچ، پٹنہ اور الہ آباد میں دو دو ترجمے موجود ہیں۔ الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد میں سات، بھارتی بھون لائبریری، الہ آباد میں چار، ہندوستانی لائبریری الہ آباد اور ہندوستانی اکاڈمی، الہ آباد میں ایک ایک نسخہ موجود ہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے بک ڈپو میں تین اور سینٹرل لائبریری، الہ آباد میں دو نسخے موجود ہیں۔ کتاب میں جو فہرست پیش کی گئی ہے۔

بھر کیف، انور جلالپوری نے جس لگن، جس مشقت اور جس عقیدت کے ساتھ جتنی جان دہی سے 'پہاڑ' کو کاٹ کر دودھ کی شاعرانہ نہر ' نکالی ھے اور سارے اردو داں طبقے کو شری مد بھگوت گیتا کے فلسفۂ حیات سے روشناس کرایا ھے، وہ بے مثال ھے، انوکھا ھے۔ انوکھا اس لیے ھے کہ شری مدبھگوت گیتا کے منثور اور منظوم تراجم، تشریحات و تصریحات اور ترجمہ در ترجمے کی تعداد سیکڑوں تک پہنچ گئی ھے۔

ڈاکٹر حیدر علی نے اپنے مضمون 'اردو میں ہندو مذہبی صحیفوں کی کتابیات' میں شری مد بھگوت گیتا کے 137 تراجم کی فہرست دی ہے، اس فہرست میں ایک ہی ترجمے کے تین سے پانچ ایڈیشن شامل ہیں۔[3]

'بابائے اردو اور براوران یوسف' نام کی اپنی کتاب میں مشہور محقق، تنقید نگار اور تخلیق کار مانک ٹالہ نے 'بھگوت گیتا کے اردو تراجم' کے عنوان سے ایک تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔ جس میں انھوں نے منثور اور منظوم تراجم کے کل 81 نسخوں کا حوالہ دیا ہے۔[4]

راقم الحروف کو بھی خدا بخش لائبریری میں تحقیقی حوالے سے جانے کا موقع ملا اور میری نظر سے 63 ترجمے گزرے ہیں۔ ترسٹھواں ترجمہ بہ عنوان 'بھگوت گیتا قرآن کی روشنی میں' ہے جس کے مصنف ڈاکٹر ساجد احمد صدیقی ہیں اور یہ ترجمہ حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے۔

شری مد بھگوت گیتا کے چند منظوم اور منثور اردو تراجم جن پر میرا تحقیقی کام ہو چکا ہے:

1. شری مد بھگوت گیتا موسوم بہ گنجینۂ معرفت، از رائے بہادر شنکر دیال، در نظامی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ 1931
2. کلام ربانی، از پنڈت یوگی راج نظر سوہانوی، چندر گپت پریس دہلی 1934
3. آہنگ سرمدی (گیتائے منظوم)، از۔ الم مظفر نگری، مکتبۂ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی 1954
4. بھگوت گیتا منظوم موسومہ نسیم عرفان از منشی بشیشور پرساد منور لکھنوی، کورنیشن پرنٹنگ ورکس دہلی 1935
5. بھگوت گیتا منظومۂ تمنا، از منشی رام سہائے تمنا لکھنوی، منشی نولکشور پریس لکھنؤ 1913
6. شری مد بھگوت گیتا با تصاویر موسوم فلسفہ الوہیت، از رائے بہادر پنڈت جانکی ناتھ مدن دہلوی، رام نراین پریس متھرا 1930
7. مہا گیتا، از مہرشی سوامی دیال آتم درشی، دیال پرنٹنگ پریس ہوشیار پور پنجاب 1867

8 بھگوت گیتا (اردو منظوم)،از شان الحق حقی،انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی 2011

9 اردو شاعری میں گیتا (نغمۂ علم وعمل)،ازانور جلالپوری،نعمانی پرنٹنگ پریس گولہ گنج لکھنؤ 2013

10 دل کی گیتا،از خواجہ دل محمد،قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان،نئی دہلی 2004

11 شری مد بھگوت گیتا، ازمنشی پنا لال بھارگو (مرتب) ڈاکٹرعزیز اللہ شیرانی،فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ 2021

12 شری مد بھگوت گیتا (اردو منظوم ترجمہ وتفسیر)،از۔ سروانندکول پریمی،سگما انٹر پرائز،نئی دہلی 2009

13 فضیلت خیال (شری مد بھگوت گیتا کا اردو منظوم ترجمہ)،ازلکشمی چندنسیم نورمحلی 1961

14 مخزن اسرارا،ازپنڈت دیناناتھ مدن معجز دہلوی 1930

15 بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ صلو چودھری، ملکنیم آڈیسی، کلکتہ 2013

16 شری مد بھگوت گیتا، ازپنڈت رام لال پرشاد، نولکشور پریس لکھنؤ 1906

17 صدرکی گیتا موسومہ بھگوت گیتائے منظوم،ازمنشی چھمن پرشادصدرلکھنوی،محبوب المطابع اردو بازاردہلی 1910

18 نغمۂ عرفان،از ٹی این سریواستو، زرنگار باگڑبلی، مدن پورہ، وارانسی 2006

19 شری مد بھگوت گیتا مع گیتا بودھ،از مہاتما گاندھی، پروپرائٹرز جامعہ لمٹیڈ پٹوڈی ہاوس،دریا گنج،نئی دہلی 1991

20 شری مد بھگوت گیتا،ازحسن الدین احمد،قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان نئی دہلی 1997

21 من کی گیتا،ازمن موہن لال چھابڑا، وجیتا آف سٹ پرنٹرز،نئی دہلی 1988

22 گیتاامرت عرف بھگوان کا گیت،ازست پال بھاردواج دیوراج صوری، چوپڑاہ پرنٹنگ پریس باغ کرم بخش جالندھر 1982

23 بھگوت گیتا، ازپنڈت لکشمی نارائن مصرا، ہری کرشن مہتاب وزیراعظم اڑیسہ۔

24 نغمۂ جاوید،از نواب مرزا جعفرعلی خاں اثر لکھنوی، پریم پرنٹنگ پریس جموں۔

25 گیتا اورقرآن،ازپنڈت سندرلال، خدا بخش اورنیٹل پبلک لائبریری، پٹنہ 1999

26 کرشن گیتا،از سیماب اکبر آبادی،انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد 1940

27 بھگوت گیتا مع ترجمہ اردو،از سندر لال،منشی نول کشور پریس لکھنؤ 1912

28 بھگوت گیتا اردو،از بابو بھگوان داس بھارگو پنشر،منشی نول کشور لکھنؤ 1945

29 کرشن گیتا،از لالہ بالکشن بترہ ابر،ہفتہ وار اخبار اقبال ملتان 1939

30 گیتا امرت،از چودھری روشن لال،میسرز جے،ایس سنت سنگھ اینڈ سنز چوک متی لاہور 1942

31 بھگود گیتا (اصلی صورت میں)،از ترجمہ: یشپہ پال باٹیہ،رئیس اردو اکادمی،لاہور 1990

32 شریمد بھگوت گیتا اصلی صورت میں، ازسوامی شریلہ پربھو پاد،بھگتی ویدانت بک ٹرسٹ،ممبئ 2013

33 شری مد بھگوت گیتا (نغمہ یزدانی)،ازڈاکٹر اجے مالوی، ناگری پریس،اللہ پور،الہ آباد 2006

بھگوت گیتا کے مفہوم کوذہن نشین کرکے،اسے دل کی آواز بنا کراشعار کے سرگم میں پیش کرنا انورجلالپوری کا ہی کرشمہ ہے۔ واقعات کا پورا پس منظر اور پھر باتوں باتوں میں ہی شلوک کا ترجمہ (بھاؤانواد ہی سہی) پیش کر دینا کوئی آسان کام نہیں۔نمونے کے طور پر پہلے باب کے اشلوک نمبر ایک کو ہی لیتے ہیں۔سات اشعار میں پس منظر بیان کرتے ہوئے آٹھویں اورنویں اشعار کے ذریعے شلوک کا ترجمہ بھی پیش کردیا ہے۔

کہانی تو سنجے سنا تا رہا
ہے میدان میں کیا بتاتا رہا
وہ میداں جو تھا جنگ ہی کے لیے
وہیں سے جلے دھرم کے بھی دیے 6

خیر، گیتا کے شلوکوں کا ترجمہ یہاں پر شاعر کا مقصد نہیں ہے بلکہ منظوم مفہوم کے ذریعے گیتا کو فہمیدنی بنانے کا مقصد ہے۔غورفرمائیے۔

دھرت راشٹ آنکھوں سے محروم تھے
مگر یہ نہ سمجھو کہ معصوم تھے 6

شعر کا مصرع ثانی کیسا لاثانی ہے۔ایک لفظ 'معصوم' کے ذریعے شاعر نے کتنی معصومیت سے آج کے خودغرض اور موہ میں اندھے انسان کی تصویر کھینچ دی ہے۔دھرت راشٹر کا پورا کردار ہی اِس کی علامت ہے۔جس نے بھارت ہی نہیں دنیا میں مہابھارت چھیڑرکھی ہے۔یہ ہے شاعرانہ انداز۔یہاں پرعرض کرتا چلوں کہ اگر 'دھرت راشٹ' کے بجائے صحیح نام 'دھرت راشٹر' لکھیں اور پڑھیں تو زیادہ اچھا ہوتا۔

'ٹ' اور 'ٹر' کی آواز (تلفظ) سے شعر کے 'وزن 'میں کوئی فرق نہیں پڑے گا اور نام بھی صحیح ہوجائے گا۔

'سانکھیہ یوگ' یعنی علم کا فلسفہ نام کے دوسرے باب میں ارجن شری کرشن بھگوان سے مخاطب ہوکر ''استھت پرگیہ'' یعنی مستحکم روحانیت میں قائم شخص کے بارے میں سوال پوچھتے ہیں۔''اے کیشو،جس شخص کا شعور روحانیت میں قائم ہوتو اس کی کیا علامات ہیں؟ وہ کیسے بولتا ہے اور اِس کی زبان کیا ہے؟ وہ کیسے بیٹھتا ہے اور کس طرح چلتا پھرتا ہے۔'' انورجلالپوری نے بڑے موثر انداز میں ارجن اور شری کرشن بھگوان کے مابین مکالمے کو شعری قالب میں ڈھالا ہے۔اشلوک نمبر 45 ملاحظہ کیجیے۔

یہ سن سن کر ارجن بھی بے چین تھا
سوال اِس نے کیشو سے ہی کر دیا
بتائیں مجھے کون ہے مطمئن
مرے واسطے ہے سمجھنا کٹھن
کسے گیان اور دھیان والا کہوں
حقیقت سمجھ کر میں کس کی سنوں
مکمل انھیں دیکھنا ہے مجھے
وہ کیا ہیں انھیں جاننا ہے مجھے 7

55اشلوک سے شری کرشن بھگوان جی کا جواب شروع ہو جاتا ہے اورکئی باتوں کے بعد 58اشلوک میں کہتے ہیں:

جیسے کچھوا اپنے اعضا کوخول میں سمیٹ لیتا ہے، اِسی طرح جوشخص اپنے حواس کومحسوسات اور تمام اعضا کو ان کی لذتوں کے ساتھ سب طرح سے سمیٹ لیتا ہے تب وہ انسان کامل آگاہی میں قائم ہے۔

شاعرانورجلالپوری نے اپنی سادہ زبان میں اِن فلسفیانہ باتوں کوکتنی آسانی سے سمجھایا ہے اِس کی مثال درج ذیل اشعار میں پیش ہے۔شلوک نمبر 62-58 کے پہلے تین اشعار ملاحظہ کیجیے۔

جو محسوس ہووے کہیں کچھ خطر
تو فوراً سمٹ جائے کچھوے کا سر
یونہی جو بھی انسان ہے خودشناس
وہ رکھتا ہے قابو میں اپنے حواس
جو ہے نیک لالچ سے ہے خودشناس
ہراک طرح کی خواہشوں سے ہے دور 8

قارئین کی دلچسپی کے لیے رئیس پٹھاری کا ترجمہ 'نغمۂ عرفان' سے 54اور 58 اشلوکوں کو درج کیے جارہا ہے۔اشلوک حسب ذیل ہیں۔

اشلوک 54

کہوکیشو ! کیا علامت حالت لاہوت کی
کس طرح بےحس وحرکت،مثل بت بیٹھا کوئی

جو لگائے ہو 'سمادھی' بولتا چلتا ہے وہ
کس طرح آدم 'سمادھی' میں رہا کرتا ہے کوئی[9]

اشلوک نمبر 58

کھینچتا جس طرح ہے اعضائے جسمانی کشف
اور ہو کر مطمئن گم صم پڑا رہتا ہے وہ
فرد بھی جب کھینچ لیتا نفس کو ہے عضو سے
نفس کش ہو کر سمادھی میں چلا جاتا ہے وہ

اگران دونوں تراجم کا موازنہ کیا جائے اور انور جلالپوری کی بات کی جائے تو انھوں نے شری مد بھگوت گیتا کے مفہوم کو جس طرح سے نظم کے قالب میں ڈھالا ہے، اس کا جواب نہیں۔

بھگوت گیتا کے چوتھے باب کا تیرہواں شلوک بڑا ہی معنی خیز ہے۔ وہ ہندوؤں کی ورن ویوستھا (نام نہاد ذاتی نظام) کی تفسیر کرتا ہے۔ اشلوک ملاحظہ کیجیے۔

مری بات سن لے جو ہے مختصر
گنوں اور کرموں کی بنیاد پر
برہمن کوئی، چھتری ہے کوئی
کوئی ویش ہے، شودر بھی ہے کوئی
یہ سچ ہے انھیں میں نے پیدا کیا
کئی رنگ ان میں ہویدا کیا
مگر پھر بھی مجھ کو نہ کرتا سمجھ
ہر اک کرم سے مجھ کو بالا سمجھ[10]

بھگوان نے انسان کے ملکاتِ طبعی، ست، رج اور تم کے جو صفات، جس مقدار میں ان میں موجود ہیں، کے مطابق انھیں چار حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ان کے کام بانٹے۔ یہ برہمن، چھتری، ویش اور شودر کا بٹوارہ 'گن اور کرم' کی بنیاد پر تھا نہ کہ جنم اور خاندان کی بنیاد پر جیسا کہ بعد میں تصور کیا گیا ہے۔

انور جلالپوری نے مفہوم کا ترجمہ تو بالکل صحیح کیا ہے لیکن اپنی کتاب کے صفحہ 128 پر 'گیتا کے مخصوص پہلو' پر روشنی ڈالتے ہوئے، ہندو سماج میں پھیلائے گئے غلط خیال کے مطابق لکھ دیا ہے۔

شری مد بھگوت گیتا میں ہندو سماج کو چار ذاتوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اس خیال خام نے ہندو سماج کو بری طرح منتشر کر دیا ہے اور وہ بھی بھگوان کے نام پر۔ ذائقہ بدلنے کے لیے یہاں میں دو تراجم کے شلوک نمبر 13 پیش کر رہا ہوں۔

بنائے ہیں میں نے جو یہ ورن چار
کہ کرموں گنوں کی ہے تقسیم کار
میں خالق ہوں ان کا مگر بالضرور
عمل سے بری ہوں، تغیر سے دور[11]
چار صیغے میں کیا تقسیم میں نے خلق کو
دیکھ کر موزونیِ وصف و طبع ہر فرد کا
ادا اس کے ہی مطابق کار کی تقسیم کی
کار کردہ سب مرے پھر بھی نہ غافل کردکا[12]

زیر مطالعہ کتاب میں 'بھگوت گیتا کی کہانی'، 'گیتا کا مرکزی خیال' اور 'گیتا کے مخصوص پہلو' وغیرہ کے عنوانات نے کتاب کی افادیت میں اضافہ کیا ہے، خاص طور سے گیتا کے مبتدی قارئین کے لیے 'شری مد بھگوت کے کرداروں کا تعارف' کے عنوان سے غلطیاں در آئی ہیں۔ یہ غلطیاں زیادہ تر (خاص طور سے نام وغیرہ سے متعلق) تلفظ، ہجا اور املا وغیرہ کی وجہ سے، کمپیوٹر ٹائپنگ میں آجاتی ہیں اور پروف ریڈنگ اور پروف چیکنگ میں بھی صحت نہیں ہوتیں۔ اردو رسم الخط میں اعراب اور تشدید وغیرہ کے استعمال میں کوتاہی برتنے سے بھی دقت آتی ہے۔ ایسی صورت میں سنسکرت سے نابلد قاری کے لیے غلط جانکاری فراہم ہو جاتی ہے۔ کچھ مثالیں درج ذیل ہیں۔

صفحہ نمبر 41 پر شری کرشن کا نام لکھا ہے 'ہری کیش' یہ نام ہری کیش نہیں بلکہ ہرشی کیش ہے۔ ہرشیک + ایش = 'ہرشیک' کے معنی اعضا اور 'ایش' کے معنی مالک۔ ہرشیک کے معنی ہوئے اندریوں کا سوامی جو اعضائے انسانی میں چھپی کسی بھی بات کو جانتا ہے اسی کو انتریامی، اور صرف بھگوان کی ہی ذات انتریامی ہو سکتی ہے۔

صفحہ نمبر 42 پر لفظ 'کیشو' کا ہجا تو ٹھیک ہے مگر معنی ٹھیک نہیں ہے۔ کیشی نام سے ایک بڑے طاقتور دیتیہ کو کرشن بھگوان جی نے اپنے عنفوان شباب میں ہی مار گرایا تھا۔ تب نارد منی نے انھیں 'کیشو' نام دیا تھا۔ شری کرشن جی کے تیج یعنی (جاہ و جلال) کو بھی کیش کہتے ہیں اس لیے انھیں کیشو کہا جاتا ہے لیکن کیش یہ معنی بال سے اس نام کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

'اپان' سانس کو اندر کھینچنے والی ہوا نہیں ہوتی۔ سانس لیتے وقت جو ہوا اندر جاتی ہے اسے پران وایو (ہوا) کہتے ہیں۔ اپان وایو (ہوا) جسم کے نچلی طرف جاتی ہے، اس کا مقام ناف سے پاؤں تک ہوتا ہے۔

'سوم دت' کے بیٹے کا نام بھوی شروا نہیں بلکہ 'بھوری شروا' تھا، اور بھی چھوٹی موٹی غلطیاں ہیں جنھیں کمپیوٹر غلطیاں سمجھ کر درگذر کیا جا سکتا ہے، لیکن جو انجان ہیں انھیں غلط جانکاری ملے گی۔ ویسے ناموں کی فہرست کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کی جگہ اگر انور جلالپوری تلمیحات کی وضاحت کرتے تو موزوں ہوتا جیسے پنڈدان، پتر وسرجن، ورن سنکر، اترائن، شرادھ وغیرہ وغیرہ۔ انور جلالپوری پر کرشنا کریم کا خاص کرم تھا کہ انھیں اپنی باتوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی توفیق عطا فرمائی تھی۔

بہرکیف شری مد بھگوت گیتا جیسے عالمی صحیفے کے ترجمے، تبصرے اور تحقیقات تو ہوتے رہیں گے لیکن انور جلالپوری کے ترجمے 'اردو شاعری میں گیتا' کا اپنا منفرد مقام ہے، مرتبہ ہے اور معیار ہے۔ مصنف نے بھگوت گیتا کے نفسِ مطلب کو ذہن میں رکھ کر اور دل میں اتار کر جس چابکدستی سے، عام فہم، بامحاورہ اور خود ساختہ طور پر استعارات سے مزین، ہماری اور آپ کی ہندوستانی زبان میں تفصیل کے ساتھ منظوم پیکر میں پیش کر دیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ میرے خیال میں تو انور جلالپوری نے شری مد بھگوت گیتا کے مفہوم کو ایسی عرفانی مثنوی کے پیرہن میں ملبوس کر دیا ہے کہ قاری کا دماغ سمجھتا رہے، دل محسوس کرتا رہے اور ادراک عرفان کے سمندر میں ڈوبتا اترتا رہے۔

واقعی انوکھا ہے انور جلالپوری کا اندازِ تفہیم اور ادبی کارِ عظیم، رسمی طور پر نہیں بلکہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ 'اردو شاعری میں گیتا' اردو کے خزینۂ ادب میں ایک بیش قیمتی اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

حواشی:

1 مضمون 'نسیم عرفان' شارب ردولوی، رسالہ 'آج کل' نئی دہلی، اکتوبر 1968
2 اردو شاعری میں گیتا (نغمۂ علم و عمل)، از۔ انور جلالپوری نعمانی پرنٹنگ پریس گولہ گنج لکھنو، ص 26
3 مضمون 'اردو میں ہندو مذہبی صحیفوں کی کتابیات' حیدر علی، رسالہ فکر و تحقیق، جولائی۔ ستمبر جلد 23، شمارہ 30، 2020، ص 87
4 بابائے اردو اور برادران یوسف، از مانک ٹالہ، موڈرن پبلشنگ ہاؤس گولا مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی، ص 62-59
5 اردو شاعری میں گیتا (نغمۂ علم و عمل)، از انور جلالپوری، ص 47
6 ایضاً، ص 46
7 ایضاً، ص 91
8 ایضاً، ص 93
9 نغمۂ عرفان، از رئیس پٹھاری، زرنگار باگڑ، مدن پورہ، وارانسی، ص 77-75
10 اردو شاعری میں گیتا (نغمۂ علم و عمل)، از انور جلالپوری، ص 128
11 دل کی گیتا، از خواجہ دل محمد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 2011 ص 66
12 نغمۂ عرفان، از رئیس پٹھاری ص 117

■

Balvinder Singh
Research Scholar, Dept of Urdu, BHU
Varanasi- 221005 (UP)
Mob.:6006038989

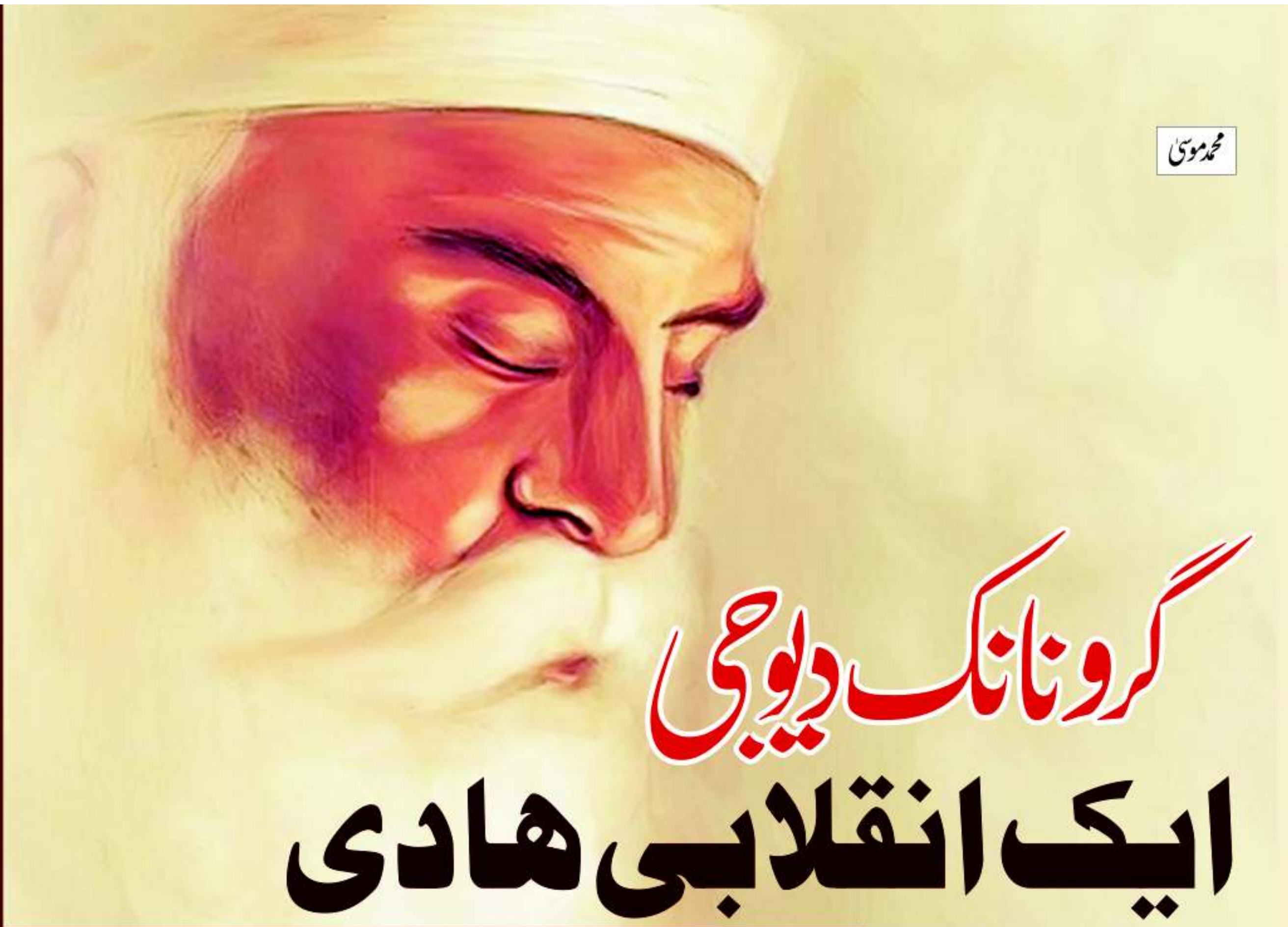

محمد موسیٰ

گرو نانک دیو جی ایک انقلابی ہادی

رواداری اور بھائی چارگی پر مبنی گرو نانک دیو جی کے افکار، نظریات، تصورات اور خیالات آج بھی ہم آہنگی اور یکجہتی کے لیے مشعل راہ ہیں۔ انھوں نے سما ج میں ہونے والی ناانصافی، نابرابری، ظلم و استبداد، مذہبی اور مسلکی تعصب اور استحصال، نسلی و لسانی امتیاز کی لعنتوں کے خلاف جہاد کیا۔ وہ ان برائیوں اور لعنتوں کو انسانی ترقی اور خوشحالی کی راہ میں رکاوٹیں تصور کرتے تھے۔انھوں نے مطلق العنانیت، شہنشاہیت اور طبقاتی نظام کو بھی رد کیا۔

دنیا میں بہت سے ہادی آئے جنھوں نے مذہب و انسانیت کی تعلیم دی اور ان پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی، ان حضرات میں گرو نانک جی ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔گرو نانک دیو جی کو سکھ مذہب میں پہلا گرو اللہ کو مانا جاتا ہے۔آپ نے مذہب کی بنیاد پر انسانوں میں تفریق کو بہت ہی ناروا قرار دیا۔آپ صرف سکھ مذہب کے بانی ہی نہیں بلکہ عظیم شاعر، فلسفی، انسانی و سماجی اصلاح کار اور ایک عظیم ہادی تھے۔

گرو نانک دیو جی مذہبی، سماجی و انسانی مساوات کے علمبردار، قومی یکجہتی، اتحاد، محبت و اخوت کے مشعل بردار، مذاہب و عقائد کے روادار، ذات پات کے خاتمے کے طرفدار اور نشہ وحدت میں سرشار قرونِ وسطیٰ کی مشہور و معروف عظیم المرتبت شخصیت کے مالک تھے۔ان کا وجود انسان دوستی، امن و اتحاد اور یکجہتی کے لیے تاریخی اہمیت کا حامل رہا ہے۔انھوں نے اپنے فلسفہ وحدت، اشعار اور شاہکار کلام کے ذریعے اتحاد کے پیغام کو عام کرکے زمانے میں ایک انقلاب برپا کیا اور ہمارے عظیم الشان موروثی، تہذیبی و ثقافتی اخوت کو از سر نو جلا بخشی ہے۔رواداری اور بھائی چارگی پر مبنی گرو نانک دیو جی کے افکار، نظریات، تصورات اور خیالات آج بھی ہم آہنگی اور یکجہتی کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔انھوں نے سماج میں ہونے والی ناانصافی، نابرابری، ظلم و استبداد، مذہبی اور مسلکی تعصب اور استحصال، نسلی و لسانی امتیاز کی لعنتوں کے خلاف جہاد کیا۔ وہ ان برائیوں اور لعنتوں کو انسانی ترقی اور خوشحالی کی راہ میں رکاوٹیں تصور کرتے تھے۔انھوں نے مطلق العنانیت، شہنشاہیت اور طبقاتی نظام کو بھی رد کیا۔

ان کی ساری زندگی مجاہدانہ رہی اور مساوات اور یکسانیت کا تمام عمر درس دیا۔ انھوں نے اپنے فلسفہ وحدت کے ذریعے تمام انسانوں کو متحد کرنے کی کوشش کی اور مذہبی پیشواؤں کے استحصال، نفرت انگیزی، بغض، کینہ، حسد اور عداوت کے خلاف ہمیشہ برسرپیکار رہے۔ ان کی زندگی کا واحد مقصد انسانی سماج میں امن و سکون، اخوت و محبت، برابری، صلح و رواداری کو فروغ دینا تھا۔گرو نانک دیو جی کسی ایک مذہب یا قوم کے ہادی نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لیے ہدایت کا ذریعہ بنے ہیں۔سوامی ویویکانند نے آپ کے بارے میں کہا کہ ”گرو نانک صاحب کی محبتِ انسانی ایک شاندار اور حیرت انگیز مثال ہے۔“

گرو نانک معاشرے میں دبے اور مظلوم لوگوں خاص کر دلت طبقے کو بااختیار اور پروقار زندگی گذارنے اور ان کے معیار کو بلند کرنے کی تلقین کرتے رہے۔آپ فرماتے ہیں:

”سبھے ساجھیوال سدائن توں کسے نا دِسے باھراجیو“[1]

گرو نانک جی نے اس معاہدے پر تبادلہ خیال کیا جو معاصر سماج پر اثر انداز ہوا اور ان کی فلاح و بہبودی ہو سکے۔ انھوں نے ذات کے نظام کو چیلنج کیا، مساوات کا درس دیا اور خواتین کی آزادی و تعلیم اور مساوی حقوق کی توثیق کے لیے ایک اہم کردار ادا کیا۔آپ کہتے ہیں:

”پرکھ مہہ نار، نار مہہ پرکھا، بجھو برہم گیانی“[2]

گرو نانک دیو جی نے غریب گھرانے میں ایک پٹواری کے یہاں جنم لیا۔شاید قدرت کا یہ تصور تھا کہ یہ

ضروری نہیں کہ اصلاح اور ہدایت کے رہنما و پیشوا کسی بڑے گھرانے یا عالم فاضل خاندان ہی میں پیدا ہوں، لیکن انھوں نے اپنے خلوص و محبت اور میٹھی زبان و کلام کے ذریعے ہر قسم کے لوگوں کے دل میں گھر کر لیا۔ آپ نے ایسی مثالوں کے ذریعے اپنی تعلیم کو پیش کیا کہ وہ دل میں اتر جاتی تھیں۔ مشہور واقعہ ہے کہ جب ان سے جنیو پہننے کے لیے کہا گیا تو انھوں نے اس سے انکار کر دیا، اس لیے کہ انھیں شروع ہی سے ظاہری علامتوں کی نہیں بلکہ چھپی ہوئی حقیقتوں کی تلاش تھی۔ انھوں نے سوال کیا کہ روئی کے دھاگے میں روحانیت کہاں سے آ گئی؟ روحانیت تو رحم، محبت، قناعت، سچائی اور بے نفسی سے پیدا ہوتی ہے۔ جب سیرت ان صفات کے تانے بانے سے ترتیب پائے گی اس وقت انسان انسانیت کے اصلی مقام پر پہنچ سکتا ہے اور من کے امتیاز مٹ سکتے ہیں، جس کے بغیر نہ انسان دوسرے انسانوں کے دلوں میں گھر کر سکتا ہے نہ خدا تک پہنچ سکتا ہے۔

گرو نانک دیو جی نے پنجاب کے لوگوں کو 'ست شری اکال' یعنی خدائے واحد ہی سچ ہے، کا نعرہ دے کر ہندوستان کے ان حصوں تک بھی توحید کا پیغام پہنچایا، جہاں دوسرے صوفیا اور سنتوں کی آواز ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے آپ کی شان میں ایک نظم 'نانک' کے نام سے لکھی اور ان کے پیغامِ توحید کو دیکھتے ہوئے اس کے آخری شعر میں انھیں یوں خراجِ تحسین پیش کیا ہے کہ:

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے[3]

گرو نانک کہتے تھے کہ انسان کا رشتہ براہِ راست خدا سے ہوتا ہے تو پھر انسان اس بحث میں کیوں اپنا وقت برباد کرتا ہے کہ گنگا کا پانی اس کے پاپ دھوئے گا یا نہیں اور کس طرح کا لباس خدا کو زیادہ پسند ہے۔ مذہب کا اصل نام زندگی کا سدھارنا اور اس کو شرافت اور محبت کے اصول اور طریقوں سے آشنا کرنا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ سب سے پہلے اپنا باطن خدا کی مرضی کے مطابق ڈھالو۔ لباس، رسوم اور ظاہری وضع ثانوی بحث ہے۔

انسان اس فرض کو اسی صورت میں ادا کر سکتا ہے جب وہ دلوں کو ملائے اور ان اثرات کو زائل کرے جو انسان کو ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں اور نفرت، تعصب اور تنگ دلی کے زہریلے بیج بوتے ہیں۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے دھرم اور ادھرم کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

"ہر وہ چیز جو دلوں کو ملاتی ہے دھرم ہے، جو دلوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے وہ ادھرم ہے۔"[4]

اسی حقیقت کو مولانا رومیؒ نے یوں بیان کیا ہے کہ:

تو برائے وصل کردن آمدی
نہ برائے فصل کردن آمدی[5]

یعنی اے انسان تو دنیا میں میل محبت بڑھانے کے لیے آیا ہے، پھوٹ ڈالنے کے نہیں آیا۔ گرو نانک کی اخلاقی عظمت اور روحانی کشش کا اصلی راز یہی ہے کہ ان کی تعلیم محبت اور رفاقت کی تعلیم ہے۔ انھوں نے سب انسانوں کو ان کی مشترک انسانیت کی یاد دلائی اور ذات پات، رنگ و روپ، امیری و غریبی کے بھید بھاؤ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ جس وقت اس دیس کے بہت سے باسی مذہب کی سچی تعلیم کو بھلا چکے تھے اور اس کی ظاہری رسموں اور شکلوں میں الجھ کر رہ گئے تھے انھوں نے سب کو یہ قدیم لیکن انقلاب آفریں پیغام سنایا کہ زندگی کا قانون ایک دوسرے سے محبت کرنا ہے۔ یہی محبت کا

> **گرو نانک جی کے عقائد میں اسلام اورہندوازم کا گہرا امتزاج تھا، وہ اللہ اور ایشور کو ایک ہی مانتے تھے اور خدا کو محبت اور محبت کو خدا جانتے تھے اس لیے وہ" اداسی "کے ذریعے ایک انقلابی تحریک کی شکل میں منحرف ہوئے، ان کا تصور انسانیت تھا، جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، یہودی، پارسی سب شامل ہیں۔**

جذبہ ہے جو عقیدت اور بھگتی کی روح بیدار کرتا ہے اور اسی کے ذریعے انسان کی رسائی خدا تک ہوتی ہے۔

گرو نانک جی کے عقائد میں اسلام اور ہندوازم کا گہرا امتزاج تھا۔ وہ اللہ اور ایشور کو ایک ہی مانتے تھے اور خدا کو محبت اور محبت کو خدا جانتے تھے اس لیے وہ" اداسی "کے ذریعے ایک انقلابی تحریک کی شکل میں منحرف ہوئے۔ ان کا تصور انسانیت تھا، جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، یہودی، پارسی سب شامل ہیں۔ اسی لیے انھوں نے کہا تھا کہ "نہ کو ہندو نہ مسلمان" اس بات پر دولت خان نے انھیں اپنے دربار میں طلب کیا اور ان کے الفاظ کا مطلب دریافت کیا جس پر گرو نانک جی نے کہا، "نہ کو ہندو نہ مسلمان"۔ اس پر دولت خان نے کہا کہ شاید ہندو نہ رہے ہوں، مگر مسلمان اپنے ایمان پر قائم ہیں۔ گرو نانک نے اس کے جواب میں کہا کہ خدا کی رحمت کی مسجد ہو اور نماز ہو، اچھا اخلاق تمھارا قرآن ہو اور سادگی اور رحم دلی تمہارا روزہ ہو۔ تمھیں اگر مسلمان ہونا ہے تو ایسے مسلمان بنو۔ نیک اعمال کو اپنا کعبہ بناؤ اور سچ کو اپنا رہبر، اگر ایسا کرو گے تو وہ خدا جو واحد ہے اور اس کا نام حق ہے، تمھیں اپنی رحمت کے سائے میں جگہ دے گا۔ مذہب کا سچا پیرو وہی ہے جو خدا کے کلام پر ایمان لاتا ہے جو سارے مذہبوں کے بانی اور پیغمبر دنیا میں نمود ہوئے پر یقین رکھتا ہے۔ میرے لیے سب یکساں ہیں کیونکہ سب خدا کا پیغام لے کر آئے ہیں۔

آپ کہتے تھے کہ ہم سب بھائی بھائی ہیں۔ گرو نانک جی ذات پات کے خلاف تھے، ان کا نظریہ تھا کہ سب انسان اللہ کے نزدیک برابر ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ:

سب کو اوچا آکھیئے نیچ نہ دیسے کوئے
اک نے بھانڈے ساجیئے اک چانن تہہ لوئے
کرم ملے سچ پایئے دھر بخش نہ میٹے کوئے[6]

آپ کو تصوف اور ویدانت دونوں ہی فلسفوں کی اچھی اور گہری معلومات حاصل تھیں۔ ان کے نزدیک روحانی سفر

کے پانچ مراحل تھے "دھرم کھنڈ، گیان کھنڈ، شرم کھنڈ، کرم کھنڈ اور سچ کھنڈ" بھائی سنتو کھ سنگھ لکھتے ہیں کہ "یہ مراحل صوفیا کے چار مقامات شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت پر مبنی ہیں۔" انھوں نے تمام مذاہب و عقائد میں یکسانیت اور اتحاد کا درس دیا۔ انھوں نے بہت سے مذہبی پیشواؤں کو بھی کافی متاثر کیا۔ آپ نے خاندانی زندگی کو ترک نہیں کیا، گوشہ نشینی یا رہبانیت اختیار نہیں کی، بلکہ وہ شادی شدہ تھے اور اوسط خاندان کے فرد کی طرح سماجی اور اخلاقی فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ ان کی زندگی کا مقصد اور نصب العین خدمتِ خلق تھا وہ کہتے ہیں کہ۔

سیو کیتی سنتوکھییں جنھیں سچو سچ دھیایا
اوہنی منَدے پیر نہ رکھیو کرِ سکرِت دھرم کمایا[7]

گرو نانک نے جہاں آنکھ کھولی تھی وہ پنجاب کا علاقہ تھا،

جو روحانی مراکز کا گڑھ سمجھا جاتا تھا۔ جہاں بڑی قدآور مذہبی شخصیات موجود تھیں۔ جہاں ایک طرف سید علی ہجویریؒ تو دوسری طرف بابا فرید گنج شکرؒ ہیں۔ یہاں مخدوم جہانیاں اور شیخ اسمٰعیل بخاریؒ، حضرت میاں میر ؒ،حضرت شاہ جمالؒ، شیخ سرہندیؒ، جیسی شخصیات اور انتہائی محترم بزرگ موجود ہیں۔ان کی پارسائی، پرہیزگاری اور شفقت کی وجہ سے ہندو و مسلمان یکساں ان سے مستفید ہوتے تھے۔ بابا گرونانک جی بھی ان سے ہمکنار نہ رہ سکے اور اس روحانیت کی طرف مائل ہوتے ہوئے انھوں نے کتابِ زندگی کا مشاہدہ کیا، برسہا برس تک سادھوؤں، سنتوں، صوفیوں اور مختلف مذاہب و عقائد کے رہنماؤں کی صحبت اختیار کی۔ آپ نے صوفی ازم، بدھ ازم، جین ازم اور دیگر مذاہب کے مبلغین، معتقدین، سالکین سے ملاقاتیں کیں، جس سے آپ کی باطنی، روحانی اور عرفانی قوت میں اضافہ ہوتا رہا۔ مسلمان کے ساتھ رہنے کی وجہ سے انھیں اسلامی عقائد کا پورا علم تھا۔ بچپن میں ہی مشہور و معروف، روشن خیال اور وسیع النظر روحانی گرو و رہبر میر حسن سے عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی، اگرچہ وہ خود آپ کے مرید ہو گئے تھے مگر انھوں نے ان کا مذہب قبول نہیں کیا۔ انھوں نے شریعت کو پھلانگ کر طریقت، حقیقت اور معرفت کے مقامات کو عبور کر کے باطنی، روحانی، بورانی اور عرفانی طور پر اللہ کی احدیت، واحدیت اور صمدیت کو تسلیم کر کے سرِ وحدت کا نشہ چکھ لیا تھا اور آخری رسول حضرت محمد مصطفیٰؐ کی عظمت کے حد درجہ معترف تھے، آپ کہتے ہیں۔

لے پیغمبری آیا اس دنیا ماہے
ناؤں محمد مصطفیٰ ہوا بے پرواہے 8

گرونانک جی کا پیغام ہمارے لیے صرف ذاتی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ جماعتی لحاظ سے بھی بہت ضروری اور قابل قدر ہے۔

انھوں نے ایک سچے سکھ کی جو تعریف بتائی ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ ان کو مذاہب کی تعلیم وحدت اور خیر و شر کے بنیادی مفہوم کا کس قدر گہرا احساس تھا۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ ایک سچے سکھ کی کیا خصوصیت ہونی چاہیے۔ انھوں نے فرمایا:

''وہ جو سچا ہو، قناعت کی صفت رکھتا ہو، سب پر دیا کرے، جو لالچ و نفرت سے پاک ہو، جو کسی کو نقصان یا دکھ نہ پہنچائے، جو خواہش کے پھندے سے رِہا ہو چکا ہو، جس کو اپنے اوپر قابو ہو اور خیر و شر میں تمیز کر سکے، جو خدائے بزرگ و برتر کی رضا کے سامنے اپنا سر جھکا دے اور اس کی خوشنودی کو اپنا معیار بنائے۔ ایسا ہی ہم آہنگ شخص اس حلقہ میں شریک ہونے کے قابل ہے۔''9

آپ نے حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کو لازمی مانا ہے۔ گرونانک جی تزکیہ نفس، تصفیہ قلب اور پاکیزگی کے قائل تھے، سماجی بیداری کے علمبردار تھے۔ اسی سماجی بیداری نے انھیں زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ ان کے نغمے اور کلام ابدی ہیں۔ انھوں نے مذہب، سماج اور زندگی کی ظاہرداریوں کو تیاگ دیا تھا۔ اندھے عقائد، مذہبی رسومات اور تعلقات کی مذمت کی ہے، ذات پات کے نظام سے کنارا کشی، خداپرستی اور انسانیت دوستی کے ذریعے انھوں نے سماج میں انقلاب برپا کیا۔ بھگتوں اور صوفیوں نے انھیں ترکِ دنیا و ترکِ عقبیٰ کی شکل دے کر انقلابی ہادی بنا دیا۔

گرونانک جی نے انسانی برابری، سماجی برابری، حق و انصاف اور محبت و اتحاد کو زندگی کا نصب العین تصور کیا۔ وہ عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی دونوں کے دلدادہ تھے یعنی 'یادِ صنم، دیدِ صنم، نادِ صنم اور رضائے صنم' ان کا مقصدِ عبادت اور پیغامِ حیات تھا۔ ان کے یہاں اسلامی تصوف اور ہندو بھگتی کا حسین سنگم اور وصل تھا، جس کی وجہ سے آپ سماج کے ایک انقلابی، روحانی اور عرفانی رہبر مانے جاتے تھے۔ انھوں نے فرسودہ رسومات کی دیواریں ڈھا دیں۔ وہ طبقاتی نظامِ حیات کے مخالف اور بدترین دشمن اور ہندستان کے مظلوم، محنت کش اور استحصال زدہ طبقوں کے پیش رَو تھے۔

آپ کے کلام کی یہ عجیب و غریب خصوصیت ہے کہ وہ اکثر و بیشتر اپنے خالق سے بے نیاز ہو جاتے ہیں اور ان کے کلام کے متعلق صوفی غلام قاسم قادری اپنی تصنیف، ''تذکرہ جناب نانک'' میں کہتے ہیں کہ:

''گرونانک کے شبد پڑھتا ہوں تو ان میں ایسی سچی مذہبیت کا جلوہ نظر آتا ہے کہ اس میں محبت رحم، ہمدردی، خدمت اور زندگی کی سچی قدروں کا وہ پیغام ملتا ہے، جس کے لیے آج دنیا بھوکی اور پیاسی ہے۔ یہ دنیا جس کے دل اور دماغ دونوں امن کی دولت سے محروم ہیں۔ جس کے ہاتھوں میں قوت ہے لیکن اس کا استعمال نہیں آتا۔ جس کی رفتار میں بجلی کی سی تیزی پیدا ہو گئی ہے لیکن منزل مقصود آنکھوں سے اوجھل ہے۔ ان کی تعلیم پکار پکار کر ہمیں یہ سبق سکھاتی ہے کہ زندگی کی اصلیت وحدت اور ایکتا ہے، محبت اور پریم ہے، آپس کی خونریزی اور چھین جھپٹ نہیں، ان کے یہاں آپس کے اختلافات کی کوئی اہمیت نہیں، جو ہمیں انسانیت کی دشمنی پر اکساتے ہیں۔'' 10

گرونانک صاحب کی تعلیمات سے ایک چیز جو سامنے آتی ہے وہ یہ کہ آپ کوئی مذہبی مفکر یا فلسفی نہیں تھے، بلکہ گرونانک کا مذہب، خدا سے، انسانوں سے اور انسانیت سے پیار کا مذہب تھا۔ ان کا مذہب ذات پات، نسل اور ملک کی قید سے آزاد تھا۔ ان کا مذہب ایک عوامی تحریک تھی جس کی بنیاد سیکولرازم اور سوشل ازم کے جدید تصورات پر مبنی تھی، تمام انسانوں کی برابری کی تحریک۔ آپ کی زندگی کے چار سفر بہت مشہور ہیں۔ 'پہلا سفر' انھوں نے بنگال اور آسام کی طرف کیا۔ 'دوسرے' سفر میں وہ تامل ناڈو کی طرف گئے۔ 'تیسری' دفعہ انھوں نے کوہ ہمالیہ میں واقع پہاڑی ریاستوں اور کشمیر سے ہوتے ہوئے تبت کا سفر کیا اور 'چوتھا' سفر بغداد، مکہ، مدینہ اور دیگر عرب ممالک کی جانب کیا تھا۔ ان اسفار سے آپ نے دنیا میں ایک انقلابی پیغام دیتے ہوئے عشقِ الٰہی اور عرفانِ الٰہی کی تلقین کی اور آپ ہمیشہ نیکی کی دعوت دیتے رہے، برائی سے روکتے رہے، ریاکاری سے روکتے رہے، خودغرضی سے روکتے رہے، دنیاداری سے روکتے رہے، جھوٹ کے خلاف تبلیغ کرتے رہے اور کہتے تھے کے سب کو اللہ کے ہاں حساب دینا ہے اور وہاں نجات نیک عمل سے ہوگی۔

مختصراً یہ کہ گرونانک صاحب ایک انقلابی ہادی، عظیم سماجی اصلاح کار ہیں جنھوں نے ایک معاشرے میں موجود خرافات کو دور کر کے مساوات کا درس دیا۔ آپ نے اتحاد اور تعلیم کے لیے جو تحریکیں چلائی تھیں وہ تا قیامت جاری و ساری رہیں گی۔

حواشی

1 شری گروگرنتھ صاحب، انگ 97، محلّہ 5
2 شری گروگرنتھ صاحب، انگ 878، محلّہ 1
3 کلیاتِ اقبال (بانگِ درا)، محمد اقبال، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، 2011، ص 240
4 مذہب کی حقیقت، خلیل شرف الدین، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ دہلی، 2001، ص 15
5 کلیدی مثنوی جلد ۳، مولانا جلال الدین رومی، مترجم مولانا اشرف علی تھانوی، ادارۂ تالیفات ملتان، 2004، ص 98
6 شری گروگرنتھ صاحب، انگ 62، محلّہ 1
7 شری گروگرنتھ صاحب، انگ 466، محلّہ 2
8 جنم ساکھی، بھائی بالا، ص 148
9 گرونانک کا سفر حق، اطہر راز، معیار پبلی کیشنز دہلی، 2009، ص 87
10 تذکرہ جناب نانک، صوفی غلام قاسم قادری، ناشر عبدالکریم امرتسر، 1920، ص 18

■

Mohammad Moosa
Research Scholar, Dept of Urdu
Punjab University
Chandigarh- 1620014 (Punjab)

سلسلۂ صحافت

اردو بلٹز کی صحافت

خواجہ احمد عباس اور آر کے کرنجیا کی خدمات

ذاکر حسین ذاکر

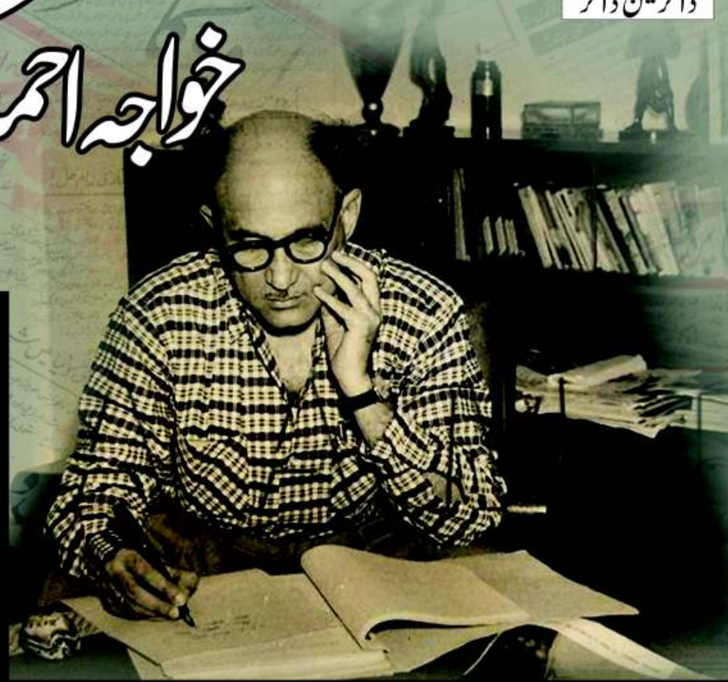

بلٹز اخبار میں صرف خواجہ احمد عباس ہی ایسے صحافی تھے جن کی تحریر پریس میں بھیجنے سے قبل آر کے کرنجیا کے پاس نہیں جاتی تھی۔ اردو میں لاسٹ پیج آزاد قلم کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ آزاد قلم اردو صحافت کا مقبول کالم تھا۔ آزاد قلم میں ادب' فلم' کلچر اور کتابوں کے متعلق ان کی خاص رپورٹ ہوتی تھی۔ ان رپورٹوں میں اتنی معلومات ہوتی تھی کہ ادب اور کلچر میں دلچسپی نہ رکھنے والے بھی اسے پڑھتے تھے۔

آر کے کرنجیا نے بلٹز اردو ویکلی کو ممبئ سے 1964 میں جاری کیا۔ اس کا ایڈیٹر مشہور کہانی کار انور عظیم کو بنایا گیا۔ بلٹز اردو دراصل انگریزی بلٹز کا ہی اردو ورژن Version تھا۔ کرنجیا نے انگریزی بلٹز 1941 میں جاری کیا تھا۔ کرنجیا نے 1930 میں بحیثیت نامہ نگار اپنی صحافت کی شروعات ٹائمز آف انڈیا سے کی تھی۔ مگر دوسری جنگ عظیم میں انھیں احساس ہوا کہ ٹائمز گروپ پر برٹش کمپنیوں اور جوٹ بارنس کا کنٹرول ہے۔ اس لیے یہ اخبار ان کے احساسات کی ترجمانی کے لیے ناکافی ہے۔ وہ اپنے ذہن میں کافی بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ دراصل کرنجیا ایک ترقی پسند' اشتراکی اور سامراج مخالف صحافی تھے۔ ان کے لیے برٹش مفاد پر کام کرنا بہت بھاری پڑ رہا تھا۔ ایک دن چائے کے ٹیبل پر انھوں نے اپنے دوست دینکر وی ناڈکرنی سے کہا کہ کیوں نہ خود کا اخبار جاری کیا جائے۔ اس ٹیبل پر ان کے دوست وی جی ہارنی من بھی بیٹھے تھے۔ ان تینوں کی رضامندی سے اخبار نکالنے کا فیصلہ ہوا۔ انھوں نے اپنے اخبار کا نام بلٹز رکھا۔ یعنی یلغار۔ دشمن پر سیدھا اور اچانک حملہ۔ خواجہ احمد عباس نے بلٹز کے مفہوم کو سمجھاتے ہوئے کہا ہے کہ یہ لفظ جرمن لفظ Blitzkrieg کا مخفف ہے۔ اس لفظ کا سب سے پہلا استعمال 1939 میں پولینڈ کی جنگ میں جرمنی نے کیا تھا۔ یہ جرمنی کا طریقہ جنگ تھا' جسے Blitz lightning and krieg war کہا گیا۔ کرنجیا نے بہت سوچ سمجھ کر اپنے اخبار کا نام بلٹز رکھا تھا۔ انھوں نے پہلے ہی شمارے میں بلٹز کو متعارف کراتے ہوئے لکھا Our Blitz, India's Blitz against Hitler یعنی ہمارا بلٹز ہندوستان کا بلٹز جو ہٹلر کا مخالف ہے۔

جب ہم بلٹز کی فطری بناوٹ کا جائزہ لیتے ہیں تو بلٹز کے نام کی معنویت کا اندازہ لگانا آسان ہو جاتا ہے۔ بلٹز نے ہندوستان چھوڑ وتحریک کا کوریج بلٹز کے طریقے سے کیا۔ ہندوستان چھوڑ وتحریک میں بلٹز کے طریقہ کار نے انگریزی حکومت کو چوکنا کر دیا۔ صرف چار ماہ بعد بلٹز کا سرکولیشن 20 ہزار پہنچ گیا اور پچیس سال بعد اس کا سرکولیشن لاکھوں میں تھا۔ تب کرنجیا نے بلٹز کو People's paper یعنی عوام کا اخبار کہا' جو بنیادی ضرورتوں کی عکاسی کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا تھا۔ بلٹز کے ایڈیٹوریل بورڈ میں اس زمانے کے جانے مانے ترقی پسند اور اشتراکی صحافی شامل تھے۔ اس میں اہم نام خواجہ احمد عباس کا تھا جو لاسٹ پیج لکھتے تھے۔ رمیش سنگھاوی' اے راگھون جیسے صحافی مستقل کالم لکھتے تھے۔ وی ناڈکرنی' وی جی ہارنی من اور ظہیر بابر قریشی مقبول مشہور کالم نگار تھے۔ ظہیر بابر قریشی ZABAK کے فرضی نام سے کالم لکھتے تھے۔ بلٹز کے سرکولیشن' تجارتی تعلقات اور اشتہارات کی دیکھ بھال نادر بومن بہرام کرتے تھے۔

ہندوستانی صحافت میں سنسنی خیزی اور اسٹنگ کا چلن بلٹز نے شروع کیا۔ یہ بلٹز کا مخصوص طریقہ کار تھا۔ کیوں کہ کرنجیا ایک عظیم کہانی کار تھے۔ وہ حالات کو بہت بے خوفی اور جواں مردی سے منعکس کرنے کے عادی تھے۔ نچلے طبقے کے عام انسان مل مزدور اور فٹ پاتھ پر رہنے والوں نے ہمیشہ بلٹز کو اپنے قریب تر پایا ہے۔ کرنجیا نے بلٹز کو ہمیشہ Embedded jounalism یعنی ریاست یا فوجی خبروں کی ترجمانی سے دور رکھا۔ وہ صحیح معنوں میں Embellished jounalism یعنی حسن پرستی اور جدت پسند صحافت کے قائل تھے۔ وہ بلٹز کو سبھی کے لیے یکساں طور پر مقبول بنانا چاہتے تھے۔ تمام ذہنیت کے لوگوں کے لیے چاہے وہ فلم انڈسٹری میں ہوں یا چالوں میں رہنے والے مل مزدور۔ یہی وجہ ہے کہ بلٹز میں ہر طرح کے موضوعات شامل کیے جاتے تھے۔ بلٹز غیر قانونی پیسہ بنانے والوں' دھمکی دینے والوں اور غیر قانونی طریقے سے کام کرنے والوں یعنی Racketeer کا پردہ فاش کرنے پر یقین کرتا تھا۔ بڑے بڑے سیاسی بازیگر' وزرائے اعلیٰ' کابینہ کے وزرا اور گورنر تک بلٹز کی تحقیقاتی رپورٹ کی زد میں ہوتے تھے۔ بلٹز کے قاری عام طور پر

کرنجیا کی ہمت اور جرأت پر حیران رہ جاتے تھے۔اسی حوصلے اور ہمت کی وجہ سے بلٹز چین کی سرحد سے لے کر ممبئ کے مل مزدوروں میں یکساں طور پر مقبول و مشہور تھا۔اکثر ان کے معاملات عدالت میں گئے اور ان کو ہرجانے بھی ادا کرنے پڑے۔مگر وہ کبھی اپنی بے خوفی سے کنارہ کش نہیں ہوئے۔

(R K Karanjia:Living through the Blitz by P.Sainath, The Hindu Daily,Dated-06-02-2008)

70 کی دہائی میں جب انگریزی بلٹز اپنے عروج پر تھااور اس کا سرکولیشن تین لاکھ سے زائد پہنچ چکا تھا۔ لوگوں نے اس کا اردوایڈیشن جاری کرنے کا مطالبہ شروع کیا۔ بلٹز گروپ نے ہندی بلٹز اور مراٹھی بلٹز کی اشاعت پہلے ہی شروع کر رکھی تھی۔بلٹز کے ایک کلیدی رکن خواجہ احمد عباس تھے' جو 1946 سے ہی انگریزی بلٹز کے لیے لاسٹ پیج لکھ رہے تھے۔اردو جاننے والے مشہور کالم نویس ظہیر بابر قریشی نے بھی اردو بلٹز شائع کرنے کا مشورہ دیا۔اس کے علاوہ فلم اور ملک کے دوسرے علاقوں سے بھی بلٹز کے اردو ورژن کی اشاعت کا شدید مطالبہ کیا جارہا تھا۔لیکن کرنجیا کو اردو بلٹز کے لیے کوئی مناسب ایڈیٹر نہیں مل رہا تھا۔ اردو کے لیے کسی ایڈیٹر کی تلاش شروع ہوگئی۔اس موقعے پر ان کی رہنمائی خواجہ احمد عباس نے کی۔انھوں نے اپنے دور کے رشتہ دار انور عظیم کو اس عہدے کے لیے منتخب کرنے کا عندیہ دیا۔ان دنوں وہ دلی میں ریڈیو کے لیے پروگرام مرتب کر رہے تھے۔اس سے قبل انور عظیم ماسکو میں غیر ملکی زبانوں کے مترجم کی حیثیت سے بھی اپنی خدمات پیش کر چکے تھے۔کرنجیا نے انھیں دلی سے بلا کر بلٹز اردو کی ادارت کی ذمے داری سپرد کردی۔انور عظیم 1999-1924 بہار کے گیا ضلع کے رہنے والے تھے۔وہ مشہور اشتراکی ادیب' شاعر اور صحافی تھے۔انور عظیم نے بلٹز شروع کر دیا اور اسے کامیابی کے ساتھ پانچ سال تک چلایا۔ان کی اہلیہ دلی رہ رہی تھیں اور وہ ممبئ رہتے تھے۔اس لیے وہ ذہنی طور پر ممبئ میں کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہو پارہے تھے۔انھوں نے 1968 میں بلٹز کو خیر باد کہہ دیا اور دلی چلے گئے۔کچھ دنوں بعد ان کی تقرری سویت لینڈ میگزین کے تمام پانچوں ایڈیشنوں کے ایڈیٹر کے طور پر ہوگئی۔انور عظیم 1990 تک اسٹائل ایڈیٹر اور تجزیہ کار کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔انھیں 1969 میں سویت لینڈ نہرو ایوارڈ سے بھی نواز گیا تھا۔

انور عظیم کے بلٹز چھوڑنے کے بعد جلدی جلدی کئی ایڈیٹر بدلے گئے۔ 1968 میں سب ایڈیٹر اختر حسن کو بلٹز اردو کا ایڈیٹر بنایا گیا۔مگر وہ بہت کامیاب نہیں ہوئے۔ انھیں ایک سال کے اندر بلٹز چھوڑنا پڑا۔آر کے کرنجیا نے ہندی ایڈیشن کے ایڈیٹر منیش نرائن سکسینہ کو اردو کی بھی ذمے داری دے دی۔اس دوران کرنجیا سنجیدگی سے اس بات پر غور کر رہے تھے کہ اردو ایڈیشن بند کر دیا جائے۔ لیکن جس طرح لوگوں نے اردو ایڈیشن کا خیر مقدم کیا تھا۔اس سے کرنجیا پس و پیش میں تھے۔آخر کار اردو بلٹز کو بلندی تک پہنچانے والے شخص کی دریافت ہوگئی اور وہ تھے حسن کمال جو بلٹز اردو میں 1965 سے ہی کام کر رہے تھے۔حسن کمال مہاراشٹر سرکار کے رسالے ماہنامہ امکان اور سہ ماہی نورس کی ادارت بھی کرتے تھے۔کرنجیا نے 1974 میں حسن کمال کو بلٹز کا ایڈیٹر بنایا دیا۔مشہور صحافی' شاعر اور ادیب حسن کمال 1943 میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔وہ ایک علمی خانوادے کے چشم و چراغ ہیں۔ان کی ابتدائی تعلیم لکھنؤ کے ممتاز انٹر کالج سے ہوئی۔پھر انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے اور ایم اے کیا۔ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جوائنٹ سکریٹری رہے۔یونیورسٹی فیسٹول اور تقریبات میں جم کر حصہ لیا۔حسن کمال ایک مزاحیہ' قہقہے باز' یار باش اور الہڑ قسم کے نوجوان تھے۔ان کی لکھنؤ یونیورسٹی کی شخصیت کے متعلق اقبال مجید نے خوب لکھا ہے۔''لکھنؤ یونیورسٹی کی کینٹین میں پارے کی طرح تھرکتا ہوا' قہقہہ لگاتا' سنجیدہ ہوتا لڑتا جھگڑتا حسن کمال میری آنکھوں کے سامنے بار بار آجاتا ہے۔''

(حاصل سہی از حسن کمال،قلم پبلی کیشنز ممبئ 2005 ص 5)

آج حسن کمال سنجیدہ اور باکمال شاعر ہیں۔ایک اعلیٰ درجے کے صحافی کے طور پر پورے ہندوستان میں جانے جاتے ہیں۔حسن کمال نے بلٹز کی ادارت سنبھالنے کے بعد اسے بلند مقام پر پہنچایا۔اس کے کلیور میں تبدیلی کی اور اس کے صفحات پر نئے مضامین اور مواد شامل کیے۔ اس کے بعد بلٹز کے سرکولیشن میں زبردست اچھال آیا۔ منیش نرائن سکسینہ کے زمانے میں جہاں بلٹز کا سرکولیشن 13 ہزار تھا وہیں حسن کمال کے چارج سنبھالنے کے 6 ماہ بعد اس کا سرکولیشن 27000 تک پہنچ گیا۔مقبولیت کی یہ رفتار بڑھتی رہی اور 1977 کا سال آتے آتے اس کا سرکولیشن 107000 ہو گیا۔ یہ حسن کمال کے ذوق اور جنون کا کمال تھا' جس نے صحافت میں شعریات کا تڑکہ لگایا اور اردو بلٹز کو بھی انگریزی کے ہم پلہ کھڑا کر دیا۔ان کا انداز بلٹز اردو قارئین کو اس قدر پسند آیا کہ قارئین ایک ہفتے تک اس کے تجزیے اور خبروں کو پڑھنے کے منتظر رہنے لگے۔ان دنوں اردو بلٹز کا جادو لوگوں کے سر چڑھ کر بول رہا تھا۔جو لوگ اس کے خریدار تھے' وہ ہفتے کے روز بلٹز کے بنڈل کھلنے سے قبل اسٹال پر قطار میں کھڑے رہتے تھے۔زرد کاغذ پر شائع ہونے والے بلٹز کے صفحات سے یگانگت' رواداری اور دوستانہ لمس کی خوشبو دل تک محسوس ہوتی تھی۔بلٹز کے صفحات 20 ہوتے تھے اور قیمت ایک روپے تھی۔کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ اس کے قاری ایک روپہ کا بلٹز دس روپئے میں خریدنے کے لیے بھی تیار ہوجاتے۔

حسن کمال نے بلٹز میں اس وقت ممبئ کے تمام بڑے لکھاریوں کو جمع کر رکھا تھا۔قیصر مظہر حسین' اختر حسین' امجد عثمان' شفیع محمود ایوبی' اور ہارون رشید جیسے کامیاب صحافی بلٹز کی مستقل ادارت میں شامل تھے۔اس کے علاوہ ندا فاضلی 'ظ انصاری' کیفی اعظمی 'سلمیٰ صدیقی اور سردار جعفری کے مستقل کالم بلٹز میں شائع ہوتے تھے۔ندا فاضلی کا مستقل کالم 'ملاقاتیں' ایک ایسا بد کالم تھا' جس میں ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات کی روداد مزاحیہ انداز میں شائع ہوتی تھی۔اس کالم میں کئی بار تنازعے کا ماحول قائم ہو جاتا۔مگر جیسا کہ اخباری دنیا جانتی ہے آر کے کرنجیا کسی تنازعے سے ڈرنے والے نہیں تھے۔یہ کالم بے خوف و خطر شائع ہوتے رہتے۔کیفی اعظمی نے کچھ سالوں تک مزاحیہ کالم نئی گلستاں لکھا۔وہ ان کالموں میں شیخ سعدی کی شہرہ آفاق کتاب گلستاں کی طرز پر تبصرے کرتے تھے۔حسن کمال نے عالم اسلام' کے نام سے ایک نیا کالم شروع کیا۔اس کالم کو ظفر پیامی لکھتے تھے۔یہ کالم بھی بہت مقبول ہوا۔ان کالموں کے ذریعے ظفر پیامی مسلم ممالک کے مسائل اور دیگر حالات کی جانکاری دیتے تھے۔مسلم ممالک کے مسائل پر ان کے تبصرے بے حد ہمدردانہ اور مثبت ہوتے تھے' جسے اردو قاری بہت پسند کرتا تھا۔ظ انصاری کی خدالگتی کے عنوان سے کالم ادبی تنقید اور تنقیح کا بہترین مظہر تھا۔ کالم کھیل کی دنیا مشہور صحافی ہارون رشید علیگ لکھتے تھے۔ایک مستقل کالم طب یونانی اور اس کی مسیحائی حکیم مختار احمد اصلاحی لکھتے تھے۔ان کالموں کا تذکرہ بے معنی ہے جب تک خواجہ احمد عباس کا مستقل کالم 'آزاد قلم' کا ذکر نہ ہو۔خواجہ احمد عباس کے آخری صفحے کا کمال تھا بلٹز کے ہر زبان کے قاری اسے آخری صفحے سے پڑھتے تھے۔

خواجہ احمد عباس نے 1946 سے بلٹز کے لیے لاسٹ پیج (Last page) لکھنا شروع کیا اور اپنی وفات تک اس سلسلے کو قائم رکھا۔یہ کارنامہ صحافتی تاریخ کا انوکھا

واقعہ ہے کہ کوئی صحافی مسلسل چالیس سال تک پابندی سے کالم لکھتا رہا ہو۔ بلٹز اخبار میں صرف خواجہ احمد عباس ہی ایسے صحافی تھے جن کی تحریر پریس میں بھیجنے سے قبل آر کے کرنجیا کے پاس نہیں جاتی تھی۔ اردو میں لاسٹ پیج آزاد قلم کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ آزاد قلم اردو صحافت کا مقبول کالم تھا۔ آزاد قلم میں ادب، فلم، کلچر اور کتابوں کے متعلق ان کی خاص رپورٹ ہوتی تھی۔ ان رپورٹوں میں اتنی معلومات ہوتی تھی کہ ادب اور کلچر میں دلچسپی نہ رکھنے والے بھی اسے پڑھتے تھے۔ اس کے علاوہ آزاد قلم میں سیاسی تڑکہ ان کے مخصوص انداز میں منعکس ہوتا تھا۔ ان سیاسی کالموں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا جیسے عباس ایک منجھے ہوئے سیاست داں ہیں۔ عباس کا ہاتھ عوام کی کمزور نبض پر ہوتا تھا۔ لوگوں کو یہ محسوس ہوتا تھا جیسے ان کے دل کی بات کہہ دی گئی ہو۔

خواجہ احمد عباس ہفتے میں صرف ایک دن بلٹز کے لیے نکالتے تھے۔ وہ جمعرات کو اپنے اپارٹمنٹ کے پیچھے واقع دفتر میں بیٹھ کر دن بھر آزاد قلم لکھتے رہتے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے دونوں سکریٹری عبدالرحمٰن اور وحید انور موجود ہوتے۔ ان کے ایک سکریٹری شفیق احمد نے بڑے دلچسپ انداز بیان میں ان کے کام کرنے کے طریقے پر روشنی ڈالی ہے۔ ''جمعرات کے دن ناشتہ کرتے ہی عباس صاحب اردو بلٹز کے لیے لکھنا شروع کر دیتے تھے۔ وحید انور صرف جمعرات کے دن آتے تھے اور ان کے مضمون کی نقل کر کے دو کاپیاں بناتے تھے۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد عباس صاحب سو جاتے تھے اور چار بجے اٹھ کر انگریزی بلٹز کے لیے دوسرا مضمون لکھتے تھے، جو عبدالرحمٰن صاحب ٹائپ کرتے تھے۔ ہندی بلٹز کے ایڈیٹر ان کے اردو مضمون کا ہندی میں ترجمہ کرتے تھے۔ وحید انور صاحب ان کے مضمون کو بلٹز کے دفتر دے کر آتے تھے۔ (ماہنامہ نیا دور لکھنؤ۔ مارچ۔ ستمبر 1988 ص 66)

'آزاد قلم' میں خواجہ احمد عباس ملک کے سماجی، اقتصادی اور سیاسی مسائل کا زبردست محاسبہ کرتے تھے۔ اس کالم میں عباس سماجی تفریق، جہالت اور وحشیانہ عقیدت مندی میں غیر انسانی سلوک پر بھی اظہار خیال کرتے تھے۔ کبھی وہ ان مسائل پر طنز کرتے ہیں کبھی اس کی تفسیر بیان کرتے ہیں اور کبھی وہ ان کا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ آزاد قلم کا انداز ہر کالم میں متفرق ہوتا ہے۔ طنزیہ، مزاحیہ اور تبصراتی انداز بھی وہ حسب ضرورت استعمال کرتے تھے۔ وہ اکثر سماجی اصلاحات میں اہم کارکردگی انجام دینے والے افراد کی تعریف و توصیف بھی کرتے تھے۔ جیسے مہاراشٹر کے ایک گاؤں میں لوگوں نے پانی پنچایت کی تشکیل کی تو خواجہ صاحب کی نظر ادھر گئی۔ انھوں نے آزاد قلم میں اس موضوع پر توصیفی اظہار خیال کیا۔ 1975 میں مہاراشٹر میں مراہٹواڑا علاقے میں خزانے کی تلاش کے لیے دوشیزاؤں کی بلی دے دی گئی۔ عباس کے آزاد قلم نے اس اقدام کی سخت مذمت کی۔ انھوں نے لکھا۔ کیا ہم ابھی تک وحشی ہیں۔ انھوں نے اس درندگی کی لعن طعن کی۔ انھوں نے اس کالم میں کرشن چندر کے افسانے ہم وحشی ہیں کا بھی تذکرہ کیا۔

آزاد قلم کے موضوعات خواجہ احمد عباس کی سچائی اور ایمانداری کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کالموں کے موضوعات میں تنوع ہے۔ ان کی سادگی اور پرکاری اور اپنی بات کو نپے تلے غیر شاعرانہ انداز میں کہنے کی ان کی ادا بھی لوگوں کو ان کے کالموں کی طرف کھینچتی تھی۔ خواجہ صاحب کہا کرتے تھے کہ ان کے کالم لوگ اس لیے پسند کرتے ہیں کہ وہ سچ کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔

خواجہ احمد عباس

فلم ساز، کہانی کار، ناول نگار اور معروف صحافی خواجہ احمد عباس 1987-1914 پانی پت کے ایک روشن خیال علمی خانوادے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام غلام السبطین تھا۔ ان کے چچا غلام الثقلین اور غلام الحسنین دونوں تعلیم یافتہ تھے۔ خواجہ احمد عباس کی ابتدائی تعلیم پانی پت میں ہوئی۔ انھوں نے حالی مسلم ہائی اسکول سے ہائی اسکول پاس کیا۔ کہا جاتا ہے کہ بھگت سنگھ ان کے ہم مکتب تھے۔ ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخل کرایا گیا۔ علی گڑھ سے انھوں نے گریجویشن کی ڈگری حاصل کی۔ پھر ایل ایل بی کیا۔ علی گڑھ کے ادبی ماحول میں عباس کی شخصیت میں بہت کچھ تبدیلی آئی۔ وہ علی گڑھ سے ڈرامہ، فلم اور ادبی ذوق کی ہمہ گیری کے ساتھ باہر نکلے۔

خواجہ احمد عباس کو وکالت پسند نہیں تھی۔ انھوں نے صحافت کو بطور پیشہ منتخب کیا۔ وہ علی گڑھ میں یونیورسٹی میگزین کی ادارت کر چکے تھے۔ انھوں نے علی گڑھ میں علی گڑھ اوپنین اخبار شائع کیا، جس میں وہ خود مضامین لکھتے، اسے پریس میں دیتے اور سائکل پر بیٹھ کر اسے تقسیم کرتے تھے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ دہلی چلے گئے، جہاں ان کے والد نے دوا خانہ کھول رکھا تھا۔ عباس نے دہلی سے شائع ہونے والے انگریزی اخبار 'نیشنل کال' میں بطور نامہ نگار کام کرنا شروع کر دیا۔ دراصل صحافت کا الف بے انھوں نے نیشنل کال سے سیکھا۔ لیکن انھیں جلد ہی ممبئی سے شائع ہونے والے ایک اخبار بامبے کرونیکل Bombay Chronicle میں سب ایڈیٹر کی نوکری مل گئی۔ ان کی اصل صحافتی تربیت بامبے کرونیکل میں ہوئی۔ ان کی فلموں سے رغبت کی وجہ بھی بامبے کرونیکل بنا، جس میں انھیں فلمی تبصرے لکھنے کی ذمے داری دی گئی تھی۔ ان کے فلمی تبصرے فلم ساز پسند نہیں کرتے تھے۔ کیوں کہ وہ فلم سازوں کو آئینہ دکھانے کا کام کرتے رہتے تھے۔ فلم سازی کے شعبے میں قدم بڑھانے کی پوری تفصیل انھوں نے اپنی خودنوشت 'جزیرہ نہیں ہوں میں' کے باب 'غیر معمولی ناقد فلم' میں دیا ہے۔

آر کے کرنجیا

رستم خورشید جی کرنجیا موسوم بہ آر کے کرنجیا 2008-1912 ممبئی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے دوست اور گھر والے انھیں پیار سے روسی کہتے تھے۔ وہ پارسی النسل تھے اور انتہائی امیر کبیر پارسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس خاندان نے انگریزی طرز رہائش اختیار کر لی تھی۔ ان کے والد آنکھ کے معروف سرجن تھے۔ انھوں نے ایڈن برگ سے سرجری کی تربیت حاصل کی تھی۔ ان کی والدہ پاکستان کے کوئٹا شہر کی ایک امیر پارسی خاندان کی بیٹی تھیں۔ ان کی تعلیم و تربیت انگریزی گورنیس کے ذریعے ہوئی تھی۔ کرنجیا خاندان اورینٹ کلب کے سامنے چوپاٹی بیچ کے پاس کوینا میریس میں رہتا تھا۔ یہ مکان ان کے نانا نے ان کی والدہ کو شادی کے تحفے میں دیا تھا۔ آر کے کرنجیا کے گھر میں موسیقی کے تمام جدید آلات اور آرام و آسائش کے سامان موجود تھے۔ کرنجیا کی پرورش انگریزی کے اشرافیہ پارسی خاندان میں ہوئی۔ ان کی تعلیم شہر کے بہترین اسکول سینٹ زیویئرس میں ہوئی۔ انھوں نے ولسن کالج سے گریجویشن کیا، لندن جا کر آکسفورڈ سے اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتے تھے مگر ٹائمنر میں ان کی نوکری نے اس خواب کو شرمندہ تعبیر نہ ہونے دیا۔ کرنجیا صرف انگریزی بول سکتے تھے۔ یہ جان کر حیرانی ہوگی کہ بلٹز جیسے عوامی اخبار کے چیف ایڈیٹر ہونے کے باوجود کرنجیا کسی ہندوستانی زبان کا ایک لفظ نہیں جانتے تھے۔ انھیں صرف گجراتی کے چند الفاظ یاد تھے۔

کرنجیا کی وفات یکم فروری 2008 کو ہوئی جب کہ انھوں نے 68 سال قبل یکم فروری 1941 کو بلٹز کا اجرا کیا تھا۔ ایسا اس لیے بھی کہا جا سکتا ہے کہ کرنجیا کی چالیس سال کی زندگی کے شب و روز بلٹز کے ساتھ گزرے تھے۔

■

Zakir Hussain Zakir
Shanti Nagar Mahuabari
Near Sant Pushpa School
Deoria- 274001 (UP)
Mob.: 9415276138
Email.: zakirhssn8@gmail.com

محمد سجاد ندوی

اردو صحافت

ایک جائزہ

صحافت پر اگر گہری نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ اس کی تاریخ انسان کی اکثر ایجادوں کی طرح بہت قدیم ہے۔ محمد عتیق صدیقی اپنی کتاب ہندوستان میں اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں) رقمطراز ہیں:

''حضرت عیسیٰ سے کوئی 751 برس پہلے رومن راج میں روزانہ ایک قلمی خبرنامہ جاری کیا جاتا تھا جس میں سرکاری اطلاعیں نیز میدان جنگ کی خبریں بھی ہوتی تھیں۔ اس قلمی خبرنامے کو ایک ٹاڈیوری کہتے تھے۔ یہ لاطینی زبان کا لفظ ہے جو Acta اور Durna سے مرکب ہے۔ اول الذکر کا معنی ہے کارروائی اور مؤخر الذکر کے معنی ہیں روزانہ۔''

جدید اخبار نویسی کی تاریخ نسبتاً کم پرانی ہے۔ 1566 میں وینس کے شہر میں یہ طریقہ جاری کیا گیا تھا کہ ایک شخص عام شاہِ راہ پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے عوام کی دلچسپی کی خبریں ایک قلمی مسودے سے پڑھ کر سناتا۔ یہ مسودہ حکومت کی نگرانی میں مرتب کیا جاتا تھا۔

پہلا مطبوعہ خبرنامہ 1609 میں جرمنی میں جاری کیا گیا۔ اس کا نام تھا 'اویسا ریلیشن اڈر زیٹنگ (Avisa Relation Order Zeitung) اس طرح مطبوعہ صحافت کی تاریخ تقریباً 377 سال قدیم ہے۔

سولہویں صدی یا سترہویں صدی کے اخباروں کی زیب و آرائش نہ ہوئی تھی جو آج ہمارے اخباروں کی ہوتی ہے، لیکن علم و سائنس کی ترقی اور تجارت کی گرم بازاری کے ساتھ ساتھ واقعات سے باخبر رہنے کا بھی لوگوں میں شوق پیدا ہوا چنانچہ سترہویں صدی میں کچھ لوگوں نے ذاتی طور پر خبر رسانی کا کام یورپ میں شروع کر دیا۔ ملکہ الزبتھ کے عہد میں جس کا انگلستان میں وہی زمانہ تھا جو ہندوستان میں اکبر کا تھا۔ اخبار نویس کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور ان ہی کے عہد میں اخباروں کی آزادی کا حق 1641 میں قانوناً تسلیم کیا گیا۔ اردو صحافت کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا اس نے اس زمانے کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ اس کی تاریخ بہت ہی معرکۃ الآراء رہی ہے۔ 1857 سے لے کر 1935 تک ملک گیر پیمانے پر آزادی اور قومی اتحاد کے لیے جدوجہد کا سہرا اردو صحافت ہی کے سر ہے۔ (اردو صحافت، مرتب: انور علی دہلوی، ص 20)

اردو کے اخبارات اور صحافیوں نے جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان میں ایک صحافی اور مدیر مولوی محمد باقر شہید ہوئے۔ اردو اخبارات ہی کے مالکان اور مدیران سب سے زیادہ سامراجی ظلم و ستم کا نشانہ بنے۔ قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں۔ پریس اور ضمانتیں ضبط ہوئیں۔

لیکن ان سب کے باوجود وہ سنگین سے سنگین حالات کا پامردی اور استقامت کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آج اردو صحافت کو ترقی یافتہ اور بام عروج تک پہنچانے میں ہمارے جن عظیم صحافیوں نے ناقابل فراموش قربانیاں دی ہیں، انھیں خراج عقیدت پیش کرنا ہم لوگوں پر فرض ہے کیونکہ اگر یہ لوگ میدان کارزار میں استقامت کے ساتھ گامزن نہ ہوتے اور اپنی ہڈیوں کو نہ گھلاتے تو ہم ان فیوض و برکات سے قطعی محروم رہتے۔

اردو کے اہم صحافیوں میں مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد عثمان فارقلیط، مولانا عبدالماجد دریابادی، حامد الانصاری غازی کے نام سرفہرست ہیں۔ مولانا محمد علی کے اخبار 'ہمدرد' اور مولانا آزاد کے اخبار 'الہلال' اور 'البلاغ' نے ہمہ گیر شہرت پائی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان ناخوشگوار اور نازک حالات سے دوچار تھا۔ اس احساس کو بیدار کرنے میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد نے نمایاں کردار ادا کیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد ایک عبقری اور یکتائے روزگار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی تحریروں میں طلسماتی اور مقناطیسی کیفیت پائی جاتی ہے۔ مولانا آزاد صحافت، خطابت، قیادت کے بادشاہ تھے۔

صحافت کے میدان میں تو اتنی کم عمری میں آئے کہ علامہ شبلی نعمانی نے انھیں دیکھا تو ان کی بے حد تعریف کی اور کہا کہ تم کسی نمائش میں بطور عجوبہ کے پیش کرنے کے قابل ہو۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافتی، زندگی کا آغاز 'نیرنگ عالم' اور 'المصباح' سے ہوا۔ چند شماروں کے بعد یہ اخبارات بند ہو گئے۔ بعد ازاں وہ 'لسان الصدق' سے وابستہ رہے۔ یہ اس وقت کے چند معیاری پرچوں میں سے ایک تھا، اس پرچے کے جن مقاصد کا مولانا نے اعلان کیا ان میں سے ایک خاص مقصد مسلمانوں کی سماجی اصلاح اور ان میں جدید تعلیم کا شوق پیدا کرنا تھا۔ 'لسان الصدق' سے علاحدگی اختیار کرنے کے بعد مولانا شبلی نے انھیں 'الندوہ' میں بلا لیا، وہاں سے سبکدوش ہوئے تو امرتسر کے 'وکیل' کی ادارت سنبھالی۔ غالباً 'وکیل' میں کام کرنے کے دوران ہی انھیں احساس ہوا کہ اخبار نویس کے ذہن و دماغ اور قلم کو آزاد ہونا چاہیے اور یہ بات اسی وقت ممکن ہے جب اخبار پر اس کی اپنی ملکیت ہو، ان کے خواب کی تعبیر 'الہلال' کی صورت میں سامنے آئی۔

'الہلال' سامنے آیا تو اس نے صحافت کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اردو زبان کا ایک پرچہ حسن صورت اور حسن سیرت سے مزین اور مرصع ہو کر نکلا۔

مولانا ظفر علی خاں کا مولانا آزاد کے زمانے کے بڑے صحافیوں میں شمار ہوتا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے اپنے اخبار 'زمیندار' کے ذریعے ملک و قوم کی بڑی خدمت کی۔ اردو صحافت میں بہت بلند مقام ہے۔ 'زمیندار' میں ان کی نظم و نثر کے جوہر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کی تحریروں نے اردو ادب میں ایک نئی روح پھونک دی۔

مولانا نے انگریزی حکومت کے خلاف بہت بیباکی اور جرأت مندی کے ساتھ لکھا۔ کئی بار ان کے اخبار کو بند کیا گیا اور ضمانتیں طلب کی گئیں لیکن وہ حکومت کے ظلم و ستم سے نہ گھبرائے اور استقامت و پامردی سے مقابلہ کیا۔

سائمن کمیشن کی آمد پر انھوں نے انگریز نوازوں کے خلاف بڑی دلیری سے لکھا۔

مولانا ظفر علی خاں پوری زندگی زبان و قلم سے فرنگیوں کی نیند حرام کر دی۔ ایک سال سے زائد جیل، قرقیاں اور انگریزوں کی دوسری سختیوں سے دوچار رہے، کبھی بھی پایۂ استقامت میں تزلزل پیدا نہیں ہوا۔ ان کی استقامت کا اندازہ ان کے اس شعر سے لگایا جا سکتا ہے ؎

اگر مرنا ہے تجھ کو تو مر صحنِ مقتل میں
ادھر بسمل تڑپتا ہو، اُدھر قاتل پھڑکتا ہو

مولانا حسرت موہانی بڑے صحافی کے ساتھ اچھے شاعر بھی تھے۔'اردوئے معلیٰ' میں اردو صحافت کا لوہا منوایا۔ بڑے بڑے صحافی اور ادیب سرنگوں ہوگئے۔ مولانا اچھے تنقید نگار بھی تھے۔ اپنی شاعری کے ذریعے غزل کو از سرِ نو زندہ کیا۔ حسرت نے غزل کو سمت و رفتار عطا کی۔ اپنے معاصر شعرا کے کلام پر برجستہ اور بے لاگ تبصرے کیے اور ان کی خامیوں کی اصلاح کی۔ حسرت کے تنقیدی نشتر سے مولانا الطاف حسین حالی بھی نہ بچ سکے۔ حالی پر ان کا ایک باریک طنز ملاحظہ ہو:

"بعض اخباروں کی رائے ہے کہ مولانا حالی کی زبان کی لغزشوں پر ان کی قومی خدمات کے لحاظ سے اعتراضات نہیں کرنے چاہیے لیکن مشکل یہ واقع ہوئی ہے کہ ہندوستان کا ایک بڑا حصہ بدقسمتی سے ان کے کمال شاعری کا قائل ہے اور ان کی پیروی کو قابل فخر سمجھتا ہے اور جو کچھ خواجہ صاحب کے قلم سے نکلتا ہے اسے جائز قرار دیتا ہے۔ اسی حالت میں اگر ان سے زبانوں کی کوئی غلطی سرزد ہو ان سے چشم پوشی کرنا گویا دیدہ و دانستہ ایک حصہ ملک کی زبان خراب کرنا ہے۔" (اردوئے معلی، فروری 1904)

آج اردو صحافت ماضی کی شاندار روایات اور قابل فخر ورثے کی مالک ہے۔ اردو صحافت ایک بڑے مشن اور مقصد کے تحت آئی تھی لیکن آزادی کے بعد اردو کو وہ پذیرائی نہ ملی جو اسے ملنی چاہیے تھی۔

یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کہ اردو صحافت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اردو صحافت نے بڑی بڑی تحریکوں اور تنظیموں کو جنم دیا ہے اور اردو اخبارات و جرائد ہندوستان کے گوشے گوشے سے شائع ہو رہے ہیں۔ اردو ہمارے ملک کی آئینی زبان ہے۔ دیگر علاقائی زبانوں کی طرح اس زبان کے لیے کوئی حد بندی نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو کے بولنے اور سمجھنے والے ہندوستان کے ہر گوشے میں موجود ہیں۔ اس لیے اردو کسی فرقے یا مذہب کی زبان نہیں ہے۔ اردو ہندوستان کی ایک مشترکہ زبان ہے۔ اردو ایک تابندہ اور زندہ زبان ہے۔ جس طرح زندگی اور مسائل کا چولی دامن کا ساتھ ہے اسی طرح اردو مطبوعات ہوں یا اردو صحافت ان کو مسائل درپیش ہیں:

1 اردو صحافت کا اگر سرسری جائزہ لیا جائے تو سب سے بڑا مسئلہ تعداد اشاعت کا ہے۔ اردو اخبارات محدود اشاعت ہونے کی وجہ سے انگریزی اور ہندی کے مقابلے میں اردو اخبار کی قیمت زیادہ ہوتی ہے، یہ حقیقت ہے کہ قیمت کا انحصار ریڈرشپ پر ہوتا ہے اور ریڈرشپ کا تعلق اردو اخبارات کے معیاری اور دیدہ زیب ہونے پر منحصر ہے اور المیہ یہ ہے کہ تعلیم یافتہ اردو داں گھروں میں بھی انگریزی اخبار ہی پڑھا جاتا ہے کیونکہ اس میں مواد اور وزن بھی ہے اور قیمت کم ہوتی ہے۔ اگر ہم اردو داں پابندی سے ہر صبح اپنے مطالعے میں اردو اخبار رکھیں تو یقین کیجیے کہ اردو اخباروں کی تعداد بڑھے گی۔

2 اردو صحافت کو درپیش مسائل کی ایک وجہ ہے تشہیر اور پبلسٹی کی کمی۔ جو لوگ تشہیر کی منفعت کو سمجھتے ہیں وہی اپنے کام کو وسعت اور ترقی دیتے رہتے ہیں۔ جبکہ اخبارات و رسائل پبلسٹی کا ایک عظیم ذریعہ ہیں۔ اردو اخباروں اور رسالوں میں اشتہار اتنے شائع نہیں ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اشتہار دینے والا سمجھتا ہے کہ اردو کی ریڈرشپ محدود ہے۔

3 یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اردو خاص طبقے کی زبان بن گئی ہے اور یہ طبقہ مالی و اقتصادی طور پر کمزور ہے۔ ان کے یہاں بچوں کی تعلیم کا رواج کم سے کم ہے کیونکہ زیادہ تر بچوں کو کم عمری سے ہی کسی نہ کسی کام پر لگا دیا جاتا ہے، یہی بچے جب بڑے ہوتے ہیں تو ان کی دلچسپی پڑھنے سے ختم ہو جاتی ہے۔ درحقیقت معاشی کمزوری اور تعلیم کی کمی ہماری توجہ ہٹائے رکھتی ہے۔

اردو صحافی تمام تر نامساعد حالات تکنیکی دشواریوں اور ناخوشگوار ماحول میں بھی اخبارات کو اپنے خون جگر سے آبیاری کرتے رہے ہیں۔ اردو صحافت مشکل ترین دور سے گزر کر آج دیدہ زیب اور رنگین طباعت، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے دور میں پہنچی ہے:

- اردو صحافت کا معیار مزید بلند سے بلند تر ہو سکتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ ذمے داران اور کارکنان اپنے فرائض منصبی کو سمجھیں، ایک دوسرے کا تعاون کریں۔ بہتر اور منتخب مواد اپنے قاری کو فراہم کریں تاکہ ریڈرشپ میں اضافہ ہو، سرکولیشن پر ہی اخبار و رسائل کی کامیابی کا دار و مدار ہوتا ہے۔
- اردو صحافت کے تمام مسائل کی بنیاد صحافیوں کی معاشی حالت ہے، اگر اردو صحافیوں کی اقتصادی حالت بہتر ہے تو صحافت کا معیار عمدہ اور بلند ہوتا ہے۔ صحافیوں میں ہمت افزائی اور حوصلہ ہوتا ہے۔
- اخبارات و رسائل کے ذمے داران اپنے اندر توسیع پیدا کریں۔ آپسی تعاون کے ذریعے ایک دوسرے کے اشتہارات چھاپیں اور اپنے اپنے حلقوں میں دیگر اخبارات و رسائل کو متعارف کرائیں۔ اس اقدام کے ذریعے دہلی، یوپی اور شمالی ہند کے اخبارات و رسائل کے تعارفی اشتہارات جنوبی ہند اور بنگال بہار کے اخباروں اور جرائد میں جگہ پاسکتے ہیں اور ان علاقوں میں متعارف کرایا جا سکتا ہے۔ اس طرح کے آپسی تعاون سے نہ صرف ریڈرشپ بڑھ سکتی ہے بلکہ نجی اداروں سے اشتہاروں کے حصول کے مواقع بھی بڑھ سکتے ہیں۔ ممکن ہے حیدرآباد کا کوئی تاجر بنگال اور دہلی کے اخبارات و رسائل کو اپنی مصنوعات کی تشہیر کے لیے مفید سمجھے اور دہلی و بنگال کے صنعت کار حیدرآباد اور بنگلور کے اخبارات کو اپنی مصنوعات کا ذریعہ بنانا پسند کریں۔

آج یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اردو صحافت بھی دیگر زبانوں کی صحافت سے کم نہیں ہے اور ہمارے یہاں ایسے اخبارات و رسائل شائع ہو رہے ہیں جو اپنے معیار و دلکشی، تنوع اور طباعت کے اعتبار سے دوسری زبانوں کے ہم پلہ ہیں لیکن ترقی کی یہ رفتار جہاں جنوبی ہند میں مسلسل ارتقا کی منزلیں طے کر رہی ہیں وہیں شمالی ہند میں یہ بہت سست اور دھیمی ہے۔ حیدرآباد، بنگلورو اور ممبئی کے اردو اخبارات جس معیار اور زبان و بیان اور لب و لہجے اور حسن انداز کی صحافت کو برت رہے ہیں۔ وہ حسن اور تنوع ہمیں دلی، کولکاتا، پٹنہ اور لکھنؤ کے اخبارات میں دیکھنے کو نہیں ملتا۔ ہر چند کہ اردو صحافت کا آغاز ہی شمالی ہند سے ہوا تھا، لیکن جنوبی ہند کے اخبارات نے جس تیزی سے ارتقا کی منزلیں طے کی ہیں ان کا مقالہ شمالی ہند کے اخبارات نہیں کر پائے اس کی وجوہات تہذیبی، تاریخی اور جغرافیائی تبدیلیوں کے علاوہ معاشی انقلاب کے فیوض بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔

یہ بات قابل اطمینان ہے کہ موجودہ دور کی اردو صحافت اطلاعاتی ٹکنالوجی کے تمام ذرائع کو پورے اعتماد کے ساتھ برت رہی ہے اور گلوبلائزیشن کے اس دور میں اردو اخبارات دیگر ترقی یافتہ زبانوں کے اخبارات کے شانہ بشانہ چل رہے ہیں اور تعداد اشاعت میں بھی بتدریج بہتری آرہی ہے۔

اردو صحافت روز اول سے ہی درپیش مسائل کو حل کرنے میں مصروف نظر آتی ہے اور اپنے اپنے زمانے کے مخلص لوگ کمربستہ ہو کر اس کو پروان چڑھانے کے لیے میدان حق گوئی و بے باکی میں مصروف جہاد دکھائی دیتے ہیں۔ بقول شاعر مشرق علامہ اقبال

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

مراجع و مآخذ

اردو صحافت کے مختلف صفحات سے ماخوذ، مرتب: انور علی دہلوی، شائع کردہ، اردو اکادمی دہلی

■

Mohd Sajjad Nadvi
Uttam Palace, 208 Block-B
Khwajapura, Baily Road
Patna- 800014
Mob.:9934287655

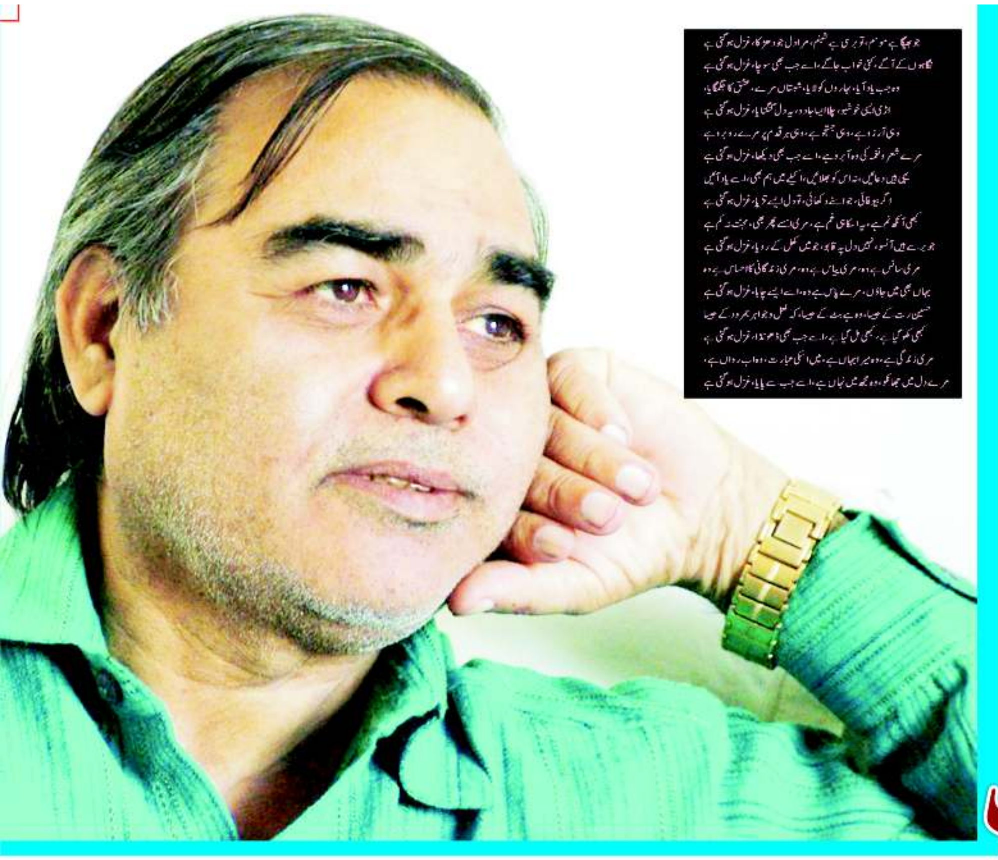

نئی نسل کی نئی غزل اور ابراہیم اشک

شیخ مجیب شیخ ضمیر

1936 میں ترقی پسند تحریک وجود میں آئی اور اردو شاعری میں حقیقت پسندی پر زور دیا جانے لگا۔ غزل کو فراری، انفرادی اور اجتماعی شعور سے بیگانہ اور بے وقعت راگنی قرار دے کر اس کی مخالفت کی گئی کہ غزل میں نئے زمانے کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے اور نت نئے تجربات کی ترجمانی کرنے کی اہلیت نہیں۔ ترقی پسند شعرا میں مجاز لکھنوی، جذبی، ساحر لدھیانوی، احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیض کو چھوڑ کر باقی سب گرجنے والے شعرا تھے۔ لیکن غزل بڑی سخت جان نکلی۔ ان مخالفتوں کے باوجود اس کی بلند آواز نہیں دبی اور جلدی ہی غزل ایک نئے روپ میں دنیا کے سامنے آ گئی اور خود ترقی پسند شعرا نے غزل کے نئے امکانات تلاش کیے اور غزل کی معنویت میں اضافہ کر کے اس کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا۔ جنگ آزادی اور ترقی پسند تحریک کی بنا پر ملک میں سیاسی منظر نامے کی تبدیلی کے ساتھ ہی ادب کا منظر نامہ بھی تبدیل ہوا اور اردو ادب جو دلّی اور لکھنؤ کی چہار دیواری میں گھرا ہوا تھا، تمام حد بندیوں کو توڑتا ہوا سارے ہندوستان میں ایک سیلاب کی طرح بہہ نکلا اور لاہور، عظیم آباد، کلکتہ، حیدرآباد، ممبئی جیسے کتنے ہی ادبی مراکز قائم ہوئے اور ہر ادبی مرکز اپنی چند مخصوص خصوصیات کی بنا پر اپنی ایک الگ شناخت کے ساتھ ظاہر ہوا۔

حصول آزادی کے بعد اردو ادب کی فضا یکسر بدل گئی اور حالات کی سازگاری کے ساتھ ہی ایک بار پھر غزل نے آواز دی کہ میں بھی یہاں موجود ہوں اور اس آواز پر سارا ہندوستان متوجہ ہوگیا۔ اردو غزل ایک مرتبہ پھر اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوئی اور اس مرتبہ اس کے جسم پر ایک نیا پیرہن نظر آیا۔ بعض شعرا نے لسانی شکست وریخت کا نعرہ بلند کر کے غزل کو نقصان پہنچایا لیکن نئی نسل کے بعض غزل گو شعرا اپنے ذاتی کرب، روحانی بحران اور سنگین مسائل کو نئے انداز اور جدید رموز و ملائم کے ذریعے پیش کرنے اور جدید غزل کو نئی رفعتوں اور وسعتوں سے ہمکنار کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ انہی شعرا میں ابراہیم اشک کا بھی شمار ہوتا ہے۔ ہر دور میں چند گنے چنے شاعر ہی ایسے ہوئے ہیں جنھوں نے غزل کو کچھ نیا دیا ہو۔ ولی سے لے کر غالب، میر اور جدید شاعری میں بشیر بدر، ندا فاضلی، احمد فراز تک نئی نسل کے جن شاعروں نے غزل کو نیا کچھ دیا ہے اور اپنی شاعری سے ادبی دنیا میں ایک انفرادیت پیدا کی ہے ان میں ابراہیم اشک (وفات 16 جنوری 2022) کا نام بھی ہے۔

ابراہیم اشک ہر وقت نئی منزلوں کی تلاش میں رہتے ہوئے غزل کے گیسو سنوارنے میں لگے رہے۔ غزل کے فرسودہ مزاج سے ہٹ کر اپنی راہ بنائی۔ وہ روایت کا احترام بھی کرتے ہیں اور نئی راہیں بھی تلاش کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اُن کی غزلوں نے کلاسیکی فارم اور ہیت کو بھی زندہ رکھا ہے اور وہ فکر کی بلندیوں کی طرف بھی رواں دواں ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں۔

غزل نہ ختم ہوئی اشک میر و غالب پر
ہم آئے ہم نے بھی ندرت کی منزلیں دے دیں
کچھ اور اس سے بھی آگے ہمیں تو جانا ہے
غزل کو عظمت و وسعت کی منزلیں دے دیں

ابراہیم اشک جانتے ہیں کہ زندگی میں نئے پن کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر ندی میں نیا پانی آنا بند ہوجائے تو وہ سڑ کر بدبودار ہوجاتا ہے۔ اسی لیے وہ ہمیشہ کچھ نیا تخلیق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

یہ جو ایک پیاس سی رہتی ہے ہمیشہ لب پر
دل میں جلتے ہوئے صحرا کا پتہ دیتی ہے

ابراہیم اشک نے جس عمل سے اپنی شاعری کو حسین بنایا ہے اُسی طرح دعوے بھی کیے ہیں۔ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

ہواؤں پر ہے میرا آشیانہ
اڑا تو باز بنتا جا رہا ہوں
چھوا جسے بھی وہی لفظ بن گیا تاریخ
کہ بے اثر کوئی جملہ ادا کیا ہی نہیں

ان اشعار کو پڑھنے کے بعد کوئی بھی یہ فیصلہ دے سکتا ہے کہ ابراہیم اشک نئی غزل کے معتبر شاعر ہیں۔ اگر شاعر کے اشعار خوبصورت ہوتے ہیں تو اُس کا دعویٰ بھی بے جا نہیں ہوتا۔ وسعتوں کے شاعر ابراہیم اشک کا اندازِ سخن دل و دماغ دونوں کو متاثر کرتا ہے۔ اُن کی غزلوں میں برجستگی اور بے باکی ہے۔ شاعر سماج کا نبّاض ہوتا ہے، سماج کی خوبیوں اور خامیوں کو جس طرح وہ محسوس کرتا ہے اُسی انداز میں پیش کر دیتا ہے۔ ان کی شاعری بسا اوقات دماغ کے اُس حصے کو جگاتی ہے جو وقت اور حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

یہ بازار جہاں ہے بے غرض کوئی نہیں ملتا
پرکھ کر جب تلک دیکھو نہیں سب کو پرے رکھیو
بچے خدا کے نام پہ کچھ بھی نہ ہو سکا
چھوٹے خدا کے نام پہ سجدے بہت ہوئے

ابراہیم اشک کی پوری شاعری میں ان کی انانیت اور خودداری کا عنصر نمایاں ہے۔''الہام اور آگہی' ' کی غزلوں میں انا پرستی کے ساتھ ساتھ عزم حوصلہ، وسعت، عظمت، فکر، معنی اور احساس اپنے چراغ روشن کیے ہوئے ہیں۔خودداری اور انا جسے ہر بڑے شاعر نے اپنے اپنے انداز سے برتا ہے۔خدائے سخن میر میں اگر انا نہ ہوتی تو شاید وہ اتنے عظیم شاعر نہ بنتے۔اور ویسے بھی جس انسان میں خودداری نہ ہو وہ انسان کہلانے کا حق نہیں رکھتا۔پھر جو شاعر عظمت و وسعت کی منزلیں سر کرنا چاہتا ہو اس کے پاس تو انا کا ہونا لازمی ہے۔اشک کے پاس خودداری اور انا کے یہ رنگ نئے انداز سے چھلکتے دکھائی دیتے ہیں۔

کتنی خوددار ہے طبیعت اپنی
ہاتھ اُٹھے تو دعا بھول گئے
کوئی مخلص تو ملے راہ میں بچھ جائیں گے
ورنہ ہم دل کے جلے خوب انا رکھتے ہیں
وہ اگر شاہ جہاں ہے تو قلندر ہم بھی
بارہا پاس سے گزرا اسے پوچھا بھی نہیں

یہ اشعار پڑھ کر ان کی شخصیت اور شاعری کا ایک ایک پہلو سامنے آجاتا ہے۔بلا شبہ اشک نے شاعری کو ایک عبادت کی طرح اپنایا ہے اور ورق ورق پہ اپنے خونِ جگر سے ایک ایک لفظ میں جان پیدا کردی ہے۔ان کی شاعری ماضی کی توانائی، حال کے شعور اور مستقبل کے امکانات پر محیط ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اشک نے اپنے لیے نیا راستہ نکالا جس سے ان کی انفرادیت باقی رہی۔ بنیادی طور پر ان کی شاعری معنویت اور جدیدیت کی آئینہ دار ہے، لیکن روایت کو انھوں نے نظر انداز بھی نہیں کیا۔کیونکہ روایت کی صحت مند پاسداری 'لکیر کا فقیر' ہونے کا نام ہرگز نہیں۔ان کی شاعری طرزِ قدیم میں رنگ جدید کی آمیزش ہے۔ترقی پسندوں اور جدیدیوں کے طوفان اور اس کے مضر اثرات سے انھوں نے اپنی شاعری کو بچا کر نیا رنگ و آہنگ عطا کیا ہے۔وہ خود اس بات کا اظہار اپنی شاعری میں کرتے ہیں۔

جہاں ترقی پسند و جدید ٹھہر گئے
کہ اشک 'آگہی' اپنی وہاں سے آگے ہے

ہر موضوع، ہر خیال کو اُنھوں نے اپنے مخصوص انداز میں باندھا ہے۔خیال کی بلندی اور پستی محدود نہیں۔کرب ذات، خودکلامی، خطابت، ہر کیفیت کو منفرد رنگ دیا ہے۔ ہر مقام پر فنی اصولوں کو پیش نظر رکھ کر لفظوں کو معنی و مفہوم کے ساتھ سپردِ قلم کیا ہے۔یہ فنکار خود ایک باشعور تنقید نگار ہیں۔فن کی باریکیوں اور خامیوں پر گہری نظر ہے اُن کی۔ اس لیے انھوں نے نئے پن کے نام پر غزل کے رنگ و آہنگ کو ترقی پسندوں اور جدیدیوں کی طرح کسی بھی عنوان سے مجروح نہیں ہونے دیا ہے۔بلکہ اپنے اچھوتے اسلوب اور منفرد لب و لہجے سے ایک نیا تاثر پیدا کر کے شہکار اشعار تخلیق کیے ہیں۔

ان کی شاعری کا فکری دائرہ بہت وسیع ہے۔اگر انھوں نے کہیں کسی سے استفادہ بھی کیا تو اسے اپنے منفرد اسلوب کے پیراہن سے اور زیادہ سنوار دیا ہے۔اور اپنے اطراف میں پیش آنے والے واقعات کو بھی من و عن پختہ اور پروقار لہجے میں فنی مینا کاری سے ایک نیا حسن عطا کر کے اپنے فن کا لوہا منوایا ہے۔

ابراہیم اشک نے نئی نسل کی غزل کو اپنے خونِ جگر سے زندگی عطا کی ہے۔زندگی اور ادب کے تمام رنگوں میں اس کو برتنے کی کوشش کی ہے۔ان کی غزل میں روایت اور نئی نسل کی شاعری دونوں موجود ہیں۔ ہر دور کی شاعری کچھ پرانی اور کچھ نئی ہوتی ہے۔پرانی اس لیے کہ روایت سے بالکل منہ نہیں موڑا جاسکتا۔جدید اور نئی نسل کی اس لیے کہ ہر زمانے کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں،اور تمام فنون لطیفہ کی طرح شاعری بھی اس سے منہ نہیں موڑ سکتی۔ ابراہیم اشک کی شاعری میں بھی روایت کی پاسداری اور نئی نسل کے رنگ بھی موجود ہیں۔ ابراہیم اشک ایسے شاعر ہیں جن کی شعر گوئی کی بنیاد ان کے اپنے نظریات اور تجربات پر ہے۔صنفِ غزل کو ان ہی جیسے جیالے جواں فکر شاعروں سے عظمت مل رہی ہے کہ آج کی نئی غزل ایسے ہی بیباک شاعروں کی مرہون منت ہے۔آج کی غزل کا بانکپن بھی قاری کو اتنا ہی متاثر کرتا ہے جتنا ماضی میں کلاسیکل انداز و اسلوب کی شاعری کا بانکپن متاثر کرتا تھا۔محسوسات اور تجربات کو انھوں نے غزل کے نئے سانچے میں بڑی فنکاری سے ڈھالا ہے۔ فکر و احساس اور معنی آفرینی کی تمام وسعتوں اور عظمتوں کو برتتے ہوئے غزل کے سراپا کو ایک نئے پیکر میں ڈھالنے کی ابراہیم اشک نے بھرپور کوشش کی ہے۔ابراہیم اشک کے اشعار جو زندگی کے پراسرار تجربات کا اظہار ہیں،ان کے اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے حوصلے جوان ہیں۔ سینے میں امنگ ہے اور وہ ایک عزم و ہمت والے شاعر ہیں۔انھوں نے اپنی شاعری میں پرانے کلاسیکی طرز و ہیئت کو بھی باقی رکھا اور نئی نسل کی فکری بلندیوں کی طرف بھی رواں دواں ہیں۔

ابراہیم اشک کی شاعری آج کے عہد کی آواز ہے جس عہد میں ہم سانس لے رہے ہیں اس عہد کی دھڑکنیں ان کی شاعری میں جگہ جگہ دکھائی دیتی ہیں۔ان کے اشعار میں پختگی اور گہرائی ہے جو بار بار پڑھنے کا لطف دیتے ہیں۔وہ ہمیشہ مشکل زمینوں پر آسان شاعری کرتے ہیں۔ جو راہ انھوں نے اختیار کی ہے وہ وسعت، گہرائی اور عظمت کی راہ ہے۔ان کی نئی نسل کی غزل عام روش کے خلاف ہے۔یعنی قنوطیت، یاسیت، ناامیدی کے بجائے رجائیت، امید، آزادی پائی جاتی ہے۔ان کی غزلوں میں مثبت خیالات کثرت سے ملتے ہیں۔ساتھ ہی ان کے اشعار ہمیں ہمت، حوصلہ، ناموافق حالات سے نبرد آزما ہونے کی قوت بھی عطا کرتے ہیں۔

ابراہیم اشک نے اپنی غزل کی بنیاد حقیقت نگاری، خلوص، جذبات، عصری معنویت، مشاہدات، تجربات، روایت، تہذیب و تمدن، فکر و فن، ادبی تبدیلیاں، منفرد انداز بیاں، منفرد اسلوب، خالص علامتی لہجہ، وارداتِ قلبی، عام فہم زبان، قومی اور عالمی حسیت، تخلیقی اور فکری شعور، تازگی، شادابی، بے تکلفی، برجستگی، سلاست، روانی، سادگی، انسانیت، محبت، بانک پن، جارحانہ انداز، حوصلہ، ہمت، بہادری، محنت لگن، زبان و بیان، تازہ ترلفظیات، خوبصورت تراکیب، ذہن و دل، فطری جذبہ، صبر و شکر وغیرہ جیسے ستونوں پر رکھی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ابراہیم اشک ایک مقبول غزل گو شاعر تھے۔ انھوں نے غزل کے مزاج میں سادگی اور پاکیزگی کے ساتھ ساتھ اس کے لہجے میں معنویت، وسعت، گہرائی اور گیرائی کو برتا ہے۔جس میں انھوں نے نئی نسل کی عصری حسیت اور مسائل کو سمویا ہے۔ان کو اپنے تخلیقی تجربات کے اظہار پر فن کارانہ قدرت حاصل ہے۔اس قدرت کی بنیاد پر ابراہیم اشک نے روایت اور نئی نسل کی شاعری اور نئی غزل کی توسیع کا فرض انجام دیا ہے۔

ابراہیم اشک نہ صرف ہندوستان بلکہ برصغیر کے تمام نمائندہ شعرا اور خاص طور پر نئی نسل کے شعرا کی صفِ اوّل میں نمایاں مقام کے حامل تھے۔ان کے انتقال کے بعد ان کو ان کی شاعری، تنقید، صحافت اور نغمہ نگاری کے حوالے سے اردو دنیا میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

■

Shaikh Mujeeb Shaikh Zameer
Principle, A M College of Education
Malegaon
Distt.: Nasik-423203 (MS)

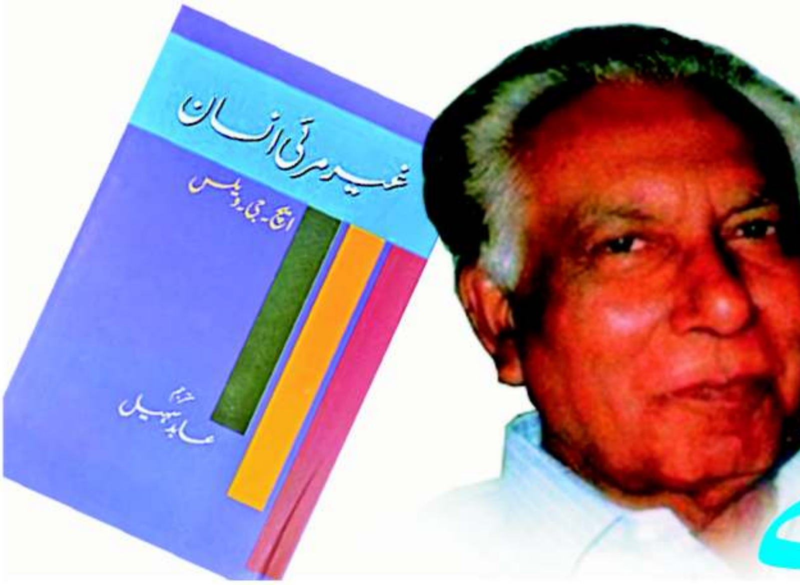

موسیٰ رضا

عابد سہیل کے ترجمے

'مشکل زندگی' بھی خدا کی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ ایسی زندگی کا Servival صرف سبق آموز واقعات ہی ذہن نشین نہیں کراتا بلکہ بہت سے فن بھی سکھا دیتا ہے۔ جتنی مصیبت میں شدت بڑھتی ہے اتنی ہی جوہر کی تابانی میں اضافہ ہوتا ہے۔ جو لوگ کارزارِ حیات کی جد و جہد میں کبھی ہار نہیں مانتے اور زندگی کی مشکل کا رونا رونے کے بجائے تکمیل زیست میں خود اعتمادی سے کام لیتے ہیں، وہ اپنی شخصیت میں خوابیدہ بہت سی صلاحیتوں کو بیدار کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ عابد سہیل نے بھی زندگی کی مصیبت کو موقع کی صورت میں قبول کیا اور صحافی، افسانہ نگار، تنقید نگار، مرتب، مترجم اور کتاب فروش کی حیثیت سے خود اپنی پہچان قائم کی۔ عابد سہیل نے پیش ورانہ طور پر صحافت، شوقیہ افسانہ نویسی اور ضرورتاً ترجمہ نگاری کی۔ لیکن ان تینوں ہی میدان میں وہ یکتائے روزگار ثابت ہوئے۔ ان کی صحافت اور افسانہ نگاری کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن مترجم کی حیثیت سے ان کا ذکر کم ہوا ہے۔ اس مضمون میں مختصراً ان کی ترجمہ نگاری کے بارے میں گفتگو کی جائے گی۔

شروعاتی دور میں عابد سہیل نے اپنے نام کے بجائے اپنے شاگردوں کے نام سے تراجم کیے تھے۔ اپنی ترجمہ نگاری کا ذکر کرتے ہوئے ایک انٹرویو میں انھوں نے کہا تھا کہ:

''ترجمے سے میرا پہلا معاملہ بنگالی کہانیوں کے ذریعے ہوا جو انگریزی میں تھیں۔ ان میں سے ایک ترجمہ پاکستان کے 'ماہِ نو' میں شائع ہوا تھا اور اس کا معاوضہ مجھے بذریعہ منی آرڈر ملا تھا۔''

(افسانیات، عابد سہیل، مرتبہ انیس نصرت، ایم آر پبلی کیشنز نئی دہلی، ص 17)

عابد سہیل کے ترجمے کے اس شوق نے اس وقت مزید تیزی اختیار کر لی جب غیر ملکی ناولوں کو ہندوستانی زبان میں منتقل کیا جا رہا تھا اور قارئین اسے بڑی دلچسپی سے پڑھ رہے تھے۔ لکھنؤ میں اس وقت اردو کتابوں کے اشاعتی اداروں میں کتابی دنیا کافی آگے تھا اور یہ اچھے خاصے ناول چھاپ چکا تھا۔ دیگر زبانوں کے ترجموں کا کام بھی یہاں بڑی تیزی کے ساتھ ہو رہا تھا۔ عابد سہیل نے بھی کئی ناولوں کے ترجمے کیے لیکن یہ سارے کے سارے فرضی نام سے شائع ہوئے۔ سب سے پہلا ترجمہ جو عابد سہیل کے نام سے منظرِ عام پر آیا وہ ایڈگر ویلیس کا ناول تھا جو 1957 میں 'سبز بھوت' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ یہ کتاب انھوں نے اپنے نام سے کیوں شائع کرائی اس بارے میں اپنی خودنوشت میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''کئی ماہ پہلے منظر بھائی نے ایک دن حلیم خاں کے یہاں میرے کمرے میں بید کی ایک الماری میں سلیقے سے سجی ہوئی دس بیس کتابیں اور بستر پر دو چار ادبی پرچے دیکھ کر کہا تھا،'' آپ ادیبوں کی طرح رہنے سہنے لگے، مگر...'' اس کے بعد کے الفاظ یاد نہیں لیکن مطلب اس کا یہ تھا کہ ادیب نہ بن پائے۔ ان کی بات کا میں نے ذرا بھی برا نہ مانا تھا.... مگر دل پر ایک بوجھ سا ضرور بیٹھ گیا تھا۔ ممکن ہے کتاب اپنے نام سے چھپوانے کا محرک یہی بوجھ رہا ہو۔''(جو یاد رہا، عابد سہیل، اردو اکادمی 2012 ص 326)

اس کی اشاعت کے بعد عابد سہیل کو ادیب بننے کا احساس ہونے لگا اور یہ 'فخریابی' انھیں ایک اور ناول کی اشاعت پر آمادہ کرنے لگی۔ جس کے نتیجے میں 'سرخ انگلیاں' نام کا ناول وجود میں آیا۔

اس طرح کے تراجم اتنے کم وقت میں شائع ہوتے کہ لفظ بہ لفظ ترجمہ ممکن نہیں تھا اس لیے فقط مفہوم کی ادائیگی پر ہی توجہ دی جاتی۔ 'سرخ انگلیاں' کے ترجمے میں بھی اسی طریقہ کار سے کام لیا گیا۔ اس ناول کے اختتام پر ڈاکو پانی کے جہاز سے فرار ہوجاتے ہیں۔ جب عابد سہیل ترجمہ کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچے کہ جہاں ڈاکوؤں کے جہاز کو سمندر میں چلانا تھا تو انھیں کوئی ترکیب نہیں سوجھی کیونکہ کہانی کا سارا تانا بانا تو لکھنؤ شہر کی آب و ہوا میں بنا گیا تھا۔ فی الحال کے لیے انھوں نے جہاز کو گومتی ندی میں فروکش کر دیا کہ بعد میں کوئی ترکیب نکال لی جائے گی۔ مگر جہاں پروف ریڈنگ کی گنجائش نہ ہو وہاں 'دوبارہ' کا وقت کہاں آتا ہے۔ لہٰذا ناول چھپ گیا اور ڈاکو اسی گومتی ندی سے پانی کے جہاز کے ذریعے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ کئی مہینہ بعد کتابی دنیا جہاں سے یہ ناول شائع ہوا تھا ڈھاکہ سے ایک خط عابد سہیل کے نام آیا اس میں انھوں نے لکھا تھا:

''میں بھی لکھنؤ کا رہنے والا ہوں۔ شہر کی ترقی کا حال معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی، میرے زمانے میں گومتی ایک چھوٹی ندی تھی جو اب ترقی کر کے ماشاء اللہ سمندر بن گئی ہے۔ کبھی لکھنؤ جانا ہوا تو ضرور دیکھوں گا''

(جو یاد رہا، عابد سہیل، اردو اکادمی 2018 ص 328)

عابد سہیل کے باقی سارے ترجموں کی طرح یہ کتاب بھی اب دستیاب نہیں۔ مصنف نے اپنی خودنوشت میں نشاندہی کی تھی کہ کچھ عرصے تک علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری کی کیٹ لاگ میں اس کتاب کا نام دیکھا گیا تھا۔ ان کے علاوہ عابد سہیل کے دیگر دستیاب تراجم کا تعارفی ذکر مندرجہ ذیل ہے۔

غیر مرئی انسان

عابد سہیل نے ایچ جی ویلس کے ناول The Invisibel man کا ترجمہ غیر مرئی انسان کے نام سے کیا جس کو کافی شہرت ملی۔ اس ناول کا ترجمہ تقریباً نصف صدی میں مکمل ہو پایا۔ اس کی کہانی بھی عابد سہیل کی باقی ساری کہانیوں کی طرح ہی بڑی دلچسپ ہے۔

عابد سہیل سے پہلے اسی ناول کے دو ترجمے ہو چکے تھے جس میں ان کے دوست کا ترجمہ بھی شامل تھا لیکن

دونوں ہی ترجمے ناقص تھے۔ ایک بہتر ترجمے کو منصۂ شہود پر لانے کی غرض سے عابد سہیل نے اس ناول کا ترجمہ شروع کر دیا۔ لیکن مصنف کا وہ وقت نہایت سخت تھا جس میں 'فرصت' بہت کم تھی اور یہ تمام کام وقت اور سکون طلب ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ کام بیس پچیس صفحات سے آگے نہ بڑھ سکا۔ یہ صفحات لفافے میں محفوظ عابد سہیل کے ساتھ زندگی کے نشیب و فراز سے گزرتے رہے اور ایک گھر سے دوسرے گھر منتقل ہوتے گئے۔ آخر کار وہ اپنے علی گنج والے مکان میں رہنے لگے۔ ایک دن اس ہمراہ لفافے کی موجودگی کے احساس سے انھیں نہال کر دیا اور عابد سہیل نے اس کے دوبارہ ترجمہ کرنے کا فیصلہ تو کر لیا لیکن آنے والی مصیبتوں نے انھیں پریشان کر دیا کئی بار تو راہ فرار اختیار کرنے کا بھی خیال آیا مگر 'ہمت مرداں مدد خدا' کے سہارے ڈٹے رہے۔ آخر کار 2016 میں 'غیر مرئی انسان' کے نام سے موسوم یہ ناول منظر عام پر آ گیا۔ 261 صفحات میں پھیلے اس ناول کو مترجم نے تتمہ سمیت 29 حصوں پر منقسم کیا ہے۔ عابد سہیل نے جب اس ناول کا ترجمہ شروع کیا تھا اس وقت سوائے دو ناولوں کے ترجموں کے اور کوئی کتاب ان کے نام سے شائع نہیں ہوئی تھی مگر جب انھوں نے اس کام کو مکمل کیا تو وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے، یہاں تک کہ ان کے تینوں افسانوی مجموعے شائع ہو چکے تھے۔ غرض یہ کہ وہ ایک مکمل ادیب بن چکے تھے جن کی تحریریں حوالوں کے طور پر پیش کی جانے لگی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس ترجمے میں تخلیقیت کا رچاؤ دیکھنے کو ملتا ہے جو مترجم کی زبان پر قدرت اور فن کاری پر داد دینے کے لیے اکساتا ہے۔ کتاب کا یہ اقتباس دیکھیے جس میں تخلیقی فضا کتنی حاوی نظر آ رہی ہے

''اس وقت جب رات کا اندھیرا آنکھیں ملتا ہوا بیدار ہو رہا تھا اور آئی پنگ نے بینک کی چھٹی کے دن کی تباہ حال چیزوں پر خوفزدہ انداز میں نظر ڈالنا شروع ہی کیا تھا، ایک پستہ قد لیکن گٹھے ہوئے جسم کا شخص جو نیچا کچھا ریشمی ہیٹ لگائے تھا خاکستری چھال والے درختوں کے پیچھے بلام بر یہرسٹ جانے والی سڑک پر صبح کے دھندلکے میں قدم بڑھا رہا تھا۔ اسے چلنے میں تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ تین کتابیں لیے تھا جو ایک طرح کی چمک دار سجاوٹی ڈوری سے ایک ساتھ باندھ دی گئی تھیں۔ اس کے پاس ایک اور بنڈل بھی تھا جو ایک نیلے رنگ کے میز پوش میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کے سرخ تمتماتے ہوئے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ تھکا ہوا ہے، جلدی میں ہے اور پریشانی اور اضطراب کے عالم میں بھی۔''

(غیر مرئی انسان، ایچ جی ویلس، مترجم عابد سہیل، ایم آر پبلی کیشن 2016، ص 116)

عابد سہیل نے پیش لفظ میں اس ناول کے بارے میں چند صفحات میں گفتگو بھی کی ہے۔ اس کے کمزور پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ناول کا بیانیہ خوب ہے اور مکالمے وقت و ضرورت کے مطابق استعمال کیے گئے ہیں جس سے ناول قاری کو اپنے سے جدا ہونے نہیں دیتا۔ یہ بتا پانا بھلے ہی مشکل ہو کہ 'غیر مرئی انسان' Tragedy ہے یا Comedy مگر اس ناول کی کامیابی اور مقبولیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

درد کا شجر

افسانہ اور ناول سے جب 'کہانی پن' رخصت ہو گیا تو ایسا فکشن سامنے آیا جس میں کرداروں کی سسکیاں ہٹ اور محبت کی سرگوشیاں تک سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ ظاہر ہے ان کہانیوں کی عمر بہت نہیں تھی لہٰذا پھر سے کہانی اپنی اصل راہ کی طرف پلٹی اور افسانوں وغیرہ میں پیار بھری باتیں حیرت و استعجاب کے ساتھ کی جانے لگیں۔ ان ہی دنوں عابد سہیل نے بہت سے ایسے افسانے لکھے تھے جنھیں 'محبت کے افسانے' کہا گیا۔ یہ وہی دور تھا جس میں عابد سہیل طبع زاد افسانے لکھ بھی رہے تھے اور دوسری زبانوں کے تراجم بھی کر رہے تھے۔ ان کی ترجمہ کردہ روسی، برطانوی، بنگلہ، فرانسیسی کہانیاں کئی رسالوں میں شائع بھی ہو چکی تھیں مگر ان سب کی کوئی نقل عابد سہیل کے پاس نہیں تھی اور جو تھیں وہ انتقال مکانی کی نذر ہو گئی تھیں بس موپاساں کا افسانہ 'ڈاکٹر' جسے ہندوستانی رنگ ڈھنگ میں لکھا گیا تھا محفوظ رہ گیا۔ پھر آٹھ دس افسانے اور یاد آ گئے جس میں کیتھرائن مینسفیلڈ کا 'سیب کا درخت'، چیخف کا 'بوسہ' گورکی کا 'چھبیس مرد اور ایک لڑکی' شامل تھے۔

'پرانی محنت' کی بازیابی ہر شخص کو خوش و خرم اور تازہ دم بنا دیتی ہے۔ یہی حال عابد سہیل کا بھی تھا۔ اس چھوٹے سے روزن نے ان کو ماضی کی محنت و مشقت سے معطر جھونکے کا احساس دلا دیا اور ایک بار پھر انھوں نے زمانہ رفتہ کو یاد کرتے ہوئے چیخف کے The Kiss کا ترجمہ 'بوسہ' اور The Darling کا ترجمہ 'جان من' کے نام سے کر ڈالا۔ اس طرح عابد سہیل نے چند مزید تراجم جمع کر لیے اور اپنی ایک طبع زاد کہانی سمیت دیگر ادیبوں کے افسانے شامل کر کے ساڑھے تین سو سے زائد صفحات کی یہ کتاب شائع کر دی۔

یہ کتاب دو حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلا حصہ طبع زاد کہانیوں کا ہے جس میں عابد سہیل کے پیش لفظ کے ساتھ، غلام عباس کا افسانہ 'اس کی بیوی'، سریندر کمار مہرا کا 'چرن کور'، 'کچھ قدم دل کے ساتھ ساتھ'، سید محمد اشرف کا 'تلاش رنگ رائیگاں'، علی باقر کا 'کھلاڑی'، صادقہ نواب کا 'پہلی بیوی' اور عابد سہیل کا 'ایک محبت کی کہانی' شامل ہیں۔ کتاب کے دوسرے حصے میں ترجمہ کی ہوئی کہانیاں موجود ہیں۔ جن میں اسٹفن زویگ کی کہانی 'دل جو ٹوٹ گیا' کا ترجمہ سریندر کمار مہرا نے کیا ہے۔ باقی کی تمام کہانیوں کے مترجم عابد سہیل ہیں۔ کہانیوں اور ان کے تخلیق کار کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

'کنول اور شہد کی مکھی' (سنسکرت کہانی)، جان من (چے خف)، بوسہ (چے خف)، مسرت (موپاساں)، میری انسیل (مارٹن آرم اسٹرانگ)، بہانہ (موپاساں)، موڑ موڑ ساتھ (ولیم کا بیٹ)۔

عابد سہیل نے تمام کہانیوں کا ترجمہ نہایت سلیقے سے کیا ہے۔ وہ ایک زمانے تک نیشنل ہیرالڈ سے وابستہ تھے اور نیوز کی سمنگ سے لے کر خبر کا انٹرو تیار کرنے کا کام بھی بہتر انداز میں کرنا جانتے تھے۔ وہ الفاظ کے محل استعمال سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کے اس ہنر نے ترجمہ نگاری کو مزید نکھار دیا۔ عابد سہیل نے صرف انگریزی الفاظ کو اردو میں منتقل نہیں کیا بلکہ ایک اپنی تخلیقی فنکاری سے پوری فضا کو دلچسپ اور قابل رشک بنا دیا ہے۔ چیخف کے افسانہ 'جان من' کا اقتباس دیکھیے:

''جولائی کے ایک دن میں جب خوب گرمی پڑ رہی تھی، شام کے وقت، جب مویشی لوٹ کے آ رہے تھے اور پورا احاطہ دھول کے مرغولوں سے بھر گیا تھا، یکا یک کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اولینکا خود دروازہ کھولنے گئی اور سمر توف کو دیکھ کر گنگ رہ گئی۔ اس کے بال سفید ہو گئے تھے اور وہ عام لوگوں کی پوشاک پہنے تھا۔ ساری پرانی یادیں اس کی روح میں سیلاب کی طرح داخل ہو گئیں، وہ خود پر قابو نہ پا سکی، پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی اور ایک بھی لفظ منہ سے نکالے بغیر اس نے اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا۔''

(درد کا شجر، عابد سہیل، عرشیہ پبلی کیشن 2012، ص 285)

اس ترجمہ میں عابد سہیل نے زبان کے استعمال سے کہانی کو خوبصورت بنا دیا ہے۔ لفظ 'مرغولوں' سے قاری کے سامنے ایک پورا منظر ابھار دیا جس میں مویشیوں کے آنے کی آہٹ بھی سنائی دیتی ہے اور ان قدموں سے اٹھتی ہوئی دھول سے بنتا ہوا دائرہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ حالانکہ انگریزی میں اس جگہ صرف Full of dust لکھا ہے۔ یا پھر ''ساری پرانی یادیں اس کی روح میں سیلاب کی طرح داخل ہو گئیں'' جملے سے جس فطری اور جذباتی عمل کی عکاسی کی ہے وہ صرف Suddenly remembered everything سے عیاں نہیں ہو پا رہی

تھی۔ عابد سہیل نے کہانی کے لفظوں کو پڑھنے کے بجائے اس ماحول اور فضا کو محسوس کیا ہے جس میں کہانی کار کا ذہن کہانی کو مکمل کرنے کے لیے گردش کرتا رہا۔ یہ عابد سہیل کا کمال ہے کہ وہ اپنے ترجموں میں مقامی تہذیب کو اس طرح ڈھالتے ہیں کہ وہ قاری کو کہانی کا جز معلوم ہوتی ہے کیونکہ پڑھنے والا اسے موقع ومحل کے فطری تقاضوں کے پس منظر میں دیکھتا ہے۔ مثلاً چے خف کے ہی دوسرے افسانہ 'بوسہ' میں ایک جگہ اس طرح کا جملہ آتا ہے: I like your house immensely

ظاہر ہے اس کا سامنے کا ترجمہ یہی ہونا چاہیے کہ ''مجھے آپ کا گھر بہت اچھا لگا یا پسند آیا''۔ لیکن عابد سہیل یہاں اودھ کی تہذیب کی ذراسی جھلک دکھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مجھے آپ کا دولت خانہ یقیناً اچھا لگا''

اردو ادب کے لیے یہ لفظ ایسے موقعوں کے لیے اتنا مانوس ہے کہ پڑھنے والے کے ذہن و دل کو گمان بھی نہیں رہتا کہ وہ اودھ کی نہیں بلکہ کسی اور دیس کی کہانی پڑھ رہا ہے۔ یا اسی افسانے میں ایک اور جگہ 'Couettishly' کے لیے 'عشوہ گری' کا انتخاب کرنا عابد سہیل کی باریک بینی اور ماحول شناسی کا بین ثبوت ہے۔ اس قبیل میں مارٹن آرم اسٹرانگ افسانہ کے ترجمے 'میری انسیل' کو بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔ غرض کہ اس کتاب میں شامل سارے ہی ترجمے عابد سہیل کی ترجمہ نگاری کی عمدہ مثال ہیں جسے پڑھ کر مترجم کی قدر ومنزلت کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ہنر بھی ان میں پوشیدہ تھا۔

حرف کائنات

اس کتاب میں دنیا بھر کے مختلف دانشور، عالم، سیاستداں، ادیب، فنکار اور غیر معمولی حضرات کے کل ایک ہزار ایک سو گیارہ اقوال شامل ہیں۔ اتنے اقوال کی جمع آوری کا منصوبہ مصنف نے سالوں یا برسوں پہلے نہیں بنایا تھا بلکہ بچپن میں اس طرح کی بعض کتابیں انھوں نے پڑھی تھیں اور مختصر جملے میں فکر کی دنیا کو آباد دیکھ کر وہ ہمیشہ ہی اس میں کھو جاتے تھے۔ عمر کی پختگی میں ایک دن اقوال زریں کی وہ کتابیں یاد آگئیں جن میں یہ مقولے پڑھے تھے، لیکن تلاش بسیار کے بعد بھی کوئی کتاب ہاتھ نہ آئی سوائے اخبار کے ان کالم کے جہاں پابندی سے اس طرح کے اقوال شائع ہوتے رہتے تھے۔ بس پھر کیا تھا ''ضرورت ایجاد کی ماں ہے'' کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے عابد سہیل نے ایسی کتاب کی ترتیب کا عزم کر لیا جس کے نتیجہ میں 'حرف کائنات' عالم وجود میں آئی۔ اس کتاب میں عابد سہیل نے ان اقوال کو جگہ دی ہے جن میں واقعی کوئی علمی یا فکری بات کہی گئی ہو۔ اسی لیے بعض اقوال کو صرف اس لیے ترک کر دیا کہ ان میں معنویت طریق اظہار کی کرم فرمائی تھی۔

باغات

نیشنل بک ٹرسٹ کی گذارش پر لئیق فتح علی کی انگریزی کتاب Garden (1978) کا ترجمہ عابد سہیل نے باغات کے نام سے کیا۔ یہ کتاب باغوں، درختوں اور پودوں وغیرہ کے علم وفن سے متعلق تھی۔ پیش لفظ میں لکھتی ہیں:

''کتاب لکھتے وقت چوں کہ یہ بات ذہن میں رکھنے سے مدد ملتی ہے کہ وہ کن لوگوں کے لیے لکھی جا رہی ہے اس لیے میں نے یہ سوچ کر قلم اٹھایا تھا کہ میں نوجوان ماہرین تعمیر اور سول انجینئروں کے لیے لکھ رہی ہوں۔ باغات لگانے اور عوامی استعمال کی جگہوں کے نقشے تیار کرنے کا زیادہ سے زیادہ کام ان ہی ماہرین کے سپرد کیا جائے گا اور مجھے پورا یقین ہے کہ انھیں اس کام کو اچھی طرح سے انجام دینے سے متعلق تمام معلومات بھی حاصل ہوں گی۔''

(باغات، عابد سہیل (مترجم)، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا 2004، ص 7)

عابد سہیل ناول، اخبار وغیرہ کی تحریروں کے تراجم تو کرتے رہتے تھے لیکن اس نوعیت کے ترجمے کا یہ ان کا پہلا تجربہ تھا۔ مترجم لکھتے ہیں:

میں نے اس طرح کی تصنیف کو اردو قالب میں ڈھالنے کی کوشش نہیں تھی۔ اس کے باوجود یہ تجویز قبول کرنے میں مجھے ایک لمحہ بھی نہیں لگا۔ ایک سبب اس کا یہ تھا کہ کتاب کا موضوع مجھے بہت دلچسپ معلوم ہوا تھا۔

(باغات، لئیق فتح علی اور مترجم، مشمولہ نیا دور، دسمبر 2004)

عابد سہیل نے یہ کتاب تین چار دن میں مکمل پڑھ ڈالی۔ مطالعے کے بعد انھوں نے اس فن کو بہترین نثری ادب سے تعبیر کیا اور اپنے تاثرات بیانی میں یہ واضح کیا کہ فلابیر اور بالزاک کے ناول میں استعمال ہونے والی فکریں اور تشبیہیں جو دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں اور لطف وانبساط کا سامان فراہم کرتی ہیں، اس احساس وتجربوں سے ہمکنار نہیں کرا سکتی جو اس کتاب کے بعد مجھے ہوا۔ بقول مصنف یہ مطالعہ:

''...ایک ایسا تجربہ تھا جس کی نوعیت مطالعے کے سارے سابقہ تجربوں سے جدا تھی''

(باغات، لئیق فتح علی اور مترجم، مشمولہ نیا دور، دسمبر 2004)

اس کتاب میں ہندوستان کے علاوہ ایران، فرانس، جاپان وغیرہ کے باغوں اور بعض میں بڑی بڑی تعمیرات کا تذکرہ کیا ہے نیز باغوں کی حفاظت اور اس کی آرائش وغیرہ کے بیان اور مویشیوں سے اس کو محفوظ رکھنے کے طور طریقوں کا بھی اندراج ہے۔ کتاب چار حصوں میں منقسم ہیں۔ پہلا عنوان 'باغوں کی تشکیل کے اصول'، دوسرا 'باغوں کی تشکیل کا سامان'، تیسرا 'صنعتی باغ'، چوتھا 'عوامی استعمال کے باغ'۔

اس کتاب کا ترجمہ عابد سہیل کے لیے اگر مشکل نہیں تو آسان بھی نہ تھا۔ کیونکہ یہ کتاب ادبی فن کے بجائے ایک خاص علمی نوعیت کی تھی اور عابد سہیل باغبانی سے بہت زیادہ آشنا نہیں تھے۔ اس امر کے ذریعے مترجم نے اپنی ریاضت وصلاحیت کا ایک بار پھر امتحان لیا اور کتاب کا تخلیقی انداز میں ترجمہ پیش کر کے صلاحیتوں کی فتح کا اعلان کیا۔

ترجمہ نگاری ایک مشکل فن ہے جس کا احساس عابد سہیل کو بخوبی تھا۔ وہ اس کی باریکیوں سے بھی پوری طرح واقف تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے ترجمے سطحی ترجموں سے مختلف ہوتے کیونکہ وہ زبان کے الفاظ کے بدلے دوسری زبان کے الفاظ کا انتخاب نہیں کرتے بلکہ بین السطور پنہاں معانی ومطالب کی جلوہ گری کو دوسری زبان میں روشن کرنے کی کوشش کرتے۔ اس تعلق سے وہ لکھتے ہیں

''ترجمے میں ان مسائل کے علاوہ جو کسی مضمون یا کتاب کی زبان سے اس طرح واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، ایک بڑی مشکل یوں پیش آتی ہے کہ خیال کو ایک زبان کے کینڈے سے دوسری زبان کے کینڈے میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔ یہ دقت اردو سے ہندی یا ہندی سے اردو میں ترجمہ کرتے وقت نہیں پیدا ہوتی کیونکہ دونوں زبانوں کے کینڈے بنیادی طور پر ایک ہی ہیں جب کہ مثلاً اردو اور انگریزی کے درمیان اس نقطہ نظر سے رشتے کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔''

(باغات، لئیق فتح علی اور مترجم، مشمولہ نیا دور، دسمبر 2004)

مذکورہ کتب کے مطالعے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ عابد سہیل نے ترجمہ نگاری کے فن کو نئی بلندیوں تک پہنچانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کے ترجموں میں تہذیب کا رنگ، ثقافت کا عکس، مصنف کی ذہنی کیفیت اور دم تحریر کے عہد کے ساتھ ساتھ تخلیقیت کی آنچ بھی نظر آتی ہے۔ اس معیار کے تراجم اردو ادب میں کم دیکھنے کو ملیں گے۔ اس لیے یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ عابد سہیل نے ترجمہ نگاری میں ایک منفرد اور ممتاز مقام حاصل کیا ہے۔

■

Musi Raza
Research Scholar, Dept of Urdu
MANUU, Lucknow Campus
Lucknow - 226020 (UP)
Mob.: 9807694588

اردو، آزادی اور وطنیت

محمودہ قریشی

تاریخ گواہ ہے دنیا بھر کے سیاسی، معاشی اور انقلابی محرکات میں اردو زبان و ادب نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ جب ہم تاریخ کی ورق گردانی کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے، کہ تحریک آزادی میں اردو زبان و ادب نے جوش و ولولے سے ہند کی تہذیبی و انقلابی زبان ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ اردو زبان ہندوستان کے تمام لوگوں کی مشترکہ زبان رہی ہے اور آزادی کا نعرہ 'انقلاب زندہ باد' اردو زبان کی ہی دین ہے۔

برصغیر کی بات کریں تو انیسویں صدی میں انگریزی حکمراں کاروباری مقاصد لے کر ایسٹ انڈیا کمپنی کی صورت میں ہندوستان پہنچے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا پہلا تجارتی جہاز 13 فروری 1600 کو ہندوستان آیا۔ یہی ان کی اولین کامیابی تھی۔ کمپنی کا مقصد 'سونے کی چڑیا' کو قید کرنا تھا جس میں کامیابی ملی، چونکہ مغل سلطنت زوال آمادہ تھی ایسے ماحول میں انگریزی حکومت کو ہندوستان میں پیر پسارنے میں کچھ زیادہ وقت نہیں لگا۔ وہ بہت جلد ملک کے ہر حصے پر قابض ہو گئے۔ یہ معاملہ زیادہ پر اثر تب ہوا جب انگریزوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذہبی جذبات سے کھیلنا اور انھیں مجروح کرنا چاہا۔ جس کے ردعمل کی ایک جھلک 1857 کی جنگ آزادی کی صورت میں نظر آتی ہے۔ یہ جنگ آزادی صرف بغاوت نہیں بلکہ، انگریزی استعماریت کے مقابل اپنی بقا کی جنگ تھی۔ ہندوستانی اب سمجھ گئے تھے کہ ہم زیادہ دیر اب غلامی کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اسی لیے 10 مئی 1857 کی جنگ آزادی میرٹھ سے شروع ہو کر ملک کے گوشے گوشے میں پھیل جاتی ہے۔ ہر طرف آزادی کے نعرے بلند ہونے لگے۔ ملک میں تغیر آیا۔ ذہنوں کو ٹٹولا گیا، اور انگریز حکومت کے خلاف ہندوستانیوں نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ انگریزوں نے 'پھوٹ ڈالو اور سیاست کرو' کی ترکیب اپنائی تو ہندوستان کا باشعور طبقہ بھی پیچھے نہیں رہا۔

1857 کی پہلی جنگ آزادی کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ، یہ جنگ ہتھیاروں کے علاوہ اعلانوں اور حکم ناموں کے ذریعے بھی لڑی گئی تب قلم سے تلوار کا کام لینا وقت کا اہم تقاضا تھا۔ انہی حالات کے نتیجے میں اردو ادیبوں نے اپنی تحریر کا رخ تحریک آزادی کی طرف موڑ دیا۔

تحریک آزادی کی طرف انقلابی ذہن پیدا کرنے کی کوشش کی بقول آل احمد سرور ''ادب انقلاب نہیں لاتا بلکہ انقلاب کے لیے ذہن کو بیدار کرتا ہے۔''

جتنے دور ہماری سیاسی، سماجی زندگی میں آئے ہیں اتنے ہی دور ہمارے ادب پر بھی آئے ہیں، جس کا اثر ہر صنف ادب پر دیکھا گیا، نظموں میں، افسانوں میں، ناول میں، اور ہماری شاعری پر، اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے، کہ آزادی کے تصور کو پھیلانے میں جو رول ہماری اردو شاعری نے ادا کیا ہے۔ وہ کسی نے نہیں کیونکہ شاعری دل کے تاروں کو چھو لیتی ہے۔ اور یہ جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لیے ایک کارآمد ذریعہ ہے۔

1857 کے دوران جو حالات رونما ہوئے تو اردو زبان کے شاعروں، ادیبوں نے اپنی قلمی کارروائی کے ذریعے آزادی کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔

اردو زبان نے تحریک آزادی میں گراں قدر خدمات انجام دی ہے۔ اس زبان نے تحریک آزادی کی جدوجہد میں قدم سے قدم ملا کر وفاداری کا ثبوت پیش کیا ہے۔ وطن کی آزادی کے لیے اردو زبان و ادب نے جو قربانیاں پیش کی ہیں، وہ ہماری تاریخ کا درخشاں باب ہے۔ تحریک آزادی کے علمبرداروں نے اگر یورپ میں تعلیم حاصل کر کے انگریزی زبان سیکھ کر ملت کو ایک راہ پر گامزن کیا تو اس قوم اور ملت کو یکجا کرنے کا سہرا اردو زبان کو ہی حاصل ہوتا ہے۔ بقول شارب ردولوی:

''ہندوستان کی جنگ آزادی دو اسلحہ سے لڑی گئی، ایک 'اہنسا' دوسرا 'اردو زبان'۔

اردو کی تمام اصناف ادب میں یہ جذبہ پایا جاتا ہے۔ خاص کر جدوجہد کا۔ یہ جذبہ اردو نظم میں بھی پایا جاتا ہے۔ اردو نظم کا وہ دور تو خاص کر جنگ آزادی کے متوالوں کے لیے ہی تھا۔ چونکہ پنجاب میں نظم جدید کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا۔ جس کی بنیاد ہالرائڈ اور محمد حسین آزاد نے ڈالی تھی۔

ایسے نظم گو شعرا میں، الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد، اسمٰعیل میرٹھی، سرور جہان آبادی، برج نرائن چکبست،

علامہ اقبال، حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، اکبر الہ آبادی، علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، مجاز، فیض احمد فیض، وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔

حالی نے اپنی شاعری میں حب الوطنی کے جذبے کو پیش کیا۔ جس سے لوگوں میں سیاسی، سماجی اور تہذیبی قدروں کا احساس پیدا ہوا۔ حالی نے حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار ہو کر 'حب وطن' کے نام سے ایک مثنوی (نظم) لکھی۔ انھوں نے اپنی نظموں کے ذریعے ہم وطنوں کو محبت، اتحاد، دوستی اور امن کا پیغام دیا ہے۔ ان کی ہر نظم ہی قومی و سیاسی رنگ کی عکاسی کرتی ہے۔

اے وطن اے مرے بہشت بریں
کیا ہوئے تیرے آسمان و زمین

پھر کہتے ہیں۔

رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا
وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا

محمد حسین آزاد نے کرنل ہالرائڈ کے ساتھ انجمن پنجاب کی بنیاد رکھی جس کے تحت آزاد اور حالی نے اپنی نظموں کے ذریعے قوم کی اصلاح کے ساتھ حب الوطنی کے جذبے کو پھیلایا۔ تو اکبر الہ آبادی نے اپنی شاعری میں طنز کا سہارا لیا۔ انھیں انگریزی تہذیب و تمدن سے نفرت تھی اور ملک کی زوال آمادہ تہذیب کا قلق و افسوس تھا۔ اس لیے طنز کے ذریعے اپنی بات کو واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

حب الوطنی کا تصور سرور جہاں آبادی کی نظموں میں بھی صاف نظر آتا ہے۔ چونکہ وہ مانتے ہیں کہ حب وطن ایسا جذبہ ہے جو مذہبی رسم و رواج کے بندھن سے آزاد ہے۔ اس لیے ان کی نظموں میں وطن سے عشق اور آزادی کے خیالات ہی پیش کیے گئے ہیں۔

علامہ اقبال نے خاص طور سے اپنی نظموں کے ذریعے حب الوطنی کوفروغ دیا،جس سے آزادی کی قومی جدو جہد میں بڑی قوت ملی۔انھوں نے تحریک آزادی کی جدو جہد کو بڑے غور وفکر سے جانچا تھا۔جس کا اندازہ جگہ جگہ ان کی شاعری میں ملتا ہے۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں،

حب الوطنی کے شاعر، برج نرائن چکبست نے تو جابہ جا اپنی شاعری کے ذریعے غافل قوم کو جگانے اور ان کے دلوں میں حرکت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔وہ اپنی نظم 'آوازقوم' میں لکھتے ہیں۔

یہ آرزو ہے کہ مہرو وفا سے کام رہے
وطن کے باغ میں اپنا ہی انتظام رہے
گلوں کی فکر میں گل چیں نہ صبح وشام رہے
نہ کوئی مرغ خوش الحاں اسیر دام رہے
یہ جوش پاک زمانہ مٹا نہیں سکتا
رگوں میں خوں کی حرارت مٹا نہیں سکتا
یہ آگ وہ ہے، جو پانی بجھا نہیں سکتا
دلوں میں آکے یہ ارمان جا نہیں سکتا

شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کی شاعری کا بہت سارا حصہ جذبۂ آزادی سے بھرا پڑا ہے۔ان کے پر جوش اور ولولہ انگیز انداز بیاں نے آزادی کے متوالوں کو سر بکف ہونے پر آمادہ کیا۔ملک کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں تھے۔آزادی کی قدرو قیمت کا انھیں بہت احساس تھا۔تحریک آزادی زوروں پر تھی۔ انھیں کامل یقین ہوگیا کہ اب ملک آزاد ہو جائے گا۔اس لیے ان کی نظمیں بغاوت وانقلاب جیسے جذبوں سے سرشار ہیں۔

کام ہے میرا تغیر،نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ ہے، انقلاب و انقلاب و انقلاب

علی سردار جعفری نے بھی جنگ آزادی میں قلم کے ساتھ ساتھ عملی طور پر بھی حصہ لیا۔زنداں میں قید و بند کی صعوبت برداشت کی۔ ان کی شاعری دعوت انقلاب، پیغام بیداری، جذبہ آزادی اور خواہش آزادی کے جذبوں سے لبریز نظر آتی ہے۔'نئی دنیا کو سلام' میں علی سردار جعفری کہتے ہیں۔

رقص کرائے روح آزادی کہ رقصاں ہے حیات
گھومتی ہے وقت کے محور پہ ساری کائنات

حسرت موہانی جو سیاست داں،شاعر،ادیب،صحافی،اور نقاد تھے آزادی کی لڑائی میں ان کا نعرہ 'انقلاب زندہ باد' نے پورے ہندوستان میں آگ لگا دی تھی اور لوگوں کو آزادی کی لڑائی میں کودنے پر آمادہ کیا۔ہندوستانیوں میں اس نعرے نے جوش بھر دیا تھا۔سیاسی و ادبی سرگرمیوں کے سبب کئی بار جیل گئے۔لیکن آزادی کے جذبے کو پھیلانے میں کوئی فرق نہ آیا اور اپنی پر زور کاوشوں کے سبب آزادی حاصل کر کے رہے۔

جنگ آزادی صرف نظم گوشعرا نہیں لڑ رہے تھے بلکہ نثری ادب سے وابستہ ادیب، دانشور بھی اپنی تخلیقات میں اس نظریے سے متاثر نظر آتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد ناولوں میں آزادی کے تصور کو پیش کرتے ہیں،ابن الوقت، بنات النعش میں سیاسی اور معاشرتی زندگی کی ترجمانی کے حوالے سے جنگ آزادی کے تصور کو پھیلایا۔

مرزا غالب بھی 1857 کی قتل اور غارت گری سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔لیکن ان کی ذہنی قوتیں اس قومی تباہی پر غصے اور رنج کا اظہار اور ماحول کا پورا نقشہ اپنے خطوط میں کھنچتے ہیں۔

پریم چند کی سبھی کہانیاں آزادی کے جذبے سے لبریز ہوتی ہیں۔ساتھ ہی ساتھ وہ وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے انگریزوں کے ظلم وستم کو برداشت نہیں کر سکے اور جابہ جا اپنی کہانیوں میں جذبۂ آزادی سے سرشار نظر آتے ہیں۔ان کے افسانوی مجموعے 'سوز وطن' میں شامل افسانہ 'دنیا کا انمول رتن' ہے جس کو حکومت وقت نے آزادی کا تصور پھیلانے کے الزام میں ضبط کر لیا تھا۔

اردو صحافت کے ذریعے بھی آزادی کے تصور کو ہوا مل گئی اردو صحافیوں نے آزادی سے متعلق خبریں چھاپیں۔ جس میں مولوی محمد باقر بھی تھے، جو پہلے شہید صحافی ہیں۔

آزادی کی لڑائی میں رام پرساد بسمل جن کو 19 دسمبر 1937 کو گورکھپور جیل میں پھانسی دی گئی۔ان کی زبان پر اردو زبان میں بسمل عظیم آبادی نے جو شیلے اشعار کہے تھے۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے
اَے شہید ملک و ملت تیرے جذبوں کے نثار
تیری قربانی کا چرچا غیر کی محفل میں ہے
وقت آنے دے بتا دیں گے تجھے اے آسماں
ہم ابھی سے کیا بتائیں کیا ہمارے دل میں ہے
اب نہ اگلے ولولے ہیں اور نہ ارمانوں کی بھیڑ
ایک مٹ جانے کی حسرت اب دل بسمل میں ہے

غرض یہ کہ اردو کا اپنا ایک شاندار ماضی ہے۔یہی وہ زبان ہے جس نے جنگ آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ تحریک آزادی کے ساتھ اردو زبان و ادب قدم سے قدم ملا کر چلی،جس نے آزادی کے متوالوں کے نہ صرف حوصلے بلند کیے، بلکہ انگریزی حکومت کی بنیاد کو بھی ہلا دیا۔اگر ہم یہ کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ ملک میں سیاسی بیداری پیدا کرنے میں اس ملک کی دیگر زبانوں کے مقابلے میں اردو زبان نے سب سے زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ یہی زبان ہمارے ملک کی گنگا جمنی تہذیب کی امین بھی ہے۔اس زبان نے ہر دور میں ہندوستانیوں کے دلوں میں محبت کے دیپ،اوراتحاد ویکجہتی کی قندیلیں روشن کرنے کا مقدس فریضہ بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔

انگریز اس وقت اردو کے ان قلم کاروں سے جو آزادی کے تصور کو پھیلا رہے تھے، حد درجہ خائف تھے اس لیے انھوں نے اس زبان کا بہت سا شعری وادبی سرمایہ ضبط کر لیا تھا، جس میں بہت کچھ شائع ہو چکا تھا،اور کچھ شائع ہونا باقی تھا۔تاہم کچھ فرامین اور خطوط ابھی بھی دستیاب ہیں ان میں سے ایک فرمان جو نانا صاحب کا تھا اردو زبان میں لکھا گیا، یہ خط جس سے آزادی کے جذبے کا پتہ چلتا ہے:

"جان یک روز کبھی جائے گی ہی، پر عزت کھو کر کیوں مرنا ہم سے لڑائی، فساد، جنگ جو کچھ ہوگا سو کریں گے تلوار سے ہوگا تو تلوار سے لڑیں گے تاکہ عزت سے جی سکیں۔"

ہمارے ادب کی یہ خوش قسمتی رہی ہے کہ اس کے گیسو سنوارنے اور اپنے ملک کی بقا کی حفاظت کرنے میں جتنا حصہ مسلمانوں نے لیا، اس کے کہیں زیادہ حصہ دوسرے مذہب کے پیرو کاروں نے لیا ہے، جس میں دیا شنکر نسیم، رتن ناتھ سرشار، درگا سہائے سرور جہاں آبادی، آنند نرائن ملا، فراق گورکھپوری، منشی پریم چند، فکر تونسوی، جگن ناتھ آزاد، راجندر سنگھ بیدی، پروفیسر گوپی چند نارنگ جیسے قد آور شخصیات نے اردو زبان و ادب کے لیے جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں وہ اس زبان کی تاریخ کا روشن باب ہے، جسے اردو زبان کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

مراجع وماخذ

1 ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری: گوپی چند نارنگ، قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
2 تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، مرتب: ناشر نقوی
3 جنگ آزادی میں اردو کا حصہ ناشر اقبال بیدار، اقبال جنس جہانگیر آباد بھوپال
4 تحریک آزادی میں اردو کا حصہ: ڈاکٹر معین الدین عقیل
5 تاریخ ہند۔ ملک ہندوستان کی تاریخ (ہندی زبان میں) ساہتیہ پبلشر
6 کلیات حالی

■

Mehmooda Qureishi
22/78, Dholi Khar Mantola
Agra Fort
Agra - 282002 (UP)
Mob.: 7417912943

احمد خان

سوشل میڈیا

تفہیم اور اثرات

ٹکنالوجی کی ترقی نے مختلف ذرائع ابلاغ کے امتیاز کو ختم کر دیا ہے،اکثر میڈیا پلیٹ فارم ایک دوسرے سے کسی نہ کسی شکل میں منسلک ہیں، انٹر نیٹ کا جال انہیں ایک کڑی میں جوڑے ہوئے ہے،انٹر نیٹ اور کمپیوٹر کی مجموعی حیثیت لازم و ملزوم کی ہے لیکن انٹر نیٹ کو جب موبائل سے جوڑا گیا تو اس کا اثر زیادہ ہوا، کمپیوٹر اور لیپ ٹاپ کے مقابلے موبائل پر انٹر نیٹ کا استعمال آسان ہے، لہٰذا پہلے کے مقابلے انٹر نیٹ کا دائرہ زیادہ بڑھا ہے۔

سوشل میڈیا نسلِ انسانی کی ترقیات میں ایک بڑا انقلاب ہے۔ اکیسویں صدی کو انفارمیشن ٹکنالوجی کا عہد کہا جاتا ہے۔ اسے اطلاعاتی انقلاب سے بھی منسوب کیا جاتا ہے۔ اس انقلاب نے پوری دنیا کو ایک عالمی گاؤں (Global Village) میں تبدیل کر دیا ہے۔ آج اطلاع ہر کس و ناکس کی دسترس میں ہے۔ کسی سے کچھ پوشیدہ نہیں ہے۔ ہزاروں میل دور رہنے والے انسان کو ایک دوسرے کو پل پل کی خبر ملتی رہتی ہے۔ اطلاعاتی انقلاب نے پوری دنیا کے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور تہذیبی تانے بانے کو تبدیل کر دیا ہے۔ ایک عالمگیر زبان، ثقافت اور فکر و آگہی کو پروان چڑھایا ہے۔ دنیا کو ایک ایسے مقام پر متمکن کر دیا ہے جہاں لوگ ایک دوسرے کے آداب و اطوار، وضع قطع، خورد و نوش اور تہذیب و ثقافت سے اثر قبول کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس انقلاب نے عالمی زبان، تہذیب اور ثقافت کے دائرے کو توڑا ہے۔ اب کسی زبان اور تہذیب کی سرحد نہیں بچی ہے۔ اس کا بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے چند دہائیوں میں ہزاروں سال کے ترقیاتی سفر میں ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا ہے۔ یہ وہ انقلاب ہے جس نے پوری دنیا کو علم و آگہی کی دہلیز پر لا کھڑا کر دیا ہے۔ اس نے میڈیا کو غیر معمولی ترقی سے ہمکنار کیا ہے، عوامی حصے داری کو یقینی بنایا ہے اور جمہوریت کی جڑوں کو مزید مستحکم کیا ہے۔

سوشل میڈیا میں عام انسان کی رسائی سے آزادیِ اظہار رائے کو بڑی تقویت ملی ہے۔ اس کے ذریعے بین شخصی ترسیل کا براہِ راست آغاز ہوا ہے۔ یہاں کوئی شخص اپنی رائے کا بے باکی سے اظہار کر سکتا ہے۔ اس کی ذاتی رائے، سوشل میڈیا پلیٹ فارم سے عوام الناس تک بآسانی پہنچائی جا سکتی ہے۔ میڈیا میں ٹکنالوجی کی ترقی بڑی تیزی سے ہوئی ہے۔ ایک وقت تھا جب پرنٹ میڈیا کا چلن عام تھا لیکن طباعتی میڈیا میں الیکٹرانک ذرائع کے استعمال سے بڑی تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ جب ڈیجیٹلائیزیشن کا آغاز ہوا تو اطلاعات کو ڈاٹا بینک میں محفوظ کیا جانے لگا۔ اطلاعات کو فلاپی ڈسک میں رکھ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ آسانی سے لے جایا گیا۔ جب کمپیوٹر کو پرنٹر سے منسلک کیا گیا تو طباعتی عمل مزید آسان اور صاف ستھرا ہو گیا۔ فوٹوگرافی میں بھی تکنیکی تبدیلی آئی۔ ڈیجیٹل کیمروں نے تصویروں کے معیار کو بہتر بنا دیا۔ ڈیجیٹل تصویروں میں تکنیکی ایڈیٹنگ کی سہولت بڑھ گئی۔ اس طرح تصویر کو بہتر بنانے کے عمل میں تصویر پروسیسنگ یا الیکٹرانک تصویر کی ابتدا ہوئی۔ اکیسویں صدی میں تجارتی و صنعتی ضرورتوں نے موبائل فون کو عام کر دیا ہے۔ اب موبائل فون صرف گفتگو کا ذریعہ نہیں بلکہ اس میں ایک الیکٹرانک دنیا آباد ہے۔ اس میں ٹیلی ویژن، ریڈیو، ای اخبار، ای جرنل، ای شاپنگ، ای بینکنگ، آن لائن تعلیم، ای میل، انٹرنیٹ، ویڈیوز، رقص و موسیقی، تصویروں کی منتقلی، راست گفتگو اور ویڈیو فلم وغیرہ کی سہولتیں دستیاب ہیں۔ ٹکنالوجی کی ترقی نے مختلف ذرائع ابلاغ کے امتیاز کو ختم کر دیا ہے۔ اکثر میڈیا پلیٹ فارم ایک دوسرے سے کسی نہ کسی شکل میں منسلک ہیں۔ انٹرنیٹ کا جال انھیں ایک کڑی میں جوڑے ہوئے ہے۔ انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کی مجموعی حیثیت لازم و ملزوم کی ہے لیکن انٹرنیٹ کو جب موبائل سے جوڑا گیا تو اس کا اثر زیادہ ہوا۔ کمپیوٹر اور لیپ ٹاپ کے مقابلے موبائل پر انٹرنیٹ کا استعمال آسان ہے۔ لہٰذا پہلے کے مقابلے انٹرنیٹ کا دائرہ زیادہ بڑھا ہے۔

دراصل ترسیل انسان کی زندگی کا اہم جز رہی ہے۔ بنی نوع انسان کے ابتدائی زمانے میں ترسیل و ابلاغ کے لیے اشاروں اور بے ہنگم آوازوں کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد تصویروں اور نشانوں کو ترسیل کا ذریعہ بنایا گیا۔ اس عمل میں درون ذاتی ترسیل کا فروغ ہوا۔ چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے آپسی میل جول سے بین ذاتی اور جماعتی ترسیل کو فروغ ملا۔ ترسیل میں تکنیکی ترقی کے ساتھ ہی عوامی ترسیل کے عروج کا راستہ ہموار ہوا۔ عوامی ذرائع ابلاغ جیسے اخبار، ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے اس سمت میں انقلابی کردار ادا کیے۔ وقت کے ساتھ ساتھ تکنیکی فروغ میں اضافہ ہوتا گیا۔ انٹرنیٹ، موبائل اور سوشل میڈیا نے ترسیل کے میدان میں نئی بلندی قائم کی ہے۔ سوشل میڈیا کو پہلے نیو میڈیا کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ دراصل نیو میڈیا، کمپیوٹر سے آراستہ اور کمپیوٹر پر منحصر میڈیا کی ایک نئی شکل ہے۔ اس کے تحت کسی بھی مواد کو انٹرنیٹ کے ذریعے ہی نشر کیا جا سکتا ہے۔ نیو میڈیا میں ڈیجیٹل کمپیوٹر ٹکنالوجی کو شامل کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں کمپیوٹر اینی میشن، ویڈیو گیم، ویب سائٹس اور مجازی دنیا (Virtual World) وغیرہ اس کی بنیادی مثالیں ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ نیو میڈیا کا دائرہ بڑھتا گیا۔ انٹرنیٹ کے شدید استعمال اور ترسیل کی وسعت کے باعث نیو میڈیا کو سائبر میڈیا بھی کہا جانے لگا۔ دراصل کسی بھی آن لائن ترسیل کو جو ایک وسیع سامعین تک پہنچتی ہے، سائبر میڈیا کہتے

ہیں۔جس میں بلاگ، ای میل اور ویب سائٹس وغیرہ کو شامل کیا جاتا ہے لیکن اس کا دائرہ ان سے کہیں وسیع ہے۔نیو میڈیا اور سائبر میڈیا بنیادی طور پر مواد کی آن لائن ترسیل کے ساتھ ساتھ میڈیم اور پلیٹ فارم کا بھی درجہ رکھتے ہیں۔سوشل میڈیا اگرچہ انھیں پلیٹ فارم کی زائیدہ ہے لیکن معنوی طور پر ان سے قدرے مختلف ہے۔سوشل میڈیا ترسیل کی ایک ایسی قسم ہے جسے انٹرنیٹ کے ذریعے عمل میں لایا جاتا ہے۔صارفین، سوشل میڈیا نیٹ ورکس کے ذریعے ترسیل، مکالمہ، مذاکرہ، اطلاعات کی شراکت اور ویب مواد تیار کرسکتے ہیں۔سوشل میڈیا کے لیے فیس بک، ٹویٹر، واٹس ایپ، یوٹیوب، بلاگ، ای میل اور ویب سائٹس وغیرہ کی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ دراصل سوشل میڈیا کی بنیادی فطرت عوامی ہے۔اسے جو چیز دیگر میڈیا پلیٹ فارم سے ممتاز کرتی ہے، وہ ہے وسیع پیمانے پرعوام کی شمولیت۔یہی وجہ ہے کہ اسے سوشل میڈیا کے اسم خاص سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ویبسٹر (Webster) ڈکشنری میں سوشل میڈیا کی تعریف کچھ اس طرح بیان کی گئی ہے : ''الیکٹرانک مواصلات کی شکلیں (جیسے سوشل نیٹ ورکنگ اور مائیکرو بلاگنگ کے لیے ویب سائٹس) جن کے ذریعے صارفین معلومات، خیالات، ذاتی پیغامات اور دیگر مواد جیسے ویڈیو کا اشتراک کرنے کے لیے آن لائن جماعتیں بناتے ہیں۔'' کیپلان اینڈریاس (Kaplan Andreas) اور مائیکل ہینلین (Michael Haenlein) کی سوشل میڈیا پر گہری نظر ہے۔انھوں نے سوشل میڈیا کی تعریف و تفہیم اور اثرات کی وضاحت کچھ یوں کی ہے:

''سوشل میڈیا، کمپیوٹر و موبائل ثالثی ٹولز ہیں جو لوگوں کو مجازی جماعتوں (Virtual Communities) اور نیٹ ورکس میں معلومات، خیالات، تصاویر، ویڈیوز کی شراکت اور تبادلہ کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔سوشل میڈیا کی تعریف ''انٹرنیٹ مبنی ایپلی کیشنز کے ایک گروپ کے طور پر کی گئی ہے جو نظریاتی اور تکنیکی بنیادوں پر کام کرتی ہے جس کے ذریعے صارف کے تیار کردہ مواد کی تخلیق اور تبادلہ کیا جاتا ہے۔''[1]

سوشل میڈیا کی یہ خوبی ہے کہ اسے بین ذاتی اور عوامی ترسیل دونوں میڈیم کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔اس میں ایک ہی پیغام کی مختلف افراد کو ایک ہی وقت میں ترسیل کی جاسکتی ہے۔ ایسی ترسیل میں متعدد افراد کی شمولیت کا نظم ہوتا ہے۔کوئی شخص کسی پیغام پر اپنا ردِ عمل فوراً ظاہر کرسکتا ہے اور اپنی خواہش کے مطابق کسی پیغام کو قبول یا رد کرسکتا ہے۔اس میں یہ بھی التزام ہوتا ہے کہ کسی مخصوص شعبے کی خبر یا پیغام کو آن لائن حاصل کیا جاسکے۔ مثلاً کھیل یا تجارت سے متعلق خبروں کو پڑھنے کے لیے پورے اخبار کو خریدنے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ انھیں آن لائن آسانی سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔روایتی میڈیا جیسے اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ارسال کردہ پیغام پر مرسل کا قابو ہوتا ہے جبکہ اس میں وصول کنندہ کی کوئی شمولیت یا حصے داری نہیں ہوتی ہے۔اس کے برعکس نئے ترسیلی میڈیم یا سوشل میڈیا میں وصول کنندہ بھی سرگرم کردار ادا کرتا ہے۔کیٹزمین (Kietzmann) اور کرسٹوفر (Kristopher) کے مطابق سوشل میڈیا کی وجہ سے ترسیل کی فطرت اور پیش کش میں غیر معمولی تبدیلی آئی ہے:

''سوشل میڈیا، موبائل اور ویب ٹکنالوجیز پر مبنی ایک انتہائی موثر بین الشراکتی پلیٹ فارم ہے جس کے ذریعے افراد، فرقہ، جماعت، تجارت اور اداروں کے مابین صارف کے ذریعے تیار کردہ مواد کی تخلیق، اشتراک اور تبادلۂ خیال کیا جاتا ہے۔''[2]

پرنٹ، ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں مرسل کو تکنیکی علم کا ہونا لازمی ہے۔جبکہ نئے میڈیم میں اس کی ضرورت نہیں کے برابر ہے۔اس میں مرسل راہ چلتے اپنے موبائل فون سے کسی شخص کو دنیا کے کسی خطے میں پیغام ارسال کرسکتا ہے اور اس کے ردِ عمل کو فوراً حاصل بھی کرسکتا ہے۔روایتی ذرائع ابلاغ میں ردِ عمل تاخیر سے موصول ہوتا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ اسے نشر بھی کیا جائے۔نیو میڈیا رسوشل میڈیا کا دائرہ بہت وسیع ہے۔اس کی وسعت اور اثرات کے متعلق ڈاکٹر سشیل ترویدی کی رائے کچھ اس طرح ہے:

''نیو میڈیا اپنی شکل، شباہت اور نظم و نسق میں میڈیا کی روایتی صورتوں سے مختلف اور ان کے مقابلے کافی وسیع ہے۔ روایتی طور پر میڈیا لفظ کا استعمال کسی ایک میڈیم پر منحصر میڈیا کے لیے کیا جاتا ہے، جیسے کہ کاغذ پر طباعتی مواد کی نمائندگی کرنے والا پرنٹ میڈیا، ٹیلی ویژن یا ریڈیو جیسے الیکٹرانک میڈیا۔نیو میڈیا کسی دائرے سے کافی حد تک بالاتر ہے ہی روایتی میڈیا کے مقابلے انتہائی وسیع ہے۔''[3]

سوشل میڈیا میں آزادیِ اظہارِ رائے، ایک اہم خوبی ہے۔اس ترسیلی نظام میں مرسل کے ساتھ وصول کنندہ بھی باہم شریک ہوتا ہے۔لہٰذا دونوں اپنے خیالات کو آزادی کے ساتھ ارسال کرتے ہیں۔ عام طور پر روایتی ماس میڈیا میں اپنے خیالات کو ظاہر کرنے میں عام آدمی کی شراکت نہیں ہوتی ہے لیکن نیو میڈیا رسوشل میڈیا میں ہر شخص اپنے خیالات کو ظاہر کرنے کے لیے آزاد ہے۔اس میں خیالات کو پیش کرنے کی لامحدود قوت ہوتی ہے۔اس میں ہر وہ شخص شریک ہوسکتا ہے جو اس کی خواہش رکھتا ہے۔

سوشل میڈیا کی ایک تعریف یہ بھی کی جاتی ہے کہ یہ ایک ایسا ڈیجیٹل میڈیم ہے جس کے ذریعے عالمی سرحدوں کو توڑتے ہوئے عام شخص کے باہم اظہارِ رائے کو قائم کیا جاتا ہے۔اس میڈیم پر کسی ایڈیٹر یا رپورٹر کا قابو نہیں ہوتا ہے۔ ارسال کردہ پیغام میں کوئی ملاوٹ نہیں ہوتی ہے۔اس میں کبھی کبھی غیر سنجیدگی، پھوہڑپن، عریانیت، ناشائستگی اور بدنظمی کا احساس ضرور ہوتا ہے لیکن اس میں جو کچھ ارسال ہوتا ہے وہ صاف اور سیدھا ہوتا ہے۔ یہاں خیالات کو دبایا نہیں جاسکتا۔روایتی میڈیا کی طرح یہاں غیر جانب دار ہونے کا دکھاوا نہیں کیا جاتا ہے۔نیو میڈیا کی سب سے بڑی طاقت اس کی سادگی، بے باکی اور صراحت ہے۔یہاں مرسل کے دل کی بات اور جذبات کو سمجھنا آسان ہوتا ہے۔

سوشل میڈیا ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جس کی کوئی سرحد نہیں ہے۔سوشل میڈیا صرف میڈیم ہی نہیں بلکہ خود ایک پیغام ہے۔یہاں مرسل اور وصول کنندہ دونوں ایک دوسرے کے کردار میں نظر آتے ہیں۔یہ میڈیم، نامعلوم لوگوں کے مابین تعلق قائم کرنے کا ایک طاقتور ذریعہ ہے۔ یہاں نامعلوم افراد کے درمیان رشتہ قائم کرنا بہت آسان ہے۔یہ میڈیم انسانی و جمہوری قدروں کو قوی بناتا ہے۔یہ ذاتی خیال کو نشر کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔یہ عدل و انصاف کی جنگ کو مضبوط کرتا ہے۔ مثلاً سوشل میڈیا نے حساسیت کا ثبوت دیتے ہوئے کئی ایسے حادثوں پر عوامی رائے بنائی جس سے کمزور اور بے بس لوگوں کو انصاف ملا۔ سوشل میڈیا کے ذریعے لوگوں میں بیداری پیدا کرنے، اصلاح کرنے، تبدیلی لانے اور اطلاعات فراہم کرنے میں مدد ملتی ہے۔

طباعتی ذرائع ابلاغ میں برقی میڈیم کے داخل ہونے سے طباعتی میڈیم اتنا ہی الیکٹرانک ربرقی ہوگیا ہے جتنا کہ خود الیکٹرانک میڈیم۔اطلاعات کی نشر اور تحفظ میں الیکٹرانک میڈیا کا اہم کردار ہوتا ہے۔اطلاع کو ڈِیجیٹلائز کر کے ڈیٹا بینک میں محفوظ کیا جاسکتا ہے۔کمپیوٹر کو پرنٹر سے جوڑے جانے کے بعد طباعتی عمل بہت آسان، کارگر اور صاف ستھرا ہوگیا ہے۔ڈِیجیٹل فوٹو گرافی سے بھی طباعتی عمل کو تقویت ملی ہے۔حالیہ برسوں میں موبائل فون کا جتنا وسیع استعمال ہوا ہے اتنی ہی انٹرنیٹ کی اہمیت بڑھی ہے۔ انٹرنیٹ حقیقت میں کمپیوٹر سریز کا ایک عالمی نیٹ ورک بن گیا ہے جس سے عام شخص آسانی سے وابستہ ہوا ہے۔مختلف افراد کے خیالات کو جاننے، ملک و بیرون ملک کے اخبارات کو پڑھنے اور مختلف فرقوں،

طبقوں اور جماعتوں کے افراد سے تعلق قائم کرنے وغیرہ کو انٹرنیٹ نے آسان بنا دیا ہے۔ انٹرنیٹ اس وقت کا سب سے اہم اور طاقتور تکنیکی ترقی کا ثمرہ ہے۔ انٹرنیٹ کو حسب ذیل طریقے سے واضح کیا جا سکتا ہے:

''انٹرنیٹ، عالمی نشریات سے آراستہ کمپیوٹر پر مجموعی اطلاع کو ارسال کرنے اور مختلف کمپیوٹر کے استعمال کرنے والوں کے مابین تعاون اور تعلق قائم کرنے کا میڈیم ہے جس میں کسی مذہبی، ملکی و نسلی تفریق کے بغیر اطلاعات کا لین دین ممکن ہے۔''4

انٹرنیٹ کسی فرد کو متاثر کرنے اور ذاتی ضرورتوں کی تکمیل کرنے کا ایک اہم ذریعہ بن چکا ہے۔ انٹرنیٹ کے ذریعے ہی پوری دنیا میں اطلاعات کا فوری ارسال ممکن ہو سکا ہے۔ یہ کسی مسئلے کے حل کا ایک اہم ذریعہ بھی ہے۔ تیز رفتاری کے ساتھ اطلاعات کی پیشکش، اس کی اہم خوبی ہے۔ انٹرنیٹ کے بغیر نیو میڈیا ر سائبر میڈیا ر سوشل میڈیا کا تصور ممکن نہیں۔ انٹرنیٹ کی بدولت ہی ای۔میل (E-mail)، ہماری زندگی کا ایک اٹوٹ حصہ بن چکا ہے۔ تکنیکی طور پر اب ای۔میل کرنا کوئی مشکل کام نہیں رہا۔ ایک کم خواندہ شخص بھی اس کا استعمال آسانی سے کر سکتا ہے۔ موبائل نے اس عمل کو اور بھی آسان بنا دیا ہے۔ فیس بک، یو ٹیوب، واٹس ایپ، ٹویٹر، گوگل سرچ، وکی پیڈیا، ہینگ آؤٹ اور اسکائپ جیسے ایپلی کیشنز نے اسمارٹ فون کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ اس تکنیکی نظام نے اطلاعات کے شعبے میں گراں قدر ترقی کو ممکن بنا دیا ہے۔ بلاگ (Blog) بھی سائبر میڈیا ر نیو میڈیا ر سوشل میڈیا کا ایک ایسا ذریعہ رویب سائیٹ ہے جس پر لوگ اپنی رائے، سرگرمی اور تجربات کے متعلق لکھتے ہیں۔ دراصل بلاگ نے ذاتی اظہار رائے کو نئی بلندیوں تک پہنچا دیا ہے۔ بلاگ میں ذاتی اظہار رائے کی لامحدود قوت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روایتی میڈیا کو اس سے چیلنجز کا سامنا ہونے لگا ہے۔ بقول ڈاکٹر ترویدی:

''بلاگ نے کروڑوں عام لوگوں کے اظہار رائے اور ان کی تخلیقیت کو اسٹیج تو دیا ہی ہے، انٹرنیٹ کے مواد کو بھی بہت فروغ دیا ہے۔ بلاگنگ کو سوشل میڈیا کا لاثانی سانحہ کی شکل میں دیکھا جا رہا ہے جس نے لاتعداد لوگوں کو مضمون، خبر اور خیالات کے دائرے سے باہر لا کر مضمون، خبر اور خیالات پیش کرنے کی طاقت دی ہے۔ اپنی تمام حد اور بے حد کے باوجود بلاگ شخصی صحافت یا Citizen Journalism کا غیر رسمی لیکن مضبوط ذریعہ بن گئے ہیں۔ اتنا موثر ذریعہ کہ بلاگوں یا سوشل میڈیا کو روایتی میڈیا کے لیے چیلنج تک تسلیم کیا جانے لگا ہے۔ ایک غیر پابند اور غیر تجارتی میڈیم ہونے کی وجہ سے بلاگ آپ کو وہ بات کہنے کا موقع دیتا ہے جو کوئی دیگر میڈیم نہیں دیتا ہے۔''5

بلاگ کو الیکٹرانک ڈائری بھی کہا جا سکتا ہے جو انٹرنیٹ کے ذریعے لوگوں کو جوڑنے کا کام کرتا ہے۔ روایتی ڈائری کے برعکس ویب پر مبنی ڈائری کو بلاگ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ اسے عام کیا جاتا ہے جسے کوئی بھی شخص بغیر کسی رکاوٹ کے پڑھ سکتا ہے۔ یہ افکار و خیالات کو ظاہر کرنے کا ایک طاقتور ذریعہ ہے۔

فیس بک دنیا کی سب سے بڑی نیٹ ورکنگ سائیٹ ہے۔ جس کی بنیاد مارک زکربرگ نے اپنے دوستوں کے تعاون سے کیلی فورنیا، امریکہ میں 2004 میں رکھی تھی۔ یہ ایک ایسا ذریعہ رمیڈیم ہے جس میں صارفین کو سیٹنگ صفحہ کو قابو کرنے کے علاوہ اپنی پوسٹ، تصویر اور ٹیگ کو منظم کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔ فیس بک جیسے سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس آج کے دور میں سماجی انقلاب کی علامت ہیں۔ سوشل میڈیا نے ہماری زندگی کے طریقۂ کار کو تبدیل کر دیا ہے۔ ہماری روزمرہ زندگی کا بڑا حصہ ایسے ہی سائٹس کے استعمال میں صَرف ہوتے ہیں۔ فیس بک عام شخص کے لیے خیال ظاہر کرنے، متفق یا غیر متفق ہونے، عام رائے بنانے، ردعمل ظاہر کرنے اور لوگوں کو جوڑنے کا ایک موثر ذریعہ ہے:

''فیس بک ترسیل کی دنیا میں لمبی چھلانگ ہے۔ یہ ایک ایسا سماجی اسٹیج ہے جس پر آپ تجارت، مکالمہ، غور و خوض، بحث و مباحثہ، سیاسی مہم، سماجی گول بندی وغیرہ کر سکتے ہیں۔ یہ ایسا اسٹیج ہے جو ذاتی اور سماجی ایک ہی ساتھ ہے۔ یہ ایک ایسا اسٹیج بھی ہے جو ترسیل کے ساتھ ساتھ آپ کے اوپر بھی نگرانی کرتا ہے۔ فیس بک پر ہر ماہ چار بلین سے زیادہ اطلاعات استعمال کنندگان کے ذریعے شراکت کی جاتی ہیں۔ آج فیس بک ساری دنیا میں اطلاعات کا سب سے بڑا خزانہ ہے۔''6

فیس بک کے علاوہ ٹویٹر، یوٹیوب، انسٹاگرام، ایمو، پاڈ کاسٹنگ نے اس عمل کو مزید تیز کر دیا ہے۔ سوشل میڈیا، ویب جرنلزم، میٹریمونیل، جاب سیکر، ای۔ تجارت، ای کامرس، ای۔جرنل، ویب اشتہار، کمپیوٹر گیم، شخصی صحافت، ای بینکنگ، ای شاپنگ، آن لائن ایجوکیشن، سوشل مارکیٹنگ وغیرہ کی تشہیر و اشاعت کا اہم ذریعہ بن چکا ہے۔ دراصل سماج پر سوشل میڈیا کے گہرے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ آج سماج کا ہر فرد اس سے شدید متاثر ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سوشل میڈیا آج کی ضرورت بن چکا ہے۔

سوشل میڈیا، افراد کی شناخت، صلاحیت کے اظہار، افکار و نظریات کے ترجمان کا ایک موثر ذریعہ بن چکا ہے۔ بہت سے ایسے فنکار، جنھیں اظہار و ابلاغ کا موقع نہیں ملا اور دنیا کی نظروں سے غائب رہے، وہ سوشل میڈیا کے ذریعے پل میں شہرت کی بلندی پر پہنچ گئے۔ ایسے بھی افراد ہیں جو ظلم و جبر کے شکار ہوئے اور انھیں انصاف کا کوئی راستہ نہ ملا لیکن اس پلیٹ فارم نے ان کے حق میں آواز بلند کی اور ان کے لیے انصاف کا راستہ ہموار کیا۔

سوشل میڈیا کا استعمال اب بڑے پیمانے پر تعلیم و تعلم کے لیے بھی ہو رہا ہے۔ بڑے بڑے کوچنگ انسٹی ٹیوٹ کھل گئے ہیں، جو پیشہ ورانہ کورسیز میں داخلہ کے لیے آن لائن خدمات انجام دے رہے ہیں۔ تعلیمی اداروں میں بھی اساتذہ اپنے نصاب کا مواد، ویڈیو فارم میں تیار کر رہے ہیں۔ فاصلاتی اداروں میں خصوصی طور پر ویڈیو لکچرز تیار کرائے جا رہے ہیں۔ آج یوٹیوب جیسے پلیٹ فارم پر بے شمار ویڈیو لکچر دستیاب ہیں۔ ابتدائی درجے سے اعلیٰ درجے تک کے کورسیز کے الیکٹرانک مواد اور ویڈیو لکچرز مختلف سائٹس پر موجود ہیں، جن سے طلبہ موثر طور پر استفادہ کر رہے ہیں۔

آج الیکٹرانک دنیا میں اطلاعات کا سیلاب ہے۔ ہر شخص اپنی جگہ پر اطلاع فراہمی کا ایک ذریعہ ہے۔ اس وقت پوری دنیا میں ویب نیوز چینلوں کی بھرمار ہے۔ اس طرح کے چینلس عام لوگوں کی آواز کو بلند کرنے میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔ سوشل میڈیا کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے روایتی ٹی وی چینلس نے بھی اپنا نیوز ویب پورٹل لانچ کر دیا ہے۔ جسے لوگ اپنے موبائل فون کے ذریعے بہت آسانی اور دلچسپی کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ اسی طرح ای۔جرنل کا رواج بھی بڑھا ہے۔ لوگ بڑی تعداد میں اپنے رسائل و جرائد کو ویب پورٹل پر اپلوڈ کر رہے ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے ایسے رسائل کی نوعیت ادبی، سیاسی، سماجی، اقتصادی، تجارتی، سائنسی اور کھیل کود کی ہے۔

سوشل میڈیا کا استعمال بینکنگ اور تجارتی شعبوں میں بھی بڑے پیمانے پر کیا جا رہا ہے۔ نیٹ بینکنگ، گوگل پے اور دیگر بینکنگ ایپ کی سہولیات نے لین دین کے نظام کو بہت آسان کر دیا ہے۔ بینکوں کو اپنی اسکیم، اشتہار اور دیگر پروگرامس کے متعلق اطلاعات کو لوگوں تک پہنچانے میں مدد مل رہی ہے۔ امیزون اور فلپ کارٹ جیسے ویب سائیٹس نے ای شاپنگ کے میدان میں ایک نئی بلندی قائم کی ہے۔ ان کے صارفین کی تعداد میں ہر روز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ان کے ذریعے لوگ گھر بیٹھے اپنی پسند کے سامان کی خریداری کر رہے ہیں۔ اس طرح کی سائٹس نے نہ صرف صارفین کی پسند اور سہولت کا خیال

رکھا ہے بلکہ ان کے اعتماد کو بھی بحال کیا ہے۔

ویب اشتہار کے میدان میں بھی خاطر خواہ ترقی ہوئی ہے۔ سوشل میڈیا کے ذریعے چھوٹی بڑی سبھی کمپنیاں اپنی اشیا کے اشتہار کو عوام تک بڑی آسانی سے پہنچا رہے ہیں۔ اس وقت بہت سے ویب پورٹل انھیں اشتہارات کے ذریعے اپنے اخراجات کو پورا کر رہے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی آرٹسٹ یا عام شخص کا ویڈیو وائرل ہو جاتا ہے تو اسے بھی ویب پورٹل، مالی حصے داری میں شریک کرتے ہیں۔ ایسے بہت سے آرٹسٹ، صحافی اور دیگر پیشہ ور افراد ہیں جنھوں نے یوٹیوب اور فیس بک جیسے ویب پورٹل پر اپنے خود کے چینل بنا رکھے ہیں جو ان کی آمدنی کا بڑا ذریعہ ہیں۔

سوشل میڈیا کے باعث تہذیبی اشتراک کو خصوصی تقویت مل رہی ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے دنیا بہت وسیع و بسیط ہے لیکن سوشل میڈیا نے ہر سرحد کو مسمار کر دیا ہے۔ ہم جس خطے اور نامعلوم افراد کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے لیکن آج ان سے آگہی رکھتے ہیں۔ ان کا وجود، تشخص اور تہذیب اب ہمارے لیے نئی نہیں ہے۔ ہم ان کے رہن سہن، خورد نوش، تہذیب و ثقافت اور وضع قطع سے پل میں واقف ہو جاتے ہیں۔ کسی ایک خطے سے دوسرے خطے تک یا کسی ایک ملک سے دوسرے ملک تک، کسی تہذیب کی رسائی میں خاصا وقت لگتا تھا لیکن آج اس مرحلے کی تکمیل بہت کم وقت میں ممکن ہے۔ دراصل سوشل میڈیا، تہذیبی لین دین اور تہذیبی فہم و ادراک میں بہت کارگر ثابت ہوا ہے۔

سوشل میڈیا کے صارفین میں بڑا حصہ نئی نسل کا ہے۔ چونکہ یہ تفریح و تفنن کا بھی ایک اہم ذریعہ ہے، لہٰذا نوعمر صارفین اپنا زیادہ وقت موبائل اور انٹرنیٹ پر صرف کرتے ہیں۔ ان کی یہ دلچسپی پہلے عادت میں تبدیل ہوتی ہے اور پھر ایک نشہ بن جاتی ہے۔ وہ پل بھر کے لیے بھی اپنے موبائل کو خود سے الگ نہیں ہونے دیتے۔ وہ اپنے گھر اور سماج سے رفتہ رفتہ دور ہوتے جاتے ہیں۔ دراصل سوشل میڈیا ورچول دنیا میں لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب تو لاتا ہے لیکن ذاتی طور پر ہر فرد کو تنہا کر دیتا ہے۔ دوسرا اثر یہ ہوتا ہے کہ ایک فرد خود نمائی کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ لوگ اسے دیکھیں، اس کی پوسٹ کو پڑھیں اور اسے پسند کریں۔ لہٰذا وہ ہر وقت اپنی پوسٹ کو دیکھتا رہتا ہے کہ اس پر کتنی پسند اور رائے درج ہیں۔ اسے ہمیشہ عدم تحفظ کا احساس رہتا ہے۔ اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر وہ سوشل میڈیا سے دور ہوا تو لوگوں کی نظروں اور دلوں سے دور ہو جائے گا۔ وہ رفتہ رفتہ ذہنی و نفسیاتی تناؤ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ موبائل فون کے زیادہ استعمال سے اس میں تھکاوٹ اور کمزوری پیدا ہونے لگتی ہے۔ وہ مختلف قسم کی بیماریوں سے دوچار ہونے لگتا ہے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ مختلف ممالک میں موبائل کے عادی صارفین کے لیے معالجہ کیمپ چلائے جا رہے ہیں جہاں بچوں کو داخل کرایا جاتا ہے تاکہ ان کا موبائل کا نشہ ختم ہو سکے۔

سوشل میڈیا پر چل رہی عریاں تصویریں اور مواد نوجوانوں کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں جرائم اور ظلم و تشدد کی پیش کش سے بھی ذہن پر برا اثر پڑتا ہے۔ نوعمر صارفین پر ایک منفی اثر یہ ہوا ہے کہ وہ خود کا موازنہ دوسرے سے کرنے لگتے ہیں۔ انھیں سوشل میڈیا کے ذریعے مختلف پارٹیوں، موسیقی فسٹیول اور دیگر تفریحی تقریبات کی اطلاع ملتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ دوستوں کی کہانیوں کو پڑھنے اور ان کی سرمستی میں شرابور تصویروں اور ویڈیوز کو دیکھنے سے ان میں احساسِ محرومی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ انھیں یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ ایسی تقریبات کا حصہ نہیں بن سکتے۔ ان کی طرح آزادی سے اپنی بات نہیں کہہ سکتے اور نہ ہی اپنے جسم کی نمائش کر سکتے ہیں۔ لہٰذا وہ احساس کمتری کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ سماج کے نامساعد حالات کا بھی برا اثر پڑتا ہے۔ ان میں کچھ تو ڈپریشن کے بھی شکار ہو جاتے ہیں۔ کچھ تو ایسے ہیں جو غلط سنگت میں پڑ کر اپنی زندگی برباد کر بیٹھتے ہیں۔ سوشل میڈیا نے نوجوانوں کی طرز گفتگو، رہن سہن، آداب و اطوار، خورد و نوش اور ذہنی، فکری و جذباتی رویے کو شدید متاثر کیا ہے۔

سوشل میڈیا کی ایک بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں راز داری کے حقوق کی صریحاً پامالی ہوتی ہے۔ اس میں صارفین کی ذاتی معلومات ان کے علم یا رضامندی کے بغیر الیکٹرانک ٹریکنگ اور تھرڈ پارٹی ایپلی کیشنز کے ذریعے حاصل کی جاتی ہیں۔ اس طرح کی معلومات تیسرے فریق کو فروخت کرنے کا معاملہ بھی سامنے آ چکا ہے۔ دراصل سوشل میڈیا میں پردہ داری کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اگر آپ نے ایک بار کسی پوسٹ کو شیئر کر دیا تو وہ سب کے لیے عام ہو جاتا ہے۔ نوعمر صارفین کو یہ سمجھ نہیں ہوتی کہ اپنے ذاتی ڈیٹا کو کس طرح محفوظ رکھنا ہے۔ وہ بہت جلد اپنا موبائل نمبر، ای میل آئی ڈی اور اسکول کا پتہ وغیرہ شیئر کر دیتے ہیں۔ صارفین کی ایک مجبوری یہ ہے کہ زیادہ تر ایپلی کیشنز ذاتی اطلاعات کے بغیر ڈاؤن لوڈ نہیں ہو سکتے۔ ذاتی ڈیٹا عام ہونے کی وجہ سے سائبر جرائم میں روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ صارفین کا بینک اکاؤنٹ پر بھی سائبر ہیکروں کی نظر رہتی ہے۔ صارفین کی ایک چھوٹی سی غلطی بھی بڑے نقصان کا سبب بن جاتی ہے۔

سوشل میڈیا میں جو خامیاں ہیں ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے ذریعے گروہ بندی، منافرت، فرقہ واریت، تہذیبی تصادم، سائبر جرائم، ٹھگی کے معاملات، ذہنی تناؤ، مایوسی و محرومی، احساس کمتری، نجی معلومات کا بے جا استعمال، راز داری کے حقوق کی پامالی وغیرہ کو انجام دیا جا رہا ہے لیکن ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ سوشل میڈیا عام لوگوں کی ایک مضبوط آواز ہے۔ یہ تہذیبی و ثقافتی اختلاط اور شراکت کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اس سے علمی، سماجی، تجارتی و اقتصادی سرگرمیوں کو خصوصی فروغ ملتا ہے۔ عوام کی روزمرہ زندگی تیزی سے ڈیجیٹل دنیا میں تبدیل ہو رہی ہے۔ یہ خاص و عام کی ضرورت اور ان کی زندگی کا ایک ناگزیر حصہ بن چکا ہے۔ اس نے پوری دنیا کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کر دیا ہے۔ یہ کوئی عام سانحہ نہیں بلکہ اطلاعات و تکنالوجی کے میدان میں ایک عظیم انقلاب ہے۔ اس کی خامیوں سے قطع نظر اس کی خوبیوں کی برکتیں بھی کسی نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ لیکن اس کے استعمال میں سخت احتیاط کی ضرورت ہے۔ سوشل میڈیا کے جمہوری اقدار کو قائم رکھنا، سماج میں بھائی چارہ و ہم آہنگی کو برقرار رکھنا، تہذیبی و ثقافتی اقدار کو مضبوط کرنا، باہمی وجود کو تسلیم کرنا اور ذات، مذہب و نسل سے بالاتر ہو کر پیغامِ محبت کو عام کرنا، ہم سب کی ذمے داری ہے۔ دراصل سوشل میڈیا عام انسان کے جذبات کا ترجمان اور جمہوریت کا چوتھا ستون ہے۔ اس کے تقدس اور اعتماد کی حفاظت کسی بھی جمہوری نظام حکومت اور عوام کے لیے اشد ضروری ہے۔

حواشی و حوالے

1. Kaplan Andreas, Michael Haenlein , "Users of the worlds, unite! The challenges and opportunities of social media", 2010, Business Horizons 53(1),P-61.
2. H. Kietzmann, and Kristopher Hermkens , "Social media? Get serious! Understanding the functional building blocks of social media", 2011, Business Horizons 54: P-245.
3. ڈاکٹر سشیل ترویدی، سوشل میڈیا، ص76
4. ایضاً، ص57
5. ایضاً، ص59
6. ایضاً، ص60

■

Dr. Ahamad Khan
Associate Professor & Director I/c
Editor, Adab-o-Saqafat
Centre for Urdu Culture Studies
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad-500032
Mob: 9868701491
Email: ahmadk71@yahoo.co.in

خصوصی گفتگو

غضنفر اقبال

اردو ایک بین العلومی زبان ہے

پروفیسر محمد نعمان خاں

پروفیسر محمد نعمان خاں (1952) پختہ کار نثر نگار ہیں۔ ان کی تحاریر گہرے مطالعے اور معروضی تجزیے پر مبنی ہوتی ہیں۔ اپنے وطن بھوپال اور فلسفہ تعلیمات کے متعلق انھوں نے انتہائی معتبر تحقیقی اور علمی کام کیا ہے۔ محمد نعمان خاں کا تحریری ادب ان کی ادبی خدمات کا نمایاں عنوان ہے۔

غضنفر اقبال: پروفیسر نعمان صاحب! سردار دوست محمد خان کا شہر، بھوپال آپ کا شہر آرزو ہے۔ بھوپال کے ادب و تہذیب پر آپ نے بہت لکھا ہے۔ سوال یہ ہے کہ مشاہیر ادب کا بھوپال سے تعلق کتنا گہرا رہا ہے؟

محمد نعمان خان: بیت الکمال، دارالاقبال، فرخ فال، شہر غزل، بغداد الہند، بھوپال کی سیاسی و ادبی قدامت مسلم ہے۔ بھوپال کے تاریخی شواہد اس امر پر اصرار کرتے ہیں کہ گوتم بدھ کے عہد سے بھی قبل، یہ علاقہ اونتی کے راجا پردھوت کی ریاست کا حصہ تھا اور موریہ عہد میں یہ علاقہ سمراٹ اشوک کے زیرِ نگیں آگیا تھا۔ موجودہ بھوپال کا باقاعدہ قیام، عہد وسطیٰ میں اس کے بانی پرمار خاندان کے راجا بھوج نے ایک عظیم الشان تالاب اور پشتہ بنوا کر کیا۔

پرمار خاندان کے زوال کے بعد اس علاقے پر گونڈ راجاؤں کی حکومت قائم ہوئی۔ گونڈ رانی کملاپتی اس کی آخری فرماروا تھیں، جنھوں نے افغان سردار دوست محمد خان کو بھائی بنایا اور ان کے حق میں ریاست سے دست بردار ہوگئیں۔

بانیِ ریاست بھوپال، سردار دوست محمد خان نے 1709 میں مسلم ریاست بھوپال کی بنیاد رکھی، جس کے تحت تقریباً ڈھائی سو سال تک نو نوابین اور چار بیگمات نے حکومت کر کے اپنی علمی، ادبی، مذہبی اور تہذیبی دوستی کا ثبوت فراہم کیا۔ بھوپال کے پہلے شاعر قاضی محمد صالح (مصنف: مثنوی 'اخلاق حسنہ'، 1707) اور پہلے صاحب دیوان شاعر نواب جہاں گیر محمد خاں دولہ اور پہلی صاحب دیوان شاعرہ نواب شاہ جہاں بیگم تاجورؔ و شیریںؔ و ترنؔ تسلیم کی جاتی ہیں۔

فرمانروانِ بھوپال کی علمی، ادبی دوستی اور ادب نوازی اور اہلِ بھوپال کی وقیع علمی، ادبی، شعری اور مذہبی خدمات کے سبب بھوپال کو ہمیشہ نہ صرف مرکزِ ادب کی حیثیت حاصل رہی بلکہ ہر عہد میں بے شمار مشاہیر علم وادب کی آمد و قیام کا لامتناہی سلسلہ بھی رہا۔ ہندوستان کے جن مشاہیر علم و زبان و مذہب و ادب نے ریاست بھوپال سے وابستہ ہو کر اہم علمی، ادبی، مذہبی، تعلیمی خدمات انجام دی ہیں، ان میں قاضی محمد معظم (مصنف: تفسیر ہندی) مفتی خیر اللہ صدیقی (مصنف: فقہ ہندی) شیخ امان اللہ حسینی (متعدد مثنویات کے خالق) شاہ رؤف احمد رافت (تلمیذ جرأت) شیخ عبدالواحد مسکین (تلمیذ مومن) نواب صدیق حسن خان توفیق، محمد عباس رفعت شروانی (تلمیذِ غالب) خان محمد خان، شمیر (تلمیذ غالب) ارشاد احمد میکش (تلمیذِ غالب) رجب علی بیگ سرور، حکیم اصغر حسین اصغر فرخ آبادی (بھوپال کے پہلے اردو اخبار عمدۃ الاخبار کے مدیر) امیر مینائی، علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی، اسلم جے راجپوری، مولوی عبدالرزاق مصنف البرامکہ، نیاز فتح پوری، کوثر چاند پوری، علامہ محوی صدیقی لکھنوی، جگر مرادآبادی، حفیظ جالندھری، سرسید احمد خان، سرراس مسعود، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، سید امجد علی اشہری، قدرت اللہ قدرت بنارسی، مانی جائسی، محمد امین زبیری، علامہ سر محمد اقبال، مشرف جہاں بیگم ثروت (تلمیذ امیر مینائی)، مولانا احسن بلگرامی (منشی جمیل احمد سہوانی)، فدا علی فارغ، نامی خیر آبادی، سید ظہیر الدین ظہیر دہلوی، مرزا شاغل دہلوی، مولوی احسن اللہ خاں ثاقب بدایونی، حسن آرا بیگم تمکین، عبدالشکور اخلاص (تلمیذ امیر مینائی) شاہ اسدالرحمٰن قدسی، صفدر مرزاپوری (تلمیذ جلیل مانک پوری)، احمد علی شوق قدوائی، سید افتخار الدین مضطر خیر آبادی، مولوی محمد مہدی، پی گھوشال (بنگالی ادیب)، مائل نقوی، شوکت تھانوی، شرافت علی صہبا لکھنوی، جاں نثار اختر، صفیہ اختر، جاوید اختر، شفا گوالیاری، گیان چند جین، ابو محمد سحر، عبدالقوی دسنوی، شہاب اشرف، تربینی سرن شاد مین پوری، مہ جبیں خمار کلکتوی، ناز کرمانی (نواسی ریاض خیر آبادی)، سرشار کسمنڈی، ڈاکٹر سید عابد حسین، سلمان الارشد، شاغل فخری، معین احسن جذبی، نصیر پرواز، ارشد صدیقی، مسلم ساگری، دلکش ساگری، رہبر جون پوری، آنند موہن اعجاز، کوثر جہاں، شفیقہ فرحت، وغیرہ کے علاوہ انڈو یوروپین اور فرانسیسی نسل سے تعلق رکھنے والے مشاہیر شعر و ادب میں حکیم شہزادو مسیح فطرت، حکیم الیاس مسیح عبرت، حکیم الیاس ڈی سلوا عاصی، حکیم فارنس لاغر، اچھے صاحب نفیس، یوسف صاحب دلارے عاشق، فلورا سارکس شریر وغیرہ کے نام

> **اردو زبان اگر چہ جدید ہندوستانی زبان ہے لیکن کم مدت میں اس سے متعلق ادیبوں اورشاعروں نے کئی اہم تصانیف اور کلیات یادگار چھوڑے ہیں۔ اردو میں کلاسیکی، نوکلاسیکی، رومانی، ترقی پسند، جدیدیت اور مابعد جدیدیت ہر رجحانات و نظریات کے حامل مصنفین نے مختلف اصناف ادب میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا فنکارانہ اظہار کرکے جو وقیع ادبی کام انجام دیے ہیں انہیں اردو ادب عالیہ یا کسی بھی ترقی یافتہ زبانوں کے ادب کے سامنے فخریہ طورپر پیش کرسکتے ہیں۔ماضی کے علاوہ عصر حاضر میں بھی مختلف علمی وادبی موضوعات پر جو بے شمار تحقیقی، تنقیدی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ان میں تمام نہ سہی لیکن بیشتر کتابیں معیاری قراردی جاسکتی ہیں۔**

بہ طور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ ان تمام مشاہیر ادب نے ریاست بھوپال اور انضمام ریاست کے بعد کے بھوپال سے وابستہ ہو کر اپنی اہم، وقیع اور تاریخ ساز علمی، ادبی، مذہبی، تہذیبی اور تعلیمی خدمات انجام دی ہیں، جنھیں فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔

غ ا: دورِ حاضر میں لکھی جانے والی تحقیقی وتنقیدی تحریروں کو آپ کیا نام دیں گے؟

م ن خ: اردو زبان اگر چہ جدید ہندوستانی زبان ہے لیکن کم مدت میں اس سے متعلق ادیبوں اور شاعروں نے کئی اہم تصانیف اور کلیات یادگار چھوڑے ہیں۔ اردو میں کلاسیکی، نوکلاسیکی، رومانی، ترقی پسند، جدیدیت اور مابعد جدیدیت ہر رجحانات ونظریات کے حامل مصنفین نے مختلف اصناف ادب میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا فنکارانہ اظہار کرکے جو وقیع ادبی کام انجام دیے ہیں انھیں اردو ادب عالیہ یا کسی بھی ترقی یافتہ زبانوں کے ادب کے سامنے فخریہ طور پر پیش کرسکتے ہیں۔ ماضی کے علاوہ عصر حاضر میں بھی مختلف علمی وادبی موضوعات پر جو بے شمار تحقیقی، تنقیدی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں تمام نہ سہی لیکن بیشتر کتابیں معیاری قرار دی جاسکتی ہیں۔

غ ا: صدیق رشاد ملا رموزی (1896-1952) کے فکر وفن پر آپ کی گہری نظر ہے۔ ملا رموزی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ گلابی اردو کے موجد تھے۔ گلابی اردو کی روایت کیا ہے؟ یہ کن ادب پاروں میں تلاش کی جاسکتی ہے؟

م ن خ: ظریف الہند، ضیاء الملک موجدِ گلابی اردو محمد صدیق رشاد، ملا رموزی کا شمار اردو کے صف اول کے معروف ومقبول طنز ومزاح نگار، کالم نویس شعرا وادبا میں ہوتا ہے۔ ملا رموزی ذہین اور وسیع المطالعہ قلم کار تھے۔ ان کا مشاہدہ بہت وسیع تھا۔ وہ ملکی اور بین الاقوامی سیاسی، سماجی حالات پر گہری نظر رکھتے تھے۔

انگریزوں کے جبر واستبداد اور ظلم وستم سے متاثر ہو کر صغر سنی ہی میں انھوں نے قلم وقرطاس سے اپنا رشتہ مستحکم کرلیا تھا۔ 1917 میں باقاعدہ طور پر ادبی زندگی کا آغاز کیا اور پریس ایکٹ قانون کی گرفت سے محفوظ رہنے کی خاطر اردو نثر میں ایک نئے طرز اسلوب یعنی 'گلابی اردو' کا آغاز کیا، جس نے اردو ادب وصحافت میں نہ صرف انقلاب برپا کردیا بلکہ ملا رموزی کو بھی غیر منقسم ہندوستان کے ادبی حلقوں میں متعارف کرا کے مقبول خاص وعام بنادیا۔

ملا رموزی کی تحریریں ہندوستان کے ہر اخبار اور رسالے میں نمایاں طور پر شائع ہوتی تھیں اور وہ اس کا معاوضہ بھی وصول کرتے تھے۔ اس طرح لکھنا پڑھنا اور چھپنا ملا رموزی کا محبوب مشغلہ بھی تھا اور ذریعۂ معاش بھی تھا۔ انھوں نے مختلف عصری، قومی، سیاسی، سماجی اور ادبی موضوعات پر سیکڑوں مضامین، مقالات، کالم، تبصرے، منظومات، غزلیات اور خطوط تحریر کیے اور گلابی شاعری کے نام سے طنزیہ مزاحیہ شاعری بھی کی۔ وہ 30 کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کا کلیات چھے جلدوں (مرتبہ خالد محمود) میں اور ایک مونوگراف (مصنف محمد نعمان خان) قومی کونسل برائے فروغ اردو نئی دہلی سے شائع ہو چکا ہے۔ انگریز سامراج کے خلاف لکھا گیا ملا رموزی کا پہلا مضمون 'گلابی اردو' کے نام سے رسالہ 'کانگریس' (دہلی) 27 دسمبر 1917 کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ ملا رموزی نے 1917 سے 1925 تک مختلف عصری موضوعات پر گلابی اردو میں مضامین ومقالات، کالم تحریر کیے اور اس کے بعد سادہ طرز اسلوب میں لکھنے لگے۔

'گلابی اردو' کی خوبی اس کا مخصوص طرز اظہار تھا۔ یہ دراصل عربی کے اردو تراجم کی طرز خاص کی طرح لکھی جاتی تھی۔ اس کے مقاصد پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے ملا رموزی نے لکھا ہے:

"اس کا مقصد یہی ہے کہ آپ کو ہنسی ہنسی میں سیاست، مذہب، تہذیب وتمدن، اخلاق ومعاشرت اور ادب و قومیت کے باریک نکتے سمجھا دیے جائیں، جن کا تعلق آپ کی روزمرہ زندگی سے ہے۔ لہٰذا ایسے حالات میں بعض نکتے ایسے بھی ملیں گے جن کے اندر مذاق اور دل لگی کے علاوہ انتہائی متانت وسنجیدگی اختیار کی جائے گی.....

میرا مقصدِ تحریر ہمیشہ یہ رہا ہے کہ قوم میں زوال وغلامی غیر قوی علوم اور ذہنیت پیدا ہوگئی ہے..... میں چاہتا ہوں کہ رونے والی قوم میرے ذخیرۂ تحریر سے زندہ دلی، خوش دماغی، خوش طبعی کی امنگ اور مسرت اور زندگی کی بہاریں حاصل کرے۔"

'گلابی اردو' دراصل ایک دلچسپ پیرایۂ اظہار تھا جو کہ خلافت تحریک اور تحریکِ آزادیِ ہند کی حمایت اور افرادِ قوم کو بیدار کرنے اور ان کی اصلاح کی خاطر اختیار کیا گیا تھا۔

غ ا: نئی نسل کو اردو ادب کی طرف راغب کرنے کے لیے کیا اقدامات کرنے ہوں گے؟

م ن خ: اردو محض زبان ہی نہیں، ایک مخصوص تہذیب بھی ہے۔ اردو محض علمی، ادبی زبان ہی نہیں کروڑوں انسانوں کی مادری اور ثانوی زبان بھی۔ اردو زبان وادب کی ترقی اور ترویج واشاعت میں مختلف مذاہب سے متعلق کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ اردو میں محض شعری وادبی سرمایہ ہی محفوظ نہیں بلکہ یہ ایک بین العلومی زبان بھی ہے۔ اردو زبان میں ہر موضوع میں اظہار کی مؤثر اور بھرپور صلاحیت موجود ہے۔ یہ ہماری مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کی ترجمان ہے۔

ہندوستان کثیر اللسان، کثیر الادیان ملک ہے۔ اس کے طول وعرض میں سیکڑوں بولیاں اور زبانیں بولی اور استعمال کی جاتی ہیں۔ بین الاقوامی یا بیرونی زبانوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کے سبب آج سبھی ہندوستانی زبانوں کے وجود کو خطرات لاحق ہیں۔ سبھی ہندوستانی زبانوں کی

> **اردو محض زبان ہی نہیں،ایک مخصوص تہذیب بھی ہے۔ اردو محض علمی،ادبی زبان ہی نہیں کروڑوں انسانوں کی مادری اور ثانوی زبان بھی۔اردو زبان وادب کی ترقی اور ترویج واشاعت میں مختلف مذاہب سے متعلق کتابیں شائع ہوئی ہیں۔اردو میں محض شعری وادبی سرمایہ ہی محفوظ نہیں بلکہ یہ ایک بین العلومی زبان بھی ہے۔ اردو زبان میں ہرموضوع میں اظہار کی مؤثر اوربھرپور صلاحیت موجود ہے۔یہ ہماری مشترکہ گنگا جمنی تہذیب کی ترجمان ہے۔**

بقا، تحفظ اور ترقی کے لیے بھی ہندوستانیوں کو عملی کوششیں کرنی ہوں گی۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دیگر ہندوستانی علاقائی زبانوں کی طرح اردو زبان کا کوئی مخصوص علاقہ یا صوبہ نہیں ہے لیکن اردو زبان کشمیر سے کنیا کماری اور آسام سے گجرات تک اور بعض بیرونی ممالک میں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

ہندوستان میں اردو کی تدریس تین سطحوں یعنی مادری زبان، ثانوی زبان اور تیسری زبان کے بطور عمل میں آتی ہے۔ اردو زبان میں ایسی کشش، جاذبیت اور شیرینی ہے جو ہر سننے والے کو متاثر کرتی ہے اور جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے، وہ بھی اسے بولنا یا سیکھنا چاہتے ہیں۔

آزادی کے بعد اردو زبان کا سب سے بڑا مسئلہ دراصل اس کی تدریس کا معقول اور مناسب انتظام نہ ہونا ہے۔ اس امر میں خود اہلِ اردو کی بھی اردو کے تئیں غفلت اور بے اعتنائی شامل ہے۔

اس سنجیدہ و اہم مسئلے کے حل کے لیے اردو والوں کو ہی پیش رفت کرنی ہوگی۔ اپنے گھروں اور اطراف میں اردو کی فضا پیدا کرنی ہوگی۔ اپنے بچوں کو اردو پڑھانا اور سکھانا ہوگا۔ اردو اخبارات و رسائل اور کتب خرید کر پڑھنا ہوگا۔ روزمرہ زندگی کے کاموں، شادی کے دعوت ناموں، ناموں اور دکانوں کی تختیاں اور بورڈ دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں بھی لکھنا ہوگا۔

ابتدائی، اعلیٰ ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطحوں پر اردو تعلیم و تدریس کے لیے ماحول سازی کرنی ہوگی۔ اردو میڈیم میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بچوں کو آمادہ کرنے کا عملی منصوبہ بنانا ہوگا۔ اردو کو روزگار سے منسلک کرنے کے لیے اقدامات کرنے ہوں گے۔ تراجم کی جانب متوجہ کرنا ہوگا۔ اردو رسم الخط سے واقف کرانا ہوگا تاکہ SMS میں بھی اس کا استعمال کیا جا سکے۔

مذکورہ بالا تمام کام ایک مشن کی طرح رضا کارانہ طور پر انجام دینا ہوگا۔ تبھی ہم اپنی مادری زبان کا حق ادا کر پائیں گے۔ یہ فرض شناس، زندہ قوموں کی علامت بھی ہے اور بنیادی فریضہ بھی۔

غ ا: عہدِ موجود کا زوال پذیر تعلیمی معاشرہ آپ کے نزدیک کیا تاثر قائم کرتا ہے؟

م ن خ: عجیب بات ہے کہ عہدِ حاضر میں سائنس و ٹکنالوجی اور ذرائع ابلاغ عامہ میں جوں جوں ترقی ہو رہی ہے، انسانی و اخلاقی اقدار اسی تیزی سے زوال کا شکار ہو رہی ہیں۔ انسان نے خلا میں قدم ضرور رکھ دیا ہے لیکن زمین پر اس کے قدم اکھڑنے لگے ہیں۔ وہ انسانی اوصاف جو انسانِ کامل کی نشانیاں تھے، ان کا وجود اب اس طرح نظر نہیں آتا ہے۔ قومی مفادات نے ذاتی منفعت کی حیثیت اختیار کر لی۔ انسان اور حیوان کے مابین تمیز ختم ہوتی جا رہی ہے۔ ہر جگہ مادہ پرستی اور نفسی نفسی کا دور دورہ ہے۔ انسان کے قدم ترقی معکوس کی جانب گامزن ہیں۔ انسانیت نوحہ کناں ہے۔

عصر حاضر میں برقی میڈیا یا جدید ذرائع ابلاغ عامہ نے شان دار ترقی کی منازل طے کرلی ہیں اور سوشل میڈیا کا چلن بھی عام ہے. انٹرنیٹ کی سہولتوں نے جہاں معلومات عامہ وخاصہ کے نئے نئے در وا کردیے ہیں اور وہ ہمیں نئے نئے جہانوں کی سیر کرا رہا ہے،وہیں اس نے کئی اخلاقی مسائل بھی پیدا کر دیے ہیں.اس کا مثبت وتعمیری رخ جس قدر امید افزا اور مفید ہے بعض منفی اثرات اسی قدر مضر بھی ہیں.اس ضمن میں اعتدال وتوازن کی اشد ضرورت ہے.

ایسے نازک اور ناگفتہ بہ حالات و ماحول میں ہمارا قومی، ملی، اخلاقی اور تعلیمی نظام بری طرح سے متاثر ہو رہا ہے۔

نئی نسل کو ان حالات سے آگاہ کرنا اور ان کی صحیح تعلیم و تدریس و تربیت و ذہن سازی نہایت ضروری ہے۔ تاکہ وہ باعزت، باوقار، پرسکون اور کامیاب عملی زندگی سے ہم کنار ہو کر اپنی اور اپنے ملک و قوم کی بہتر خدمات انجام دے سکیں۔ قومی تعلیمی نصاب میں اعلیٰ سماجی، اخلاقی اور تہذیبی اقدار کی شمولیت اور ہمارے شان دار ماضی سے واقفیت نہایت ضروری ہے۔ اس ضمن میں گھر کا ماحول، والدین اور اساتذہ کی ذمے داریوں کی خاص اہمیت ہے۔ اب سارا دارومدار ان ہی کے تعمیری اور مثبت رویے اور طریقۂ کار پر ہے۔ یہ لمحۂ فکریہ ہے اور اس نوع کے مسائل کے حل کے لیے ہم سب کو مل جل کر دامے، درمے، سخنے، قلمے، قدمے ہر ممکن تعاون کرنا ہوگا۔

غ ا: آپ کا اردو میڈیا سے انسلاک رہا ہے۔ آج کی زندگی میں سوشل میڈیا کا شور ہے، کان پڑتی آواز سنائی نہیں دیتی ہے؟

م ن خ: اردو پرنٹ میڈیا خصوصاً اردو صحافت نے تحریک آزادیٔ ہند میں نہ صرف ہراول دستے کا رول ادا کیا ہے بلکہ ہر قومی، ملی اور سماجی و سیاسی معاملات کی ترجمانی بھی بہ طریقۂ احسن انجام دی ہے۔ صحافت کو جمہوریت کے چوتھے ستون سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کل کی طرح آج بھی اس کی حیثیت، اہمیت اور ضرورت مسلم ہے۔

عصرِ حاضر میں برقی میڈیا یا جدید ذرائع ابلاغ عامہ نے شان دار ترقی کی منازل طے کر لی ہیں اور سوشل میڈیا کا چلن بھی عام ہے۔ انٹرنیٹ کی سہولتوں نے جہاں معلومات عامہ و خاصہ کے نئے نئے در وا کر دیے ہیں اور وہ ہمیں نئے نئے جہانوں کی سیر کرا رہا ہے، وہیں اس نے کئی اخلاقی مسائل بھی پیدا کر دیے ہیں۔ اس کا مثبت و تعمیری رخ جس قدر امید افزا اور مفید ہے بعض منفی اثرات اسی قدر مضر بھی ہیں۔ اس ضمن میں اعتدال و توازن کی اشد ضرورت ہے۔

برقی میڈیا کی اہمیت اپنی جگہ ہے کہ اس سے انکار ممکن نہیں ہے لیکن پرنٹ میڈیا کی اہمیت اور ضرورت اس سے کم نہیں ہو سکتی۔

پرنٹ میڈیا نے کل بھی ہماری ذہنی، فکری، تعمیری، اخلاقی، قومی اور ملی تربیت میں اہم کردار ادا کیا تھا، آج بھی اہم کردار اور بھی بہتر طریقے سے اس لیے ادا کر رہا ہے کہ اب جدید ذرائع و وسائل، نئی تکنیکی سہولتیں بھی اسے مہیا ہیں۔

غ ا: اپنے قاری کے لیے آپ کا پیغام؟

م ن خ: اپنے قارئین کے لیے مجھ حقیر کا پیغام یہی ہے کہ: باعمل، بااخلاق، باکردار، فرض شناس، محبِ وطن، انسان بن کر معاشرے اور ملک و قوم کے مختلف النوع مسائل کے حل کی مخلصانہ کوشش کیجیے۔ یہ دینی، دنیاوی، قومی اور ملی ہر اعتبار سے نہایت ضروری ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ آدمی اور انسان کا فرق واضح ہو جائے اور علامہ اقبال کے انسانِ کامل کا دیکھا ہوا خواب بھی پورا ہو سکے۔

■

Dr. Ghazanfar Iqbal
"SAIBAN" Zubair Colony,
Hagarga Cross, Ring Road,
GULBARGA - 585104 (Karnataka)
Cell: 09945015964
Email: ghazanfaronnet@gmail.com

Prof. Mohammad Nauman Khan
F.3, Goyal Hari Apartment
PNB Colony, Idgah Hills,
Bhopal- 462001 (M.P)
Cell.: 09891424095

تبصرہ وتعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وماعلیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیرضروری تمہید، افراط وتفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان وادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

اردو ڈراما تاریخ وتجزیہ

مصنف: پروفیسر محمد کاظم

صفحات: 686، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: عبدالرحمٰن، F-209/16، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی

زیرنظر کتاب اردو ڈرامہ کے فن اور اس کی تاریخ پر مبنی پروفیسر محمد کاظم کی تصنیف ہے۔ جس میں ڈرامہ کے فن، اہم ڈراما نگاروں کی ڈراما نگاری اور اردو ادب کے چنندہ ڈراموں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب مجموعی طور پر تین حصوں میں منقسم ہے پہلے حصے میں ڈرامے کی تعریف، ڈرامے کے اجزائے ترکیبی، ڈرامے کے اقسام اورڈرامے کی ارتقائی صورتحال پر مدلل اور مبسوط اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اردو ڈراموں کے فروغ کے حوالے سے لکھنؤ، بنگال اور ممبئی میں کھیلے جانے والے ڈراموں کی تاریخ پر اس طرح گفتگو کی گئی ہے گویا کوئی چشم دید گواہ روداد بیان کررہا ہو۔ پارسی تھیٹر، اپٹا اور پرتھوی تھیٹر کے ارتقائی مراحل کو ایسی باریکی وہنرمندی سے بیان کیا گیا ہے کہ اردو ڈرامے کی بدلتی شکلیں اور روز بروز ہونے والی تبدیلیاں واضح ہوگئی ہیں۔

دوسرا حصہ اردو کے اہم ڈراما نگاروں پر مبنی ہے جس میں ان ڈراما نگاروں کو شامل کیا گیا ہے جن کے ڈرامے اسٹیج پر پیش کیے جاچکے ہیں۔ اس ضمن میں نواب سید محمد آزاد، آغا حشر کاشمیری، پریم چند، سید عابد حسین، محمد مجیب، حبیب تنویر، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، عصمت چغتائی اور راجندر سنگھ بیدی کے نام شامل ہیں۔ ڈراما نگاروں اور اہم ڈراموں کے تجزیے کی فہرست پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے ڈرامے کے حوالے سے قاری تک زیادہ سے زیادہ معلومات/ مواد پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ اہم ڈرامہ نگاروں کی فہرست میں کئی ایسے نام نظر آتے ہیں جن کے ڈراموں کا تجزیہ نہیں کیا گیا ہے لیکن ان کی زندگی پر اس ہنرمندی سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ ان کے ڈراموں کی جھلک ان کی زندگی میں پیوست ہوگئی ہے۔

تیسرے حصے میں بیس ایسے نمائندہ ڈراموں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے جو اپنی شہرت، پیش کش اور نوعیت میں منفرد ہیں۔ اس حصے میں آغا حشر کاشمیری کے ڈراما اسیر حرص، سفید خون، صید ہوس، سلور کنگ، یہودی کی لڑکی، رستم سہراب، محمد مجیب کے کھیتی، انجام، خانہ جنگی حبہ خاتون، ہیروئن کی تلاش، دوسری شام، آزمائش، محمد حسن کے ضحاک اور کہرے کا چاند، حبیب تنویر کے آگرہ بازار، امانت لکھنوی کے اندر سبھا، نواب سید محمد آزاد کے نوابی دربار، امتیاز علی تاج کے انارکلی، اور سید عابد حسین کے پردۂ غفلت کے تجزیے کو شامل کیا ہے۔ شامل کتاب تجزیات کا مطالعہ کرتے ہوئے آپ دیکھیں گے کہ مصنف نے کس چابک دستی سے ڈرامے کے تاریخی حقائق سے روشناس کراتے ہوئے چند اہم کرداروں کی مدد سے پورے ڈرامے کا خلاصہ پیش کردیا ہے۔

حقیقت ہے کہ ڈرامے کی روح اس کی پیش کش ہے؛ اس لیے ڈرامے کی تنقید میں اس پہلو کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ مصنف نے ڈرامے کے اجزا اور لوازمات کے بیان میں اسٹیج کو مدنظر رکھا ہے اور حتی الامکان اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کی ہے جو اکیڈمک تنقید اور عملی پیش کش کے درمیان حائل ہے۔ اس لیے یہ کہنا بجا ہوگا کہ مصنف کتاب نے ڈرامے کے فن، اس کے ارتقائی مراحل میں درپیش مسائل کو جس منطقی اور استدلالی طریقے سے پیش کیا ہے اس سے ڈرامہ نگاری کے وہ اہم پہلو نکل کر سامنے آئے ہیں جن کی طرف عام طور پر محققین یا اکیڈمک ناقدین کی نظر نہیں پہنچتی ہے۔ امید ہے کہ پروفیسر محمد کاظم کی یہ تصنیف نہ صرف جامعات کے تدریسی نصاب میں کارآمد ثابت ہوگی بلکہ موجودہ حالات میں صنف ڈراما کے شائقین بھی اس کے مطالعے سے محظوظ ہوں گے۔

تحقیق و تنقید

افادات شبلی

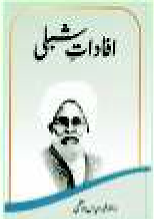

ناشر/مولف: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
صفحات: 224، قیمت 350، سنہ اشاعت: 2022
مطبع: روشان پرنٹرس، دہلی 6
مبصر: حبیب سیفی
E-12/51B، فرسٹ فلور، حوض رانی، مالویہ نگر، نئی دہلی۔ 17

علامہ شبلی نعمانی بہ یک وقت شاعر و ادیب بھی تھے اور ناقد و محقق بھی اور مورخ وانشا پرداز بھی۔ یوں تو شبلی کے تنقیدی نظریات ان کی مختلف کتابوں میں ملتے ہیں، لیکن ان کی کامل آئینہ داری ان کی معروف کتاب شعر العجم حصہ چہارم سے ہوتی ہے۔

علامہ شبلی نعمانی کا یہ خاص امتیاز ہے کہ جہاں انھوں نے ایک شاگرد، مداح اور ارادت مند کی حیثیت سے سرسید احمد خاں سے فیض اٹھایا ہے اور مختلف سطحوں پر ان کی وکالت کی ہے وہیں ان کی بعض رایوں اور نظریوں سے اختلاف بھی کیا ہے۔ ایک سچے باضمیر اور دیانت دار ناقد و محقق سے اسی بات کی توقع کی جاتی ہے۔

افادات شبلی کے مضامین میں جن پہلوؤں، واقعات، خطابات اور حالات وکوائف پر روشنی ڈالی گئی ہے ان میں بیان شبلی (چند نوادر)، تقریظ حسام الاسلام، نظارۃ المعارف القرآنیہ، جلسہ عطائے سند، ایک نادر خط- ملا واحدی کے نام، ایک نادر فارسی غزل، ایک غزل کے دو اشعار، رام پور میں لکچر، بمبئی میں لکچر، بنارس میں اجلاس ندوہ، جلسہ دستار بندی ندوۃ العلما، ایک نادر نظم: خدمت کعبہ، کتب خانہ رامپور، انگریزی تعلیم، علوم جدیدہ، الفاروق اور سیرۃ النعمان کے مکمل تراجم، لاہور میں یوم شبلی، متنی تحقیق کا پہلا محقق- علامہ شبلی، میخانہ، حل لطیف شعر العجم، علمی مخزن، کفایت شعاری، کلام شاطر: ایک نادر تحریر، مولانا شبلی کا ماحول اور محبت پدری کے تقاضے، مولانا شبلی کے تاریخی مضامین، ہندوستانی دواخانہ دہلی، بانکی پورہ پٹنہ کا سفر، علامہ شبلی کے چند غیر مدون خطوط، علامہ شبلی کی ایک نادر تحریر: ندوۃ العلما کا سالانہ اجلاس، پروگرام، طلبائے دار العلوم کی تحریر وتقریر، کارروائی متعلق حفاظت مسلمین وانسداد ارتداد، تصحیح کتب مروجہ انگریزی متعلق بہ اسلام، سیرۃ النبیؐ پر ایک مبسوط، مستند اور جامع تصنیف، قومی کتب خانہ اعظم، انتظام تعلیم مذہبی مدارس سرکاری میں، دار الافتا، الفاظ جدیدہ کا عربی لغت، مدارس عربیہ کی رپورٹ، علمی مضامین اور لیکچر، مجلس شوریٰ، علامہ شبلی کی ایک نادر تقریر: مفت لازمی تعلیم بل، علامہ شبلی کا ایک نادر خطبہ: عورت اور اسلام، علامہ شبلی کے تین نادر عربی خطوط، علامہ شبلی بنام امیر مینائی (ایک غیر مطبوعہ خط)، علامہ شبلی کے تیرہ نو دریافت خطبات، علامہ شبلی کا ذوق خطابت اور نو دریافت خطبات، پہلا خطبہ: تہنیت، دوسرا خطبہ: اعلیٰ تعلیم کی ضرورت، تیسرا خطبہ: مغربی علوم وفنون، چوتھا خطبہ: اعلیٰ یا ادنیٰ تعلیم، پانچواں خطبہ: الاسلام، چھٹا خطبہ: فارسی زبان وادب، ساتواں خطبہ: علم کلام، آٹھواں خطبہ: ندوۃ العلما کی ضرورت، نواں خطبہ: ختم نبوت، دسواں خطبہ: تعلیم وتربیت، گیارہواں خطبہ: تصوف، بارہواں خطبہ: مفت جبری تعلیم بل، تیرہواں خطبہ: عورت اور اسلام، چودہواں خطبہ: مدرسہ انوار العلوم حیدر آباد، پندرہواں خطبہ: تہنیت، سولہواں خطبہ: اصلاح تمدن، علامہ شبلی کی دو نایاب تقریریں، اصلاح نصاب تعلیم، رعایا کی وفاداری، رپورٹ سالانہ انجمن ترقی اردو 1903، اصلاح تمدن- علامہ شبلی کی نو دریافت تقریر، تاثر: شمس العلما کا خطاب ملنے پر، مشیر نسواں وغیرہ شامل ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ شبلی نعمانی کی نثر ونظم اور نقد وتحقیق کا وہ سرمایہ اردو ہی میں ہے جس کی وجہ سے اردو شعر وادب میں انھیں اعتبار و وقار حاصل ہے۔

کتاب کے مصنف ڈاکٹر الیاس الاعظمی پری ہائر سکینڈری اسکول اعظم گڑھ میں پرنسپل جیسے باوقار عہدے پر فائز ہیں۔ اگر آپ ماہر شبلی کے لقب سے بھی پکارے جائیں تو کم ہے، کیونکہ شبلی اکیڈمی سے آپ کا ربط اور شبلی پر آپ کا کام نہ صرف ہندو پاک بلکہ اردو زبان کے حوالے سے ساری دنیا میں آپ کی پہچان کا ذریعہ ثابت ہوا ہے۔

افادات شبلی میں تحقیق وجستجو کی جو مثال ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے پیش کی ہے اس سے ایک نئی سمت اسکالرز کو ملے گی۔

کیونکہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کی مذکورہ تصنیف افاداتِ شبلی، شبلی نعمانی کے پردۂ خفا میں رہنے والے بعض ایسے کارہائے نمایاں کا احاطہ کرتی ہے، جن کی طرف توجہ نہیں دی جاسکی ہے۔ جو نکات افاداتِ شبلی میں ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے اٹھائے ہیں ان نکات کی اساس پر محققین اور اسکالرز اپنے تحقیقی مقالات کی بنیاد رکھ سکیں گے۔ افاداتِ شبلی میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو اب سے پہلے شبلی شناسی کے حوالے سے منظر عام پر آنے والی کتابوں میں شامل نہیں ہیں۔

کیا بعید کہ یہ کتاب کسی جویائے علم وتحقیق کو اس موضوع پر مزید کام کرنے پر اکسادے۔ علامہ شبلی نعمانی گرچہ فارسی وار دو دونوں زبانوں میں لکھتے تھے، دونوں ہی زبانوں کی نظم ونثر پر انھیں دست رس حاصل تھی اور دونوں ہی زبانوں کے علمائے ناقدین نے ان کی دونوں زبانوں کی ادبیات وشعریات پر گہری نگاہ کا اعتراف بھی کیا ہے اور دونوں ہی زبانوں کے متعدد سخن وروں نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے۔ مگر شبلی کو جو دوام اردو زبان سے ملا وہ لافانی کہلائے گا۔ میں ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کو شبلی شناسی پر ایک اور تازہ کتاب پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اہل علم وفن، تحقیق وتنقید اور شعر وادب میں دلچسپی رکھنے والے 'افادات شبلی' سے ضرور استفادہ کریں گے۔

فکشن کی تعبیر

مصنف: مقصود دانش
صفحات: 240، قیمت: 180، سنہ اشاعت: 2021
ناشر: اسکریز کولکاتا 16
مبصر: شہناز رحمٰن، معرفت سید ضیا امام، C-4/3، سرور اپارٹمنٹس، سرسید نگر، علی گڑھ، یوپی

فکشن کی تعبیر (اشاعت 2021) مقصود دانش کی دوسری کتاب ہے۔ اس سے پہلے 'فکشن کی تفہیم' 2012 میں شائع ہو چکی ہے جس میں پریم چند، منٹو، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین وغیرہ کی تحریروں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

پیش نظر کتاب 'فکشن کی تعبیر' اکیسویں صدی کے افسانوں اور ناولوں کے تجزیہ اور تنقید پر مبنی ہے۔ ابتدائی چار مضامین میں افسانوں پر عمومی گفتگو کی گئی ہے۔ معاصر افسانہ نگاروں پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے نیر مسعود، سید محمد اشرف، مظہر الزماں خاں، شوکت حیات، عبد الصمد، حسین الحق، شموئل احمد طارق چھتاری، صدیق عالم، غضنفر ساجد رشید، رتن سنگھ، ذوقی، بیگ احساس، نور الحسنین، معین الدین جینابڑے، خورشید اکرم، شبیر احمد وغیرہ کے منتخب افسانوں کی روشنی میں موضوعاتی تنوع اور اسلوبیاتی تجربوں کو بیان کیا ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں اکیسویں صدی کے ناولوں پر گفتگو ہے۔ ان مضامین سے مقصود دانش کی تنقیدی انفرادیت یا ان کے رجحان یا شناخت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔

وہ متن کی قرات نہ صرف عمومی رویوں سے قدرے مختلف انداز میں کرتے ہیں بلکہ مروجہ تنقیدی رویوں اور کلیشوں سے بغاوت کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ ان کے باغیانہ تیور افسانوں کی بہ نسبت ناولوں کے تجزیہ میں زیادہ واضح طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ انھوں نے عصری تناظر میں موضوع کی معنویت اور جامعیت کے لحاظ سے ناولوں کا تعین قدر کیا ہے۔

فکشن کو تنقیدی اور 'دانشورانہ' نظریات کے اطلاق یا حوالوں سے 'اہم' ثابت کرنے کے بجائے انھوں نے براہ راست متن کا وسیع سیاق وسباق دریافت کرنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ کئی چاند تھے سر آسماں، نعمت خانہ، اور چینی کوٹھی جیسے ناولوں کے عمق تک رسائی ایک چیلنج سے کم نہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے ناولوں میں کرداروں کے مکالمے، محاورے، فنون لطیفہ، لسانی تراکیب اور واقعات کی ترتیب میں جو پیچیدگی ہے، اس سے بآسانی گزرنا ایک عام قاری کے لیے مشکل ترین عمل ہے۔ ان کے ناولوں سے محظوظ ہونے کے لیے جو مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ درکار ہے وہ مقصود دانش کی تحریر میں نظر آتا ہے۔

نظریات کی بالادستی کے اس زمانے میں فکشن تنقید کے نظریاتی مباحث سے مقصود دانش نے صرف اتنا ہی سروکار رکھا ہے جس سے ان کے موقف کی وضاحت ہو سکے۔ اس طرح کے بیانات سے ان کی فکشن فہمی کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ انھوں نے اس بات پر اصرار کیا ہے کہ ''کیا کہا گیا ہے'' سے زیادہ اہم ''کیسے کہا گیا ہے'' کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ 'موت کی کتاب' اور 'ایک خنجر پانی میں' کے Content سے اختلاف کے باوجود وہ ان ناولوں کے اسلوب اور اثر انگیزی کے قائل ہیں۔ اسی طرح شموئل احمد کے ناولوں کو خیال کی تکرار اور موضوع کی یکسانیت کے باوجود صرف اس لیے گوارا کر لیتے ہیں کہ ان کا طرز اظہار جاذب اور کہانی کا تسلسل رواں ہے جو قاری کو محو کر لیتا ہے۔ متن کی دبازت اور بیان کی نفاست ہی ہے جو مقصود دانش کو 'آخری سواریاں' اور مصطفیٰ کریم کے ناولوں کی طرف متوجہ کرتی ہے۔

ادب دنیا کے کسی بھی ملک یا خطے میں لکھا جائے اس کی وابستگی حیات اور کائنات کے مسائل سے ہوتی ہے اسی لیے ادب کو علاقائیت کے حوالے سے آنکنا غیر ادبی رویہ سمجھا جاتا ہے حالانکہ امن وآشتی کے علمبردار بڑے ادیبوں نے بھی تنگ نظری وتعصب کی اعلی مثالیں چھوڑی ہیں اور جذبات سے مغلوب ہوکر موشگافیاں کی ہیں لیکن مقصود دانش نے یہ جوکھم بھی اٹھایا اور اس پر خطر منزل کو سر کر لیا ہے 'ہجور آما' کے تجزیہ میں ان کے غیر جانب دارانہ طرز نقد کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔

صدیق عالم کے ناولوں میں کرداروں اور وقوعوں کے توسط سے مقصود دانش نے جن معنوی جہات کی طرف اشارے کیے ہیں اور جن مناظر کو حقائق وشعور کی منطق سے پرے قرار دیا ہے، وہ قابل توجہ اور ان کے جرات اظہار کی دلیل ہیں۔ انھوں نے بیانیہ پر گفتگو کرتے ہوئے لسانی وفنی لوازمات اور مصنف کے تصرفات پر بھی گفتگو کی ہے لیکن اس طرح کے مباحث کو انھوں نے کہیں اتنا طول نہیں دیا ہے کہ متن پس پشت چلا جائے۔

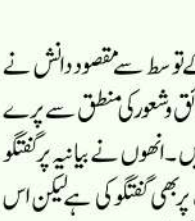

بھار میں اردو انشائیہ نگاری

مصنف: ڈاکٹر نفاست کمالی

صفحات: 196، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2022

رابطہ: معرفت انجینئر انظر عالم

چھوٹی قاضی پورہ، محلہ کرم گنج، لہریا سرائے، دربھنگہ

مبصر: احتشام الحق، I/C، ہیڈ ماسٹر، ہائر سیکنڈری اسکول، مجھولیا، اے پی ایم، دربھنگہ (بہار)

اردو زبان میں انشائیہ نگاری کی ایک طویل تاریخ ہے۔ دور حاضر میں اردو زبان میں گرچہ انشائیہ نگاری کی روایت کم ہوئی ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ انشائیہ زبان و بیان کا وہ لطیف اظہار ہے کہ اس کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا۔ کسی بھی افسانوی وغیر افسانوی نثر میں یا اسی طرح صاحبان علم وفضل اور باذوق افراد کی گفتگو اور عام بول چال میں انشائی جملے پھوٹتے رہتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دنیا کی تقریبا ہر زبان میں انشائیہ نگاری کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ کسی بھی نثری صنف سے ایسے جملے نکالے جاسکتے ہیں جو انشائیہ کے ذیل میں آتے ہیں اور جس کو سن کر یا پڑھ کر انسان میں لطیف احساس کی ایک رو کوند جاتی ہے اور حس مزاح پھرک اٹھتی ہے۔ چہرے پر تبسم کی لکیریں پھیل جاتی ہیں اور سامع یا قاری بصیرت کے ایک مسرت آگیں احساس سے لبریز ہوجاتا ہے۔

ایک علاحدہ صنف کی حیثیت سے بھی بہر حال اس کی اپنی ایک منفرد شناخت ہے جس کو ماہرین نے چند اوصاف سے ممیّز کیا ہے۔ اس حوالے سے اردو میں بھی اچھا خاصا سرمایہ موجود ہے۔ خواہ وہ نیرنگ خیال کی صورت میں ہو یا سرسید کے مضامین ہوں۔ غالب ومولانا آزاد کے خطوط ہوں، مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین ہوں کہ پطرس بخاری کے انشائیے یا انجم مان پوری کا کرایہ کی ٹمٹم، خواجہ حسن نظامی کا جھینگر کا جنازہ، رشید احمد صدیقی کا ارہر کا کھیت اور کرشن چندر کا رونا وغیرہ۔ اسی طرح بہار میں بھی انشائیہ نگاری کی اپنی ایک روشن اور تابناک تاریخ ہے۔ زیر نظر کتاب 'بہار میں اردو انشائیہ نگاری' بہار کی اسی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے۔

'بہار میں اردو انشائیہ نگاری' ڈاکٹر نفاست کمالی کی تصنیف ہے۔ ان کا تعلق ایک علمی گھرانے سے ہے۔ ان کے والد پروفیسر ایم کمال الدین متھلا یونیورسٹی کے پی جی شعبہ کے مؤسس اور صدر رہ چکے ہیں۔ ڈاکٹر نفاست کمالی نے اس پدرانہ روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ مصنفہ کا دعوی ہے کہ یہ کتاب انھوں نے دوران طالب علمی لکھنی شروع کی تھی لیکن بوجوہ اب زیور طباعت سے آراستہ ہوسکی ہے۔ اس سے قبل ان کی پی ایچ ڈی کا مقالہ 'لفظیات غزل اردو' بھی شائع ہوکر لوگوں سے داد وتحسین وصول کر چکا ہے۔

اس کتاب کو انھوں نے جامعاتی تحقیق کی طرز پر تصنیف کیا ہے اور اس وقت جبکہ یک موضوعی کتابوں کا سلسلہ کم ہوا ہے انھوں نے ایک موضوع پر بسیط مطالعہ پیش کیا ہے جو ان کی علمی شیفتگی کا مظہر ہے۔

اس کتاب کو انھوں نے کل چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں انھوں نے انشائیہ کی تعریف پر بحث کی ہے اور تمام تر فلسفیانہ موشگافیوں اور ماہرین کی آرا سے باب کو مستند کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوسرے باب میں انھوں نے انشائیہ کو ایک علاحدہ صنف کی حیثیت سے بھی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں مختلف ماہرین کی آرا سے اپنے دعوؤں کو مدلل کیا ہے۔ تیسرا باب بہار میں ابتدائی انشائیہ نگاری کی بحث کو سامنے لاتا ہے جس میں علامہ شوق نیموی کی کتاب یادگار وطن مطبوعہ 1894 میں انشا نگاری کے واضح ابتدائی نقوش تلاش کرنے میں وہ کامیاب ہوئی ہیں۔ حالانکہ اس سے قبل کے بعض ادبی رسالوں اور کتابوں میں بھی دھندلی دھندلی تصویریں انھوں نے تلاش کی ہیں۔ ان کے بعد ان کی نظر 'خیابان بے خزاں' از حاجی سید محمد مرتضی مطبوعہ 1931 پر ٹھہرتی ہے۔ سید اکبر علی قاصد کے انشائیوں کے مجموعہ 'ترنگ' مطبوعہ 1931 میں وہ انشائیوں کے بھرپور نقوش تلاش کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ چوتھے باب 'بہار کے اردو انشائیہ نگار' کو انھوں نے 1935 سے 1960 تک محدود رکھا ہے اور اس ضمن میں پہلا نام جمیل مظہری کا تلاش کیا ہے۔ اس باب میں انجم مان پوری، سید اکبر علی قاصد، سید محمد حسنین عظیم آبادی، ڈاکٹر سید نذر امام، احمد جمال پاشا (آبائی وطن محلہ مغل پورہ

عظیم آباد)، شین مظفر پوری، ہاشم عظیم آبادی، اطہر شیر، نظیر صدیقی وغیرہ کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ باب پنجم بہار میں اردو انشائیہ (1990 تک) ہے۔ اس میں ناوک حمزہ پوری، ایم کمال الدین، اعجاز علی ارشد، نعمان ہاشمی، شفیع مشہدی، تمنا مظفر پوری، مناظر عاشق ہرگانوی، مسرور آروی، ڈاکٹر محمد مظاہر الحق، قیام نیر، کوثر اعظم، خورشید جہاں، طارق جمیلی، سرور جمال، شتر امام، مجتبیٰ احمد، متین عمادی، سید محمد جلیل، ظفر چکدینوی وغیرہ کو شامل کیا ہے۔ ان دونوں ابواب میں انھوں نے جن کو انشائیہ نگار شمار کیا ہے ان پر بھر پور مضمون تحریر کیا ہے۔ انشائیہ نگار کے تعارف اور ان کے انشائیوں کے خدوخال کو پیش کرتے ہوئے اپنی ایک رائے پیش کی ہے۔ یہ ان کے علمی اعتماد کو واشگاف کرتا ہے۔ چھٹے اور آخری باب میں انھوں نے اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔

کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے اس کتاب کی تصنیف و تالیف کا کام کیا ہے۔ گو جا بجا ان سے اختلاف رائے کے امکان کا انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ طلبہ اور صاحب ذوق افراد کے لیے یہ کتاب بہترین ہے۔ طباعت عمدہ ہے۔ گیٹ اپ بھی اچھا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ کتاب علمی حلقوں میں پسند کی جائے گی۔

ترتیب

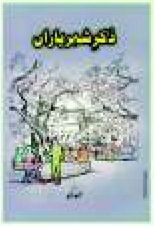

ذکر شہر یاراں

مصنف: ڈاکٹر صفدر، مرتب: شاہد رشید

صفحات: 184، قیمت: 120 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ملنے کا پتہ: صالحہ بک ڈپو، مومن پورہ، ناگپور۔

مبصر: ایس ایم حسینی، 04/ ندوہ کیمپس، ڈالی گنج لکھنؤ

جدید تنقید کی دنیا میں معروف کتاب 'شاعری و شیوۂ پیغمبری' کے لیے مشہور، 'قل قل آب وضو' اور 'لفظوں پہ رم' جیسے شعری مجموعہ کے خالق ہندوستان میں انشائیہ کی روایت کو مستحکم کرنے والے پانچ سے زائد کتابوں کے مصنف ڈاکٹر سید صفدر کا تعلق اچل پور ضلع امراوتی سے ہے اور تیس سال تک وروڈ کے ہائی اسکول میں درس و تدریس کی خدمات انجام دیتے رہے، آپ کو متعدد قومی اور علاقائی اعزازات سے بھی نوازا گیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کے آغاز میں شامل شمس الرحمٰن فاروقی، وارث علوی، ڈاکٹر انور سدید اور وزیر آغا جیسے مشاہیر کے قلم سے مصنف کے بارے میں پڑھ کر تنقید میں ان کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، وزیر آغا رقم طراز ہیں:

''مجموعہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا، آپ کا انداز تنقید متوازن، مطالعہ وسیع اور اسلوب رواں دواں ہے، تنقید کے لیے یہی بنیادی اوصاف ہیں، مجھے توقع ہے کہ تنقید کے میدان میں بھی آپ نام پیدا کریں گے۔''

وارث علوی کے مضمون سے ایک اقتباس پیش ہے'' آپ کی انفرادیت کا ضامن آپ کا منفرد اسلوب نگارش ہے، جس میں حرکت اور ولولہ ہے، بے جان تحریروں کی یلغار میں ایک جاندار اسلوب آسمانی تحفہ سے کم نہیں۔''

زیر نظر کتاب 'ذکر شہر یاراں' ڈاکٹر صفدر کے تیرہ خاکوں کا مجموعہ ہے جسے ان کے ادب نواز دوست شاہد رشید نے مرتب کر کے شائع کیا، کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے پہلے گوشہ میں مشاہیر کی آرا، دیباچہ اور پیش لفظ ہے، دوسرے گوشہ میں تین خاکے 'اس سمندر میں گرے' از ڈاکٹر محمد اسداللہ، 'دنیا کے ہر منظر میں شامل آپ ہیں' از بابو آر کے، 'شگفتہ مزاج نقاد: ڈاکٹر صفدر' از ڈاکٹر ناصر الدین انصار، ڈاکٹر صفدر پر تحریر کردہ ہیں جن میں مصنف پر خاطر خواہ روشنی ڈالی گئی ہے، تیسرا حصہ 'بندگان خدا' کے عنوان سے ہے، جس کے ذیل میں ایسے افراد کے خاکے پیش کیے گئے ہیں جن سے مصنف کی واقفیت ہی نہیں قربت بھی تھی، تیسرا باب 'تخیل زاوئے' کے تحت طنز و مزاح کی چاشنی سے بھر پور پانچ خیالی خاکے ہیں اور آخر میں ایک ادھوری سوانح عمری کی شہ سرخی ہے، صفدر صاحب نے خود نوشت لکھنے کا آغاز کیا تھا لیکن وہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی تاہم شاہد رشید نے اس کے ابتدائی صفحات کتاب میں شامل کر دیے جو مصنف کی زندگی کے کئی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔

کتاب کے دیباچے میں محمد یحییٰ جمیل نے 'ذکر شہر یاراں' کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر صفدر کی علمی اور ادبی زندگی کی عکاسی کی ہے، شاہد رشید صاحب نے نہایت پر مغز اور جامع پیش لفظ کو خاکہ کی شکل دیدی ہے جس میں ان کی تخلیقی، ادبی اور علمی خدمات کا اعتراف شامل ہے اور شخصیت کے کئی رنگ سامنے آتے ہیں، صفدر صاحب کے معمولاتِ زندگی اور قلمی موشگافیوں پر بھی تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے اپنے تعلق کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے'' ان کی غزل، نظم، مزاحیہ مضامین، تنقیدی مضامین، انشائیہ وغیرہ جو بھی لکھتے اس کا اولین سامع اور قاری یہ ناچیز ہوتا۔''

'بندگان خدا' کے ذیل میں پہلا خاکہ 'کتاب دوست: ڈاکٹر سید نعیم الدین' کے عنوان سے ہے، دوسرا 'حضرت قاسم: ایک سرو چراغاں'، تیسرا 'نمونۂ سلف: ڈاکٹر سید عبدالرحیم'، چوتھا 'خضر بے منزل: حسن بشیر مرحوم' پھر 'مصطفیٰ نانا'، 'کچھ صادق بھائی کے بارے میں'، 'عباس علی عبدے علی حاجی' اور 'بیابانی صاحب کا چبوترہ' جیسے عناوین ہیں، ان خاکوں میں اچل پور، برار اور ورود کی سماجی اور معاشرتی زندگی کی خوشگوار یادیں، طنز و ظرافت سے معمور عمدہ قصے جا بجا بکھرے ہوئے ہیں، جنھیں مقامی الفاظ کی آمد دلکش بناتی ہے اور تمدن رفتہ کا نظارہ بھی اس میں بخوبی کیا جاسکتا ہے، صفدر صاحب خاکہ میں سنجیدگی اور علمی اسلوب کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، آپ کی نثر میں ٹھہراؤ ہے اور مرعوبیت کے بجائے دوسروں کی صلاحیت کا اعتراف نظر آتا ہے، زندگی کی تصویر قلمی زور پر ایسے اتارتے ہیں کہ تصویر ذہن میں بنتی چلی جاتی ہے اور دھنک کے نئے نئے رنگ اس میں بھر جاتے ہیں، خاکوں میں مصنف اپنی زندگی پر ان شخصیات/ افراد کے پڑنے والے اثرات بھی واضح کرتا جاتا ہے۔

تیسرے حصے 'تخیل زاوئے' میں پانچ خاکے ہیں، پہلا 'قطب الدین ایبک اور ہمارے کتب الدین' ہے، جس میں زود نویس حضرات پر گہرا طنز ہے، 'قصہ ایک عظیم شاعر کا' اور 'ہزار پا ادیب' میں بے تکلف شاعر نما حضرات اور بے سر پیر کے ادیبوں پر جو ہر صنف ادب میں اپنا قلمی جوہر دکھانا فرض عین سمجھتے ہیں، لطیف طنز کیا ہے اور عمدہ انداز میں چٹکی لی ہے، ایک اقتباس ملاحظہ ہو: ''قطب الدین ایبک نے قطب مینار بنایا تھا، ہمارے دوست 'کتب میناز' بنا رہے ہیں، ہر سال، چھ مہینے میں ان کی ایک دو کتابیں چھپ جاتی ہیں، یہ کام موصوف پورے ہوش و حواس، توجہ، انہماک اور ایمانداری سے انجام دیے جا رہے ہیں۔''

اسی میں اگلے صفحہ پر لکھتے ہیں:

''میر، غالب، مومن، پطرس مشہور ضرور ہیں، مگر قلم کے سامنے عاجز ہیں، کتب الدین کے لیے کتاب لکھ دینا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، بلکہ یہ ان کے دائیں اور بائیں دونوں ہاتھوں کا کھیل ہے، وہ کسی کتاب یا ادیب پر نظر ڈالتے ہیں تو ایک نئی کتاب برآمد ہو جاتی ہے۔''

'چچا چھکن نے موبائل خریدا' اور 'شیخ جی' بھی اسلوب کی عمدگی، برجستہ چست جملوں اور لطافت سے بھر پور ہیں، ان تحریروں میں انشائیہ کی صاف جھلک ملتی ہے، یوں کہیے انشائیہ خاکہ کی پرچھائی میں نیم دراز ہے، صفدر صاحب ہر ایک کے خدوخال نہایت فنکاری اور پرکاری سے واضح کرتے ہیں، دلچسپ کردار، دل آویز واقعات اور دل افروز باتوں سے دل کی بگیا میں ہزار پھول مہکاتے جاتے ہیں۔

کتاب کا سرورق مشمولات سے گہرا ربط اور پرانے برگد کی جڑ میں آباد گزرے زمانے کی بیٹھکوں کا قصہ بیان کرتا ہے، پروف کی غلطیاں اکا دکا ہی ہیں، یہ کتاب خاکوں سے دلچسپی رکھنے والے افراد کے لیے بیش قیمت تحفہ ہے، جس کے لیے شاہد رشید مبارکباد کے مستحق ہیں۔

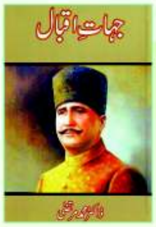

جہاتِ اقبال

مرتب: ڈاکٹر محمد مرتضیٰ

صفحات: 320، قیمت: 500 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: کتابی دنیا، 1955، گلی نواب مرزا، ترکمان گیٹ، دہلی۔6

مبصر: پروین صدیقی، R-38، سیکنڈ فلور، جوگائی ایکسٹینشن، جامعہ نگر، نئی دہلی۔25

گذشتہ چند برسوں میں علامہ اقبال پر جو چند اہم کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان میں ڈاکٹر محمد مرتضیٰ کی مرتب کی ہوئی ہے جس کا نام 'جہاتِ اقبال' ہے۔ اس میں علامہ اقبال کی شعری اور فکری جہات کے حوالے سے کئی اہم مضامین شامل کیے گئے ہیں جن میں مقدمہ (ڈاکٹر محمد مرتضیٰ)، فلسفۂ خودی کے چند امتیازی نکات (پروفیسر عبدالحق)، علامہ اقبال کی فکری جہات (پروفیسر توقیر احمد خان)، کلام اقبال کی تہذیبی مطالعہ: باب اوّل 'تصور الہٰ' (پروفیسر طارق سعید)، خدا سے اقبال کی ہم کلامی (پروفیسر کوثر مظہری)، نوائے شعر میں فضائے فسوں کاری (پروفیسر سید غضنفر علی)، قرۃ العین حیدر پر اقبال کے اثرات (نسیم عباس چودھری)، اقبال کی شاعری میں انسانی اقدار کی بازگشت (ڈاکٹر شکیل اختر)، اقبال کا پیامِ زندگی (ڈاکٹر شمیم احمد)، علامہ اقبال کا مردِ مومن (ڈاکٹر علی عمران عثمانی)، علامہ اقبال کا ایک اہم غیر مطبوعہ (ذاکر حسین)، اقبال کا فکری و نظریاتی ارتقا (ڈاکٹر شاذیہ عمیر)، فکرِ اقبال پر افلاطون کے اثرات: حقیقت کے آئینہ میں (ڈاکٹر محمد شاہد خان)، اقبال قرآن اور سائنس (ڈاکٹر علی احمد ادریسی)، اقبال کی فکری جہات: نثر کے حوالے سے (ڈاکٹر محمد مرتضیٰ)، علامہ اقبال کی شاعری میں جلال و جمال کی آمیزش (ڈاکٹر عبدالسلام)، علامہ اقبال: فکری جہات کا شاعر (ڈاکٹر محمد بہلول)، اقبال کی سیاسی فکر (ڈاکٹر سرفراز جاوید)، اقبال کی غزلیہ شاعری (ڈاکٹر افسانہ حیات)، کلام اقبال پر عربی شاعری کے اثرات (ڈاکٹر سعود عالم)، اقبال کا مردِ مومن تصور (محمد یٰسین قریشی)، اقبال کا تصورِ تعلیم اور تربیت اطفال (ڈاکٹر محمد انصار)، علامہ اقبال کے خطوط سید سلیمان ندوی کے نام (عظمت النسا)، علامہ اقبال کی شعری تصورات (اشتیاق احمد قاسمی)، اقبال کی تجدید فکر اسلامی (ڈاکٹر محمد شفیق عالم) قابل ذکر ہیں۔

اس کے علاوہ انگریزی میں ڈاکٹر عامر ریاض کا ایک مضمون ہے جس کا عنوان ہے The Role of Intution in the Epistemology of Mohammad Iqbal۔

ڈاکٹر محمد مرتضیٰ نے 31 صفحات پر محیط مقدمہ تحریر کیا ہے جس میں انھوں نے اقبال کے نظریات و تصورات اور فکریات کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ شعرِ اقبال کے علاوہ نثر اقبال پر بھی انھوں نے روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''نثر اقبال کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کے یہاں نثری اسلوب کی متنوع صورتیں اور جہتیں ہیں، ان کے نثری اسلوب میں کئی تحریکوں، رجحانات و میلانات کا عکس نظر آتا ہے۔ اس میں مشرق کی فلسفیانہ، دینی اور مفکرانہ تحریروں کے اثرات بھی موجود ہیں اور مغرب کی فلسفیانہ اور مفکرانہ تحریروں کی جھلک بھی ہے۔ علامہ اقبال نے سب سے پہلے نثر میں 'علم الاقتصاد' کے نام سے ایک کتاب لکھی، اس میں انھوں نے موضوع کی مناسبت سے ہی اسلوب اختیار کیا ہے۔ ان کے علاوہ ان کے نثری سرمائے میں مضامین، خطبات اور خطوط موجود ہیں۔''

علامہ اقبال ایک کثیر الجہات شاعر، فلسفی، سیاست داں، پیامی اور محبِّ وطن بھی ہیں۔ یہ تو وہ جہات ہیں جن میں اقبال نے خود عملاً حصہ لیا اس کے علاوہ ان کے کلام میں فقہ اسلامی، تاریخ اسلام، جغرافیہ اور اقوام وملل کے قصے وغیرہ بھی نظر آتے ہیں۔ علامہ اقبال کئی اعتبار سے منفرد اور ممتاز ہیں۔ ان کا فکر و فلسفہ نہ صرف ایشیا بلکہ یوروپ کے علوم کو بھی متاثر کرتا ہے، اس لیے جس قدر اقبال کا تذکرہ ایشیا میں کیا جاتا ہے اس سے کہیں زیادہ تذکرہ یوروپی ممالک میں ملتا ہے اور اب تو دنیا کا کوئی ملک باقی نہیں رہ گیا۔ جہاں اقبال کا کلام نہ پہنچا ہو اور اقبال پر تحقیقی اور تنقیدی کام نہ ہوا ہو؟ اس دور میں جرمنی، جاپان، روس، ترکی اور اٹلی وغیرہ سرِ فہرست ہیں۔ ایشیائی ممالک خاص طور پر ہندوستان میں اقبال کی ضرورت اس لیے زیادہ ہے کہ وہ ان اقوام کے لیے بہت زیادہ فکر مند تھے۔ ان کے تابناک مستقبل اور باوقار زندگی کے لیے کوشاں تھے۔ اقبال کا خیال ہے کہ یقیناً بعض چیزیں ایشیا کو یوروپ کی تقلید کرنے پر مجبور کرتی ہیں، لیکن بعض چیزوں میں مغرب بھی مشرق کی تقلید کرتا ہے۔ خصوصاً روحانی معاملات میں مغرب کو مشرق سے درس حاصل کرنا چاہیے۔ اس بات میں کوئی تردد نہیں کہ اقبال کا معاملہ نئی نسلوں کے لیے بھی سود مند ہے اور خصوصاً نوجوانوں کے لیے اقبال کا پیغام نئی زندگی بخشنے والا ہے۔ غرض اقبال کی شاعری اور اقبال کا پیغام قوموں کی زندگی بدلنے والا ہے۔ ان کی شاعری کا فلسفہ حرکت و عمل آج بھی اتنا ہی موثر ہے جتنا کہ خود اقبال کے زمانے میں تھا۔

اقبال کا فلسفہ انسان کو مصروف کار اور سرگرم عمل رکھنے کا بہترین فلسفہ ہے۔ اس فلسفے کے بطن سے اقبال کا فلسفہ خودی نمودار ہوتا ہے جس میں اقبال انسان کو اپنی ذات کے پہچاننے اور اپنی صلاحیتوں کو بیدار کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ساری خوبیاں خود انسان کے اندر موجود ہیں انھیں بروئے کار لانے کی ضرورت ہے۔ یہ اقبال کا مشہور و معروف فلسفہ ہے، جس نے مغرب میں بھی ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔

ڈاکٹر محمد مرتضیٰ کی یہ کتاب اقبال شناسی میں بہت معاون ثابت ہوگی، کیونکہ اس میں کچھ نئے زاویوں پر بھی مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ڈاکٹر محمد مرتضیٰ کی یہ کوشش لائق تبریک و تحسین ہے۔

تبصرے

کھرے کھوٹے

مصنف: اظہار خضر

صفحات: 174، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: اظہار خضر سٹی کورٹ، نزد واما پٹرول پمپ، پٹنہ (بہار)

مبصر: شاداب ابراہیم

مقام و پوسٹ: بوام، وایا برول، دربھنگہ۔ 847203 (بہار)

تبصرہ نگاری دیگر نثری اصناف کے مقابلے میں مشکل ہی نہیں بلکہ خار دار جھاڑی کے مانند ہے، دامن بھی بچانا ہے اور آگے کا سفر بھی طے کرنا ہے، زیر تبصرہ کتاب 'کھرے کھوٹے' بھی اظہار خضر کے تبصروں کا مجموعہ ہے۔ جن میں زیادہ تر تبصرے خورشید اکبر کی ادارت میں پٹنہ سے شائع ہونے والے سہ ماہی ادبی جریدہ 'آمد' کے لیے لکھے گئے ہیں، ابتدا میں مصنف کا ارادہ انھیں کتابی صورت میں شائع کرنے کا نہیں تھا اس لیے تبصرے کسی ترتیب سے نہیں لکھے گئے ہیں، بلکہ رسائل و جرائد کے مدیر کی فرمائش

پر مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں، مگر جب مصنف نے تمام تبصروں کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا ارادہ کیا تو قارئین کی سہولت کے پیش نظر انھیں شعری اور نثری حصے میں تقسیم کیا، شعری حصے میں اشعار کے مجموعوں پر کیے گئے تبصروں کو شامل کیا ہے، جن میں شکیب ایاز کا مجموعہ کلام 'بشارت' پروین شیر کا 'بیکرانیاں' راشد طراز کا 'غبار آشنا' سردار آصف کا 'محاذ پر میں' ارمان نجمی کا 'شہر افسوس' خورشید طلب کا 'جہاں گرد' خالد عبادی کا 'نہایت' احمد نثار کا 'موسم خلاف تھا'، شامل ہیں۔ زیادہ تر تبصرے تاثراتی نوعیت کے ہیں مگر مصنف نے جا بجا شعرا کے کلام کی روشنی میں ان کے افکار اور فنی خصوصیات کو بھی اجاگر کیا ہے، نئے شعرا کی حوصلہ افزائی کے ساتھ فنی لغزشوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔

نثری حصے میں کل دس کتابوں پر کیے گئے تبصرے شامل ہیں، جن میں مختار شمیم کا تنقیدی، تحقیقی اور تاثراتی مضامین کا مجموعہ 'سواد حرف' شکیل الرحمان کی کتاب 'بارہ ماسے' کی جمالیات اور ہمزاد (آپ بیتی)، صفدر امام قادری کے تحقیقی، تنقیدی اور علمی کتب و رسائل پر مشتمل تبصروں کا مجموعہ 'نئی پرانی کتابیں' محمود شیخ کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'جذباتی اور جدلیاتی شعور ادب' پروفیسر عبدالقادر کی کتاب 'امریکہ اور کنیڈا کی خواتین قلمکاروں کی خدمات' محسن رضا رضوی کی کتاب 'بہار میں اردو نثر بڑھتے قدم' 'مضامین ریختی' مرتبہ ڈاکٹر ایاز احمد، مہر افروز کا افسانوی مجموعہ 'ٹوٹتی سرحدیں' سہ ماہی ادراک کا حنیف نقوی نمبر شامل ہیں۔

اس طرح کل چھبیس تبصرے اس کتاب میں شامل ہیں، گرچہ یہ تبصرے تاثراتی نوعیت کے ہیں، پھر بھی انھیں پڑھتے وقت تبصرہ نگار کی وسعت علمی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ تبصرے کی قرأت کے دوران تبصرہ نگار کی ادب شناسی جھلکتی ہے، مختلف علوم پر نگاہ ہونے کا اندازہ ہوتا ہے، نیز تحریر میں پختگی، انتخاب الفاظ کا سلیقہ بھی شاندار ہے، اپنی تہذیبی وراثت پر بھی فخر کا اظہار ہے۔

پروفیسر عبد القادر فاروقی کی کتاب 'امریکہ اور کنیڈا کی خواتین قلمکاروں کی خدمات' پر تبصرہ کرتے ہوئے اظہار خضر نے لکھا ہے:

''سر دست مجھے اس بات سے بحث نہیں کہ مہاجر قلمکاروں کی تحریر میں ہجرت کے تلخ و شیریں جذبہ و احساس کی عکس ریزی کس نہج سے اور کس حد تک ہو رہی ہے، بلکہ اس بات کی خوشی ہے کہ کم از کم یہ نسل اپنی تہذیبی اور لسانی وراثت کو سینے سے لگائے ہوئے ہے۔'' (کھرے کھوٹے، ص 192)

سردار آصف کے شعری مجموعے 'محاذ پر میں' پر کیا گیا تبصرہ ان کی کلام فہمی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے:

''جناب سردار آصف ایک کہنہ مشق اور منجھے ہوئے شاعر ہیں، لیکن خیال رہے کہ فکری کہنگی سے ان کی شاعری کو دور کا بھی واسطہ نہیں۔ سردار آصف کی شاعری آج کی شاعری ہے۔ عصر حاضر کے مسائل سے جوجھتی اور روبرو ہوتی ہوئی شاعری ہے۔ ان کا شعری ڈکشن معاصر زندگی سے عبارت ہے۔

غزل جیسی لطیف و نازک صنف سخن میں فکر و فن کی سطح پر لطافت و نزاکت کا پاس و لحاظ رکھتے ہوئے جن ٹوٹتی، بکھرتی سخت جان سماجی اور تہذیبی قدروں کو تخلیق فن کا حصہ بنا کر پیش کیا ہے، میرا خیال ہے کہ یہی زیر تبصرہ مجموعہ کلام کا شان امتیاز ہے۔ مزید یہ کہ معاملات و مسائل کی سخت جانی کے پیش نظر مشمولہ غزلوں کی فکری اور شعری ہیجان انگیزیاں حد درجہ متحرک اور فعال محسوس ہوتی ہیں۔'' (ایضاً، ص 31)

ایک جگہ شکیل الرحمان کے سلسلے میں تبصرہ کرتے ہوئے اظہار خضر رقمطراز ہیں:

''شکیل الرحمان نے مایا جال کو پیا ملن کی مادّی توجیہ پسندی سے تعبیر کیا ہے۔ ہر موسم میں برہ کی آگ میں جلتے اور تپتے تپتے، ایک گھڑی ایسی آجاتی ہے جب عورت روح کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ایسے میں اس کا محبوب خالق کائنات کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔ عورت کے وجود میں ایک گہری ماورائیت کی فضا بنتی محسوس ہوتی ہے۔ اس فکر و فلسفہ کے پیش نظر شکیل الرحمٰن کا یہ اخذ کردہ نتیجہ بڑا ہی دلچسپ ہے۔ (ایضاً، 100)

صفدر امام قادری کی 'نئی پرانی کتابیں' پر اظہار خضر نے لکھا ہے:

''بیشتر تبصروں میں وہ ایک سخت گیر تبصرہ نگار کی حیثیت سے ہی نظر آتے ہیں۔ جن سے ان کی صاف گوئی اور دو ٹوک طریقۂ نگارش کا پتا چلتا ہے۔ بعض تبصرے ایسے بھی ہیں جن کے مصنف نابغۂ روزگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان مصنفین کے علمی و ادبی مقام و مرتبہ کے اعتراف و اقرار میں صفدر امام صاحب نے جو گفتگو کی ہے انھیں آپ ان کی نرم روی پر محمول نہیں کر سکتے، بلکہ ان کے وقار و اعتبار کے تئیں، تبصرہ نگار کا ایماندارانہ اور ذمے دارانہ اظہار یہ ہے۔ البتہ بعض ہم عصروں کے حوالے سے تبصرہ نگار نے جو گفتگو کی ہے ان میں ان کے نرم گوشے جاگزیں ہوتے نظر آتے ہیں۔'' (ایضاً، ص 112)

خالد عبادی کے مجموعۂ کلام پر اظہار خیال کرتے ہوئے اظہار خضر نے لکھا ہے:

''نہایت' کا شاعر مشکل پسند بھی ہے اور سہل پسند بھی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس کے مجموعے میں شاعری کی مشکل پسندی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ حالانکہ مشکل پسندی کوئی بری چیز نہیں ہے۔ یہ تو تخلیقی فنکاری کا ایک فطری عمل ہے جس میں بالواسطہ طریقۂ اظہار کو مرکزیت حاصل ہوتی ہے۔ فنکار کا فن لفظوں کے جدلیاتی نظام کے تابع ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے''۔ (ایضاً، 165)

شکیب ایاز کے مجموعہ کلام 'بشارت' کے حوالے سے اظہار خضر لکھتے ہیں:

''زیر تبصرہ مجموعہ کلام پر گفتگو کا آغاز جناب شکیب ایاز کے اس شعر سے کیا چاہتا ہوں:

نئی شاعری ہے شکیب ایاز غزل میں عجیب جگمگاہٹ سی ہے

اسے آپ شاعرانہ تعلّی پر محمول نہ کریں، بلکہ یہ شاعر کے جذبۂ خود اعتمادی اور خود شناسی کا اشاریہ ہے، اتنا ہی نہیں یہ اردو کی غزلیہ ادبی شاعری کی جدید تخلیقی اور شعری بشارت ہے، اسلوب و ادا کی سطح پر اس تازہ کاری نادرہ خیالی اور شعری جگمگاہٹ کی گفتگو گذشتہ سطور میں کی گئی ہے اس کا اطلاق فکر و فن کے اسی نہج پر ہوتا ہے، اس میں غزل کی لطافت و نزاکت جیسے فنی نکتہ کو بھی ملحوظ رکھنے کی تلقین کی گئی ہے۔'' (ایضاً، ص 4)

اظہار خضر نے اپنے تبصرے میں اکثر کتابوں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے اور کتابوں کی اہمیت اجاگر کی ہے، زیادہ تر کتابیں قابل اعتنا ہی نہیں بلکہ قابل مطالعہ ہیں کیونکہ یہ کتابیں تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کی ہیں، اظہار خضر نے ان کتابوں پر کیے گئے اپنے تبصروں کو زیور طبع سے آراستہ کر کے ایک قابل قدر کام انجام دیا ہے، ان کی زبان بھی عام فہم ہے۔

سفر نامہ

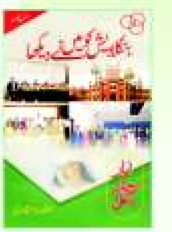

بنگلا دیش کو میں نے دیکھا

مصنف: صفدر امام قادری

صفحات: 160، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: مکتبۂ صدف، 202، ابو پلازا

این آئی ٹی موڑ، اشوک راج پتھ، پٹنہ (بہار)

مبصر: علی احمد فاطمی، B-518، کریلی، جی ٹی بی نگر، پریاگ راج، یوپی

ممتاز شاعر و نقاد فضیل جعفری نے اردو نظم کی مایوس کن صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں لکھا:

''میری ناچیز رائے میں آج کا دور شاعری کا دور ہے ہی نہیں۔ یہ نثر نگاری کا دور ہے۔ فی زمانہ اردو میں جو بھی دو چار سو قاری ہیں، وہ شاعری کے مقابلے سوانح نگاری، خاکہ نگاری، فکشن نگاری وغیرہ سے زیادہ دل چسپی رکھتے ہیں۔''

میں اس میں سفرنامہ بھی جوڑتا ہوں۔ جدید اردو نظم کے بارے میں کوئی چاہے تو فضیل جعفری کی رائے سے اختلاف کرسکتا ہے لیکن اس سے اختلاف ممکن نہیں کہ فی زمانہ نثر کی یہ اصناف جنھیں ہم غیر افسانوی ادب کہتے ہیں، خاصی مقبول ہیں۔ اس کی ایک وجہ شاعری کی کمزوری اور تنقید کی پیچیدگی اور گمراہی بھی ہوسکتی ہے۔ کچھ یہ بھی کہ مندرجہ بالا اصناف کا تعلق بہ راہِ راست انسان کی فطرت وحقیقت سے ہوتا ہے۔ اس میں شاعری کی طرح جا بہ جا علامت نگاری اور استعارہ سازی کا عمل دخل نہ کے برابر ہوتا ہے۔ خاکہ اور سوانح تو بہ راہِ راست انسانی جبلّت سے وابستہ رہتے ہیں، اس لیے قاری جو عام انسان ہوتا ہے، وہ اپنی طرح دوسرے انسان کی فطرت کو سمجھنے کے لیے بے تاب و بے چین رہتا ہے۔ شاعری میں انسان کم انسانی تصوّر و تخیّل زیادہ ہوتا ہے۔ اس میں بھی کوئی حرج نہیں لیکن جب تصوّر و تخیّل ماورائے انسان ہو جاتا ہے اور پیچیدہ و ژولیدہ ہو جاتا ہے تو قاری از خود راہ بدل کر اُن اصناف کی طرف مُڑ جاتا ہے جہاں اسے اپنا عکس دکھائی دے۔ سفرنامہ تو اس کے اور آگے کی چیز ہے۔ اس میں صرف انسان ہی نہیں ہوتا، انسانوں کی بھیڑ ہوتی ہے۔ سماج اور شہر ہوتا ہے اور اس سے زیادہ ہوتا ہے اس کا رہن سہن، بود و باش، رسم و رواج، تہذیب وثقافت۔ اس طرح سے سفرنامے کا رینج دیگر اصناف کے مقابلے میں زیادہ پھیلاؤ رکھتا ہے اور اسی وجہ سے رچاؤ بھی۔

ایک زمانہ تھا جب اجنبی دیاروں کے سفرنامے بے حد پسند کیے جاتے تھے لیکن اب دنیا اس قدر سمٹ گئی ہے کہ اجنبی دیار کم سے کم رہ گئے ہیں۔ اس لیے آج سفرنامہ لکھنا کل کے مقابلے زیادہ مشکل ہے۔ لیکن اردو کے ممتاز ادیب وصحافی صفدر امام قادری اکثر مشکل کام کرتے آئے ہیں۔ بنگلا دیش جو ہمارا پڑوسی مُلک ہے اور ہم سبھی اس سے زیادہ مانوس و باخبر ہیں، انھوں نے وہاں کا سفر کر کے سفرنامہ لکھ کر اُس مانوسیت اور عدمِ اجنبیت کو چیلنج کیا اور اس میں کامیابی پائی ہے۔

ادیب وناقد، صحافی اور مدرِّس ہونے کے ناطے صفدر امام قادری کے زیادہ تر اسفار انھیں صورتوں سے ہوتے ہیں۔ راقم نے بھی انھی صورتوں سے سفر کیے اور سفرنامے لکھے لیکن اصل سفرنامہ اسی وقت خلق ہوتا ہے جب اس ملک ومعاشرہ کی سماجی وثقافتی تصویر متاثر کن انداز میں اُبھر سکے۔ بنگلا دیش چھوٹا اور معمولی سا ملک سہی لیکن بنگالی کلچر اور فنونِ لطیفہ معمولی نہیں۔ ایسا اس لیے کہ خود بنگالی اپنے کلچر سے غیر معمولی لگاؤ رکھتے ہیں جس کے نقوش بہ آسانی در و دیوار، سمت و رفتار میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس سفرنامے کی بنیادی خصوصیت یہی ہے کہ مصنّف نے شعبۂ اردو، اردو اساتذہ، مذاکرہ وغیرہ کے بارے میں تو لکھا ہی ہے، اس سے زیادہ زور دیا ہے اصل بنگلا دیش کو پیش کرنے میں۔ یہ خصوصیت صرف اس سفرنامے کی نہیں، ہر اچھے سفرنامے کی ہوا کرتی ہے۔ صفدر امام قادری نے بھی ابتدا میں یہی لکھا:

''سفرنامے تہذیب ومعاشرت کے جلوے لٹانے کے لیے ہی شاید لکھے جاتے ہوں گے۔ کھلی آنکھوں اور کھلی بانہوں سے زندگی کے نئے ذائقے کی تلاش میں ہم ملکوں ملکوں اور شہروں شہروں سرگرداں رہتے ہیں۔''

صفدر کی یہ خوبی ہے کہ وہ نرے مدرِّس نہیں ہیں، نرے نقّاد بھی نہیں ہیں۔ وہ صحافی بھی ہیں اور جہاں گشت بھی۔ صحافی کی نگاہ بہ ہر حال سماج، سیاست اور کلچر پر ہوتی ہے۔ صفدر بہار میں رہتے ہیں اور بنگال اور بنگلا دیش ایک طرح سے ان کے پڑوسی صوبہ و مُلک ہیں۔ اس لیے ان کی واقفیت قابلِ یقین بھی ہے اور متاثر کن بھی۔ پہلے بنگلا دیش کا جغرافیہ دیکھیے:

''بنگلا دیش کو ندیوں کا مُلک کہا جاتا ہے۔ ہندستان کی بڑی ندیاں گنگا اور برہم پتر، پدما اور میگھنا کی شکل اور نام سے بنگلا دیش کو پار کرتے ہوئے ہی سمندر تک پہنچتی ہیں۔''

بنگلا دیش کی تاریخ سے ہم سبھی واقف ہیں کہ کس طرح وہ پاکستان سے ٹوٹ کر الگ ہوا۔ تفصیل میں جانے کا وقت نہیں لیکن اتنی بات ضرور غور طلب ہے کہ یہ مُلک زبان و کلچر کی بنیاد پر ہی بنا اور قایم ہوا۔ اسی لیے اس میں آج بھی قدامت ہے۔ خود ڈھاکا شہر کا تعارف ملاحظہ کیجیے:

''ڈھاکا شہر ہندستان کی راج دھانی دلّی کی طرح نہیں ہے۔ تین سو سال گزرنے کے آثار شہر میں نظر آتے ہیں۔ پرانا شہر ایسا بھی نہیں ہے کہ اسے قدیم کھنڈروں کا نمونہ قرار دیا جاسکے۔ چار پانچ منزلہ عمارتیں اس علاقے میں بھی موجود ہیں۔ کشادگی کم ہے، بھیڑ اور شور اسی طرح سے ہے جیسے ایک زندہ علاقے میں ملنا چاہیے۔''

اس کے بعد ڈھاکا یونی ورسٹی کا ذکر ملتا ہے اور شعبۂ اردو اور مذاکرے کا۔ یہ حصّہ اطلاعاتی زیادہ ہے لیکن اس اطلاع میں بھی جا بہ جا اردو کلچر اور بنگالی کلچر کی جو آمیزش ملتی ہے، وہ لطف دیتی ہے۔ خاص طَور پر جب وہ عجائب گھر، دیگر عمارات، شہر اور سڑکوں کا ذکر کرتے ہیں تو اپنے مخصوص اسلوب میں وہ رپورتاژ کو سفرنامہ بناتے چلتے ہیں۔ اچھی بات یہ بھی ہے کہ وہ بنگلا دیش کی معیشت کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ثقافت کا راست تعلق معیشت سے ہوا کرتا ہے۔ اصل لطف وہاں آتا ہے جب وہ ساحلِ سمندر، آسمان اور سمندر کے رنگ روپ پیش کرتے ہیں۔ ایک روپ آپ بھی دیکھیے:

''افسوس بھاگتے ہوئے بادلوں کا دَل آسمان سے دو چار موتیوں کو ہمارے دامن میں ڈالتے ہوئے رَہ رَہ کر پھسل جاتا ہے۔ خلیجِ بنگال کی انتہائیں محدود معلوم ہو رہی تھیں۔ بادلوں کے کھیل اور روشنی کی کمی سے سمندر کی کشادگی اور وسعت محدود تر تھی۔''

ایسے کئی مناظر ہیں جو دامنِ دل پکڑتے ہیں اور سفرنامے میں دل کشی اور روانی پیدا کرتے ہیں۔ بنگلا دیش کا ذکر ہو اور مچھلیوں کا ذکر نہ ہو، یہ ممکن ہی نہیں۔ چناں چہ پورا ایک باب فِش سے متعلق ہے۔ بازار ہیں، جزیرے ہیں، خوب صورت مناظر ہیں جنھیں صفدر کی دل کش زبان نے مزید دل کش بنا دیا ہے۔ اس سفرنامے کی ایک اور اچھی بات یہ ہے کہ صفدر نے بنگلا دیش کے شاعروں، دانش وروں کا ذکر عمدہ طریقے سے کیا ہے۔ نذر الاسلام سے لے کر ارمان شمسی اور جلال عظیم آبادی تک اور شعبۂ اردو کے موجودہ اور سابق اساتذہ کا بھی۔

غرض یہ کہ پورا سفرنامہ اطلاعات اور مناظر سے مالا مال ہے کہ ایک بار اسے پڑھیے تو پڑھتے چلے جایئے۔ امریکا، برطانیہ وغیرہ کے سفرنامے تو ہم نے خوب لکھے پڑھے لیکن وہ تیز روشنی کی چکا چوند میں کچھ سمجھے گئے، کچھ نہیں سمجھے گئے لیکن اس سفرنامے میں نہ سمجھے جانے والی جیسی چیز کوئی بھی نہیں ہے۔ 160 صفحات پر مشتمل یہ سفرنامہ صرف اس لیے مختصر نہیں ہے کہ یہ مُلک مختصر ہے بلکہ اس لیے کہ صفدر امام قادری نے غیر ضروری تفصیلات میں جانا مناسب نہیں سمجھا۔ ورنہ ان کے پاس اتنا کچھ کہنے کو ہے کہ وہ کم از کم ڈھائی سو صفحات تک تو جا ہی سکتے تھے اور اس کی نازک جزئیات کو مزید گہرائی سے پیش کرسکتے تھے لیکن یہ بھی انھیں معلوم ہے کہ وہ سماجی دستاویز نہیں بلکہ ایک تخلیق کی راہ سے گزر رہے ہیں، اس لیے اختصاریت اور اشاریت ناگزیر تھی۔ بہ ہر حال اس دل چسپ اور معنی خیز سفرنامے کے لیے صفدر امام قادری کو مبارک باد۔ امید کرتا ہوں کہ جلد ہی ہم ان کا دوسرا سفرنامہ پڑھ سکیں گے۔

شاعری

عزیزوں کے درمیاں

شاعر: حافظ عمادالدین خاں مرادسعیدی، مرتب: سہیل پیامی ٹونکی

صفحات: 166

رابطہ: مرادمنزل، مقابل سینٹ تھامس اسکول،

محلّہ رجبن، ٹونک۔ 304001 (راجستھان)

مبصر: سید ساجد علی ٹونکی، 66/319 بی، گلی نمبر 11، غفارمنزل، نئی دہلی

زیرِنظر تصنیف ٹونک کے معروف شاعر جناب مرادسعیدی صاحب کے کلام کا مجموعہ ہے جو سات ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کے باب اول میں دونعتیں، دوسلام، ایک منقبت حضرت علی اور ایک نظم سفرِمعراج کے عنوان سے شامل ہے۔ دوسرا باب غزلیات پر مشتمل ہے جس میں چالیس غزلیں شامل کی گئی ہیں۔ تیسرے باب میں مختلف عنوانات پر مشتمل 20 نظمیں ہیں۔ چوتھے باب میں مختلف عنوانات کے تحت قطعات کو شامل کیا گیا ہے جو 19 صفحات پر مشتمل ہیں۔ قطعات کے بعد چہار بیتیں ہیں جن کی تعداد گیارہ ہے۔ چہار بیتوں کے بعد متفرق نظمیں ہیں جن میں ایک تقریب بسم اللہ، دو رخصتیاں اور ایک سہرے پر مشتمل ہے۔ کتاب کے اخیر میں متفرق اشعار ہیں جن کی تعداد 94 ہے۔ اس کتاب کی اشاعت اکتوبر 2022 میں ہوئی ہے۔ اس سے قبل 2017 میں مراد صاحب کا پہلا شعری مجموعہ 'گلدستۂ مراد' کے عنوان سے، جس کے مرتب شوق احسنی ٹونکی ہیں، شائع ہوکر دادِتحسین حاصل کر چکا ہے۔

اس مجموعے میں سب سے پہلے کتاب کے مرتب جناب سہیل پیامی صاحب کا مقدمہ 'عرضِ مرتب' کے عنوان سے شاملِ اشاعت ہے، جس میں موصوف نے تاریخ ٹونک کے تناظر میں مراد صاحب کے خاندانی حالات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان مشکلات کا تذکرہ بھی کیا ہے جو کتاب ہٰذا کو ترتیب دینے میں انھیں پیش آئی ہیں۔

جہاں تک مراد صاحب کی شاعری کا تعلق ہے آپ کے کلام میں قدیم کلاسیکی رنگ کے ساتھ عہدِ جدید کا امتزاج بھی پایا جاتا ہے۔ مراد صاحب کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ نے سب سے پہلے اپنا کلام ٹونک کے معروف استاد الاساتذہ شاعر اور بزرگ صوفی جناب حضرت صولت ٹونکی کو دکھایا۔ ان کے انتقال کے بعد آپ نے سلطان الشعرا جناب بسمل سعیدی صاحب سے اصلاحِ سخن لی۔ اسی لیے آپ کی شاعری میں ٹونک کے قدیم اور جدید دونوں رنگ شامل ہیں۔ مرادسعیدی صاحب نے اپنے اشعار میں اپنے دونوں اساتذہ کا تذکرہ بہت دلکش انداز میں کیا ہے۔ اس ضمن میں آپ کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔

انجمن تعمیرِ اردو میں غزل خواں ہوگیا　　　یہ جناب صولت و بسمل کا احساں ہے مراد

مراد صاحب کی غزلیں حقیقت پسندی پر مبنی ہیں۔ آپ نے اپنی شاعری میں حسن وعشق کا تذکرہ تو کیا ہے لیکن شرم وحیا کو ملحوظ رکھتے ہوئے اشاروں اور کنایوں میں اپنے عشق کا اظہار کیا ہے۔ آپ نے اپنی غزلوں میں زندگی کے سبھی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس میں وحدانیت کے ساتھ تصوف کی چاشنی بھی ہے، ہجر و وصال کے قصے بھی ہیں اور گردشِ دوراں کا تذکرہ بھی ہے۔ مراد صاحب کی شاعری میں فلسفۂ زندگی، وعظ و نصیحت اور وطن پرستی کا تذکرہ بھی جابجا موجود ہے۔

مرادسعیدی صاحب کی غزلوں کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیں۔

قسمت سے مل گئی ہے جگہ چشمِ یار میں　　　ہے عالمِ نشاط میرے اختیار میں

وہ ہر قدم پہ ایک نئی چال چل گئے　　　ہم دیکھتے ہی رہ گئے طرزِ خرامِ ناز

کانٹوں میں دامن اپنا ہم الجھا کے رہ گئے　　　ان کے فریبِ حسن میں کیا آ کے رہ گئے

مرادسعیدی صاحب نے غزلوں کے ساتھ خاصی بڑی تعداد میں نظمیں بھی کہی ہیں۔ آپ کی مشہور نظمیں جو اس مجموعے میں شاملِ اشاعت ہیں ان میں شہر قاضی ٹونک قاضی الاسلام صاحب کی اہلیہ کی وفات پر تعزیتی نظم، آہ بسمل سعیدی مرحوم، شریکِ حیات کا انتقال پرملال، عظمتِ ٹونک وغیرہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

فرطِ غم سے ان کا چہرہ زرد ہے تیرے بغیر　　　طاہر و اقبال کے غم کو بیاں کیسے کروں

زندگانی اک سراپا درد ہے تیرے بغیر　　　سچ تو یہ ہے قاضی الاسلام صاحب کے لیے

دیدۂ اہلِ سخن میں تھا وقارِ بسمل　　　منفرد بزمِ ادب میں تھا شمارِ بسمل

ہوگئی ختم گلستاں سے بہارِ بسمل　　　آہ بسمل کا لٹا آج گلستانِ حیات

مرادسعیدی صاحب نے چہار بیت میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ آپ نے مختلف موضوعات کو اپنی چہار بیتوں میں پیش کیا ہے۔ اس صنفِ سخن میں آپ نے وطن پرستی کو بھی موضوعِ سخن بنایا ہے۔ اسی ضمن میں ایک بند ملاحظہ فرمائیں۔

آج میں آزاد ہوں میرا وطن آزاد ہے
انجمن آزاد، شمعِ انجمن آزاد ہے
ختم ساری ہوگئیں اب باغباں کی بندشیں
کھل گئیں صیاد اب وہ گلستاں کی بندشیں
اب بہاروں پر ہیں دورِ خزاں کی بندشیں
اب جوانانِ چمن کا بانکپن آزاد ہے
آج میں آزاد ہوں میرا وطن آزاد ہے

اخیر میں جناب فہیم الدین خاں فرزند جناب مرادسعیدی ٹونکی اور مجموعے کے مرتب جناب سہیل پیامی صاحب ٹونکی نیز مراد اکادمی کے دیگر ذمے داروں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں جن کی کاوشوں اور کوششوں سے یہ کتاب شائع ہوکر منظرِعام پر آئی ہے۔

رسائل و جرائد

بیسویں صدی نئی دہلی (افسانہ نمبر 2022)

مدیرہ: شمع افروز زیدی

صفحات: 114، قیمت: 80 روپے، جولائی تا دسمبر 2022

ملنے کا پتہ: آئی۔47، رحمانی اسٹریٹ، مرادی روڈ بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی۔25

مبصر: رفیع حیدر انجم، گاچھی ٹولہ، وارڈ نمبر 24، ڈاک خانہ، ضلع ارریہ۔ 854311 (بہار)

اردو کی ادبی صحافت میں رسالہ 'بیسویں صدی' اشاعت کے 92 ویں سال میں داخل ہو چکا ہے۔ 'بیسویں صدی' میں شائع ہونا ادبا و شعرا کے لیے اعزاز کی بات تب بھی تھی جب اس کے مدیر محترم خوشتر گرامی ہوا کرتے تھے اور آج بھی یہ جذباتی انسیت محترمہ شمع افروز زیدی صاحبہ کے دورِ ادارت میں قائم ہے۔ شمع افروز زیدی صاحبہ نے اس تاریخی ادبی ورثہ کو زندہ رکھا ہے اور زمانے کی سرد و گرم ہواؤں کے برخلاف اس چراغ کو روشن کر رکھا ہے جس کی روشنی میں مشاہیر ادبی شخصیات نے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا تھا۔

'بیسویں صدی' کا جولائی تا دسمبر 2022 کا شمارہ 'افسانہ نمبر' کے طور پر زیرِ تبصرہ ہے۔ اس افسانہ نمبر کے مشمولات کا جائزہ لینے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ محترمہ شمع افروز

زیدی صاحبہ نے اس دشت کی سیاحی میں کتنی جاں فشانی اور ہنر وری سے کام لیا ہے۔ حسبِ روایت خوبصورت سرورق سے مزین سال 2022 کے افسانہ نمبر میں 22 افسانے، 23 غزلیں، چند رباعیات اور چار کتابوں پر تبصرے شامل ہیں۔

پہلا افسانہ 'دوا سے دعا تک' کشمیر کے سینئر افسانہ نگار نور شاہ کا ہے۔ ایک صفحے کا یہ افسانہ موضوع کی آفاقیت کے پیش نظر لا تعداد صفحات قاری کے ذہن و دل پر رقم کرتا چلا جاتا ہے۔ روز اول سے دوا کے ساتھ دعا کی تاثیر لازم وملزوم ہے۔ انسانی شفا کے لیے دوا ایک کارگر اقدام ہے، مگر دعا کی کرشماتی تاثیر سے کون انکار کرسکتا ہے۔ یہ افسانہ اسی کرشماتی تاثیر کی تلاش و جستجو کا اعلامیہ ہے۔

قاضی مشتاق احمد کا افسانہ 'زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی' نامساعد حالات کی چکی میں پسے ہوئے ایک ایسے بے گناہ ملزم کی کہانی ہے، جس کی بے گناہی کو ثابت کرنے کے لیے ایک عادی مجرم کوشاں نظر آتا ہے۔ ایک طرف انسانی فطرت کا تضاد ہے اور دوسری طرف یہ پیغام بھی کہ جذبۂ انسانیت کی کونپل کسی بنجر زمین پر بھی پھوٹ سکتی ہے۔

افسانہ 'آسمان سے اترا چاند' میں افسانہ نگار زین العابدین خاں نے ایک سچے واقعہ کو افسانوی متن میں پیش کیا ہے۔

شبیہ زہرا حسینی کا افسانہ 'رنگ زندگی کے' میں ایک نوجوان شخص کے کردار کے رنگا رنگ پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے جو صنفِ نازک کو محض دل بستگی کا سامان سمجھتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنی بیوی سے بھی ایسی ہی توقع رکھتا ہے مگر وہ قوتِ نسواں کی بوالعجبی سے ناواقف ہوتا ہے۔ عورت کے مزاحمتی رویوں کی عکاسی اس افسانے کا کلیدی موضوع ہے۔

ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا کا افسانہ 'انوکھا مقدمہ' اپنے عنوان کی مناسبت سے سے واقعی انوکھا اور دلچسپ ہے۔ یہ افسانہ اپنے اختتام پر قاری کے لیے ایک خوشگوار فکری تاثر چھوڑ جاتا ہے. ایک عورت کی دور اندیشی اور تدبر کو اس افسانے میں بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر اشرف آثاری کا افسانہ 'اے وطن، میرے وطن' اپنی مٹی کی محبت وعقیدت سے جڑا ایک زرخیز افسانہ ہے۔ رفیع حیدر انجم کا افسانہ 'نئی صبح' ایک Adolescent age کے لڑکے کی کہانی ہے جسے ایک صبح ایک ایسے فطری نفسیاتی نکتے کا ادراک ہوتا ہے جو اس عمر کے لڑکوں کے لیے حیرت، استعجاب ومسرت کا موجب بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر رینو بہل کا افسانہ 'بچے ہمارے عہد کے' ایک پاورفل افسانہ ہے۔ مصنفہ نے بڑی فنکاری سے سہل انداز میں ایک اہم موضوع کو افسانہ کے قالب میں پیش کیا ہے۔ 'یادِ ماضی' ڈاکٹر شہاب اختر خان کا ایک رومانوی افسانہ ہے جو محبت کرنے والے دو نفوس کی تلخ و شیریں یادوں کے دریچوں کو آہستہ آہستہ وا کرتا ہے اور قاری کو اپنی یادوں میں شریک کر لیتا ہے۔ ناہید طاہر کا افسانہ 'اے زندگی' زندگی کے ایک تلخ اور ایک شیریں پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔ کہانی کے مرکز میں ایک سروگیٹ مدر کا کردار ہے، جو ایک زندگی کو وجود میں لانے کا فرض ادا کرتی ہے اور دوسری طرف جس منشا سے وہ اس فرض کو انجام دیتی ہے، مشیت ایزدی کے تحت اس کا وہ منشا پورا نہیں ہو پاتا۔ وہ اپنے بیمار باپ کی زندگی بچا نہیں پاتی۔ زندگی اور موت قدرت کے ہاتھوں کا کرشمہ ہے، یہاں انسان کے منصوبے کام نہیں کرتے۔

ڈاکٹر رشید جہاں انور کا افسانہ 'آدمی مسافر ہے' میں اپنی جائے پیدائش یا میکے سے ایک عورت کی ذہنی وقلبی وابستگی اور پھر امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں اشیا و مقامات کی تبدیلی کے ردعمل کے داخلی احساسات کا خوبصورت فنی اظہار اس افسانے میں ہوا ہے۔ گرچہ موضوع پرانا ہے مگر مصنفہ نے ٹریٹمنٹ کے نئے انداز سے اس افسانے کو برتا ہے۔

ڈاکٹر رخشندہ روحی مہدی نے اپنے افسانہ 'یہ تیرا گھر، یہ میرا گھر' میں ایک ایسی خاتون کے احساسات کو فنکاری سے نمایاں کیا ہے جو اپنی ہی اولاد کی خودغرضانہ حرکت و عمل سے بے گھری کا شکار ہو جاتی ہے۔ افسانے میں یکے بعد دیگرے کئی موڑ آتے ہیں جنھیں مصنفہ نے قرینے اور سلیقے سے افسانوی متن کا حصہ بنایا ہے اور یوں افسانے کے تار و پود میں قاری خود کو involve محسوس کرتا ہے۔

افسانہ نمبر میں سلمی حجاب، محمد اطہر مسعود خان، سمیرا حیدر کے علاوہ دو افسانے 'بیسویں صدی' کی فائل سے منتخب کئے گئے ہیں۔ مشہور و معروف افسانہ نگار سلمی صدیقی کا افسانہ 'پھٹی پرانی نشانی' اور شہرت یافتہ فکشن نگار اور ناول نگار بشری رحمان کا افسانہ 'موٹر اور محبوبہ'۔ دونوں ہی افسانے کلاسک کا درجہ رکھتے ہیں۔

افسانہ نمبر کے دوسرے صفحے پر پروفیسر خالد محمود کا خاکہ ترجیحی اعتبار سے شائع کیا گیا ہے، جس کے وہ بلاشبہ مستحق ہیں۔ یہ خاکہ سہیل انجم کا تحریر کردہ ہے، جو جامعیت کے ساتھ پروفیسر خالد محمود کی شخصیت اور فن کے تمام اہم گوشوں کا احاطہ کرتا ہے۔

افسانہ نمبر میں منظوم تخلیقات کی کہکشاں سخن فہم حضرات یا شعر و شاعری سے شغف رکھنے والوں کے لیے دلچسپی کا حامل ہے۔

مجموعی طور پر 'بیسویں صدی' کا یہ افسانہ نمبر متنوع موضوعات کے افسانوں پر مشتمل ہے، جس کے مطالعے کے بعد ایک خوشگوار احساس سے قاری سرشار ہو کر اٹھتا ہے۔ بس ایک کمی کھٹکتی ہے کہ اس نمبر میں عصری افسانوں کی سمت و رفتار کے حوالے سے کم از کم ایک مضمون ہونا چاہیے تھا۔

پہلی تخلیق پہلا تاثر

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تخلیق شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' میں جب آپ کی تخلیق پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے! اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

قلمکاروں سے چند معروضات

ماہنامہ'اردو دنیا'علمی اور ادبی مجلہ ہے جس میں ادبیات، سماجیات، اقتصادیات، تہذیب و ثقافت،تعلیم و تدریس، زبان ولسانیات، سائنس وٹکنالوجی،طب وفلسفہ،فنونِ لطیفہ،نفسیات، زبان کی زمینی صورت حال، عالمی ادبیات اور دیگر موضوعات پر مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ یہ خالص علمی اور ادبی نوعیت کا رسالہ ہے۔اس میں مذہبی مباحث اور متنازعہ فیہ مسائل پر مضامین کی اشاعت کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ رسالہ صرف 100 صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔اس رسالے میں پوری اردو دنیا کے دانشوروں، ادیبوں اور قلمکاروں کی تحریریں اشاعت کے لیے موصول ہوتی ہیں۔ بہت سے مضامین اشاعت کے لیے منظور کر لیے جاتے ہیں لیکن بہت سی تحریریں اشاعت سے محروم رہ جاتی ہیں۔ بہ کثرت مضامین موصول ہونے کی وجہ سے ادارے کو بہت سی دقتوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔اس لیے قلمکاروں سے گذارش ہے کہ اپنی تحریریں بھیجتے وقت مندرجہ ذیل امور کا بطور خاص لحاظ رکھیں۔

- مضمون غیر مطبوعہ ہو۔کسی اخبار/ مجلے میں ارسال نہ کیا گیا ہو اور نہ ہی اپنی یا کسی مرتب کردہ کتاب میں شامل ہو۔
- مضمون ادارے کے مزاج،معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 2500 (پچیس سو) الفاظ سے کم اور 4000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون میں اعداد و شمار رومن میں لکھیں اور مضمون کے آخر میں حوالے/حواشی (کتب اور مضامین) کا اندراج ضرور کریں۔
- اچھوتے، نئے اور اہم موضوعات پر بھیجے ہوئے مضامین ترجیحی طور پر شائع کیے جائیں گے اور عمومی نوعیت کے مضامین کی اشاعت موصول ہونے کی ترتیب کے لحاظ سے کی جائے گی۔
- ایسے موضوعات یا شخصیات پر مضامین کی اشاعت ممکن نہیں جن پر بہ کثرت کتابیں یا مقالے شائع ہو چکے ہوں۔ ایسے موضوعات/شخصیات پر مضامین بھیجتے وقت چند سطروں میں نئے نکات اور نئے زاویے کی نشاندہی لازمی ہوگی۔
- جن مضامین میں زبان و بیان کی خامیاں اور حقائق،حوالے املا جملہ کی غلطیاں ہوں گی انھیں کسی بھی صورت میں اشاعت کے لیے منظور نہیں کیا جائے گا۔
- مضمون میں اشعار اور اقتباس کی صحت کا التزام اور ضرورت سے زیادہ اشعار اور اقتباسات سے پرہیز لازمی ہے۔
- شخصیات پر مضمون بھیجتے وقت متعلقہ فنکار کی تصویریں، کتابوں کا عکس اور دیگر ضروری معلومات ضرور ارسال کریں۔
- شہر یا ادارے پر لکھتے ہوئے اس سے متعلق تصاویر اور دیگر اہم معلومات لازمی بھیجیں۔
- درج ذیل تصدیق نامہ موصول ہوئے بغیر مضمون کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا:

''میرا مضمون غیر مطبوعہ ہے۔کسی اخبار/ مجلہ/ اپنی یا مرتب کردہ کتاب میں شامل نہیں ہے۔ یہ کسی کتاب/مضمون کا سرقہ یا چربہ نہیں ہے۔اگر کچھ نقص پایا گیا تو اس کے لیے میں خود ذمہ دار ہوں گا/ ہوں گی۔''

- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام،مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

—ادارہ

عالمی اردو نامہ

41واں شارجہ انٹرنیشنل کتاب میلہ اور ادبی وثقافتی تقریبات

دوبئی: ایکسپوسینٹر شارجہ میں منعقد ہونے والے اکتالیسویں شارجہ انٹرنیشنل بک فیئر میں کتابوں کے چاہنے والوں کا جوش وخروش قابل دید تھا۔ اِس کتاب میلے میں 95 مما لک سے 2213 پبلشرز نے شرکت کی جبکہ بلک شیلوز پر بجی کم وبیش ڈیڑھ ملین کتابیں آنے

والے تقریباً سوادو ملین شرکا کی توجہ کی باعث بنی رہیں۔

بارہ یوم جاری رہنے والے اکتالیسویں شارجہ انٹرنیشنل بک فیئر کے اختتامی یوم کی شب 'بزم اردو دبئ' نے اپنے سالانہ جلسہ کی تقریب 'محفل اردو 2022' کا بھی اہتمام کیا جو دیارِ غیر میں مقیم پاکستانی، ہندوستانی سمیت اُردو بولنے وسمجھنے والوں کے لیے مرکزِ نگاہ رہی۔ یہ محفل دو حصوں پر مشتمل تھی۔ پہلے حصے میں بزم اُردو دبئ کے زیر اہتمام ترتیب وتدوین کردہ افسانہ نگار، شاعر، کالم نگار، مترجم اور تعلیم کی ترویج وترقی کے لیے کارفرما سماجی کارکن مرحوم مظہر امید کے افسانوں کے مجموعہ، 'سات رنگ سات سُر' کا اجراعمل میں آیا۔

پہلے حصے کی نظامت کی ذمے داری شاداب الفت نے انجام دی جبکہ دوسرے حصے کی نظامت فرزانہ منصور نے خوش اسلوبی سے کی۔ صاحبزادہ مظہر رفیع ہمایوں اور معروف شاعر وادیب ڈاکٹر صباحت عاصم واسطی نے مظہر امید کے فن اور شخصیت کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی۔ بالی وُڈ کے نامور اداکار رضا مراد نے کتاب سے کچھ اقتباسات سماعتوں کی نذر کیے، جسے خوب سراہا گیا اور بزم اُردو کی جانب سے 'گوشہ کتب' کے زیرعنوان کتابوں کی اشاعت کے سلسلے کو اُردو ادب کے لیے خوش آئند قرار دیا۔ محفل کے دوسرے حصے میں بزم اردو کے سالانہ مجلّے کا اجرا بھی ہوا بعدازاں جوش اردو ایوارڈ معروف شاعر ظفر اقبال، علم دار اردو ایوارڈ ظہور الاسلام جاوید اور پاسبانِ اردو ایوارڈ دِنیش کوٹھاری کو پیش کیا گیا۔ تقریب کے اگلے سیشن میں معروف داستان گو سید ساحل آغا نے داستانِ شعیب اختر پیش کی اور رُکن بزم اُردو ترنم احمد کے ہمراہ شعیب اختر سامعین سے روبہ رو ہوئے۔ دلچسپ سوالات کے بھرپور مدلل جوابات سے حاضرین محفل خوب محظوظ ہوتے رہے۔ شاندار تقریب کے انعقاد پر شرکا نے صدر شکیل احمد خاں، جنرل سکریٹری ریحان احمد خاں، تابش زیدی، احیا بھوجپوری، ثروت زہرا زیدی، کنور محمد سلیم، محمد شیراز، رملہ سید، فرزانہ منصور، سید سروش، عارف صدیقی، سرور نیپالی اور شاداب الفت کی کاوشوں کو سراہا۔

پریس ریلیز: حبیب اعجاز عاشر، 23 نومبر 2022

عرب ریڈنگ چیلنج

دبئی: ایک 7 سالہ شامی لڑکی نے امارات کے نائب صدر اور دبئ کے حکمراں شیخ محمد بن راشد المکتوم کی سرپرستی اور موجودگی میں 10 نومبر بروز جمعرات کو 'عرب ریڈنگ چیلنج' کے چھٹے ایڈیشن میں پہلی پوزیشن حاصل کرلی۔ حلب گورنریٹ کی بچی شام البکور نے اس سال اپنے چھٹے ایڈیشن میں متحدہ عرب امارات کی جانب سے منعقدہ چیلنج مقابلوں کے اندر 'عرب ریڈنگ چیلنج' میں شامی چیمپئن کا اعزاز حاصل کیا۔ شام ان مقابلوں میں پہلی مرتبہ شرکت کر رہا ہے۔ شام البکور نے عرب سطح پر ٹائٹل جیتنے کے لیے 18 عرب ممالک کی نمائندگی کرنے والے 18 شرکا کے ساتھ مقابلہ کیا۔ شامی بچی کی

والدہ نے کہا کہ اس کی چھوٹی بچی اس حادثے میں بچ گئی تھی جس میں اس کے والد کی موت واقع ہوئی تھی۔ شام البکور کے سر پر لوہے کی اشیا لگیں، تاہم وہ حیران کن طور پر موت سے بچ گئی۔ شام البکور نے 100 سے زائد کتابیں پڑھی ہیں۔ البکور نے بتایا اتنی کتابیں پڑھنے کے باعث میں اپنی طرف توجہ مبذول کرانے میں کامیاب رہی اور متعدد ویڈیوز اور انٹرویوز میں نمایاں روانی کے ساتھ معیاری عربی بولتے ہوئے مقامی اور عرب میڈیا کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ واضح ہو کہ عرب ریڈنگ چیلنج مقابلہ 6 سال قبل شروع کیا گیا تھا اور اس مقابلے میں حصہ لینے کے لیے ابتدائی شرط کے طور پر 50 کتابیں پڑھنا ضرور ہیں۔ اس سال دنیا بھر کے 44 ممالک کے 22 ملین طلبہ نے اس کے ایڈیشن میں حصہ لیا۔ چیلنج کے آخری مرحلے کے لیے کوالیفائی کرنے والوں کا انتخاب مخصوص معیارات کے مطابق کیا گیا تھا، ان افراد نے 'عرب ریڈنگ چیلنج' کی ججنگ کمیٹیوں کے بنائے مربوط الیکٹرانک کوالیفائنگ اسٹینڈرڈز کے تحت کوالیفائی کیا تھا۔ عرب ریڈنگ چیلنج کا اہتمام 'محمد بن راشد المکتوم گلوبل انیشیٹوز' نے کیا ہے اور اس کا مقصد ایک تعلیم یافتہ نسل تیار کی جائے اور عربی زبان کو ایک علمی، ادبی وسائنسی زبان کے طور پر متعارف کروایا جائے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 نومبر 2022

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

ہندوستانی ریاستوں کا انضمام اور آئینِ ہند، کے عنوان سے خصوصی لیکچر

نئی دھلی: بھارت کا آئین ہمیں جہاں اپنے تمام شہری حقوق کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے، وہیں اپنے فرائض سے بھی روشناس کرواتا ہے کہ ملک کی تعمیر وترقی میں بطور شہری ہم کیا رول ادا کر سکتے ہیں۔ بھارت کے آئین کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ دنیا کا سب سے طویل آئین ہے، جس کی تشکیل میں ترقی یافتہ جمہوریتوں اور ان کے دستوروں سے استفادہ کیا گیا اور اس میں انسانی حقوق، مذہبی آزادی اور ملکی وحدت کو خاص اہمیت

دی گئی ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان میں یومِ آئین کی مناسبت سے 'ہندوستانی ریاستوں کا انضمام اور آئینِ ہند' کے عنوان سے منعقدہ خصوصی لیکچر سے قبل تعارفی گفتگو کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے کیا۔ انھوں نے لیکچر کے موضوع پر مختصر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہر سال 26 نومبر کو یومِ آئین کے طور پر منایا جاتا ہے تاکہ ہم اپنے آئین کی خوبیوں اور ملکی تعمیر وترقی میں اس کے رول کو یاد رکھتے ہوئے اس کے تئیں وفاداری کے عہد کا اعادہ کرسکیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے یہ پروگرام اسی مقصد سے منعقد کیا ہے، جس کا موضوع 'ہندوستانی ریاستوں کا انضمام اور آئینِ ہند' ہے۔ شیخ عقیل نے کہا کہ اس موضوع پر خصوصی لیکچر دینے کے لیے ہم نے ملک کے ممتاز دانشور، سینئر صحافی اور آئینِ ہند کے مشمولات و خصائص پر گہری نظر رکھنے والے اسکالر شری رام بہادر رائے کو مدعو کیا ہے۔ ہم شکرگزار ہیں کہ انھوں نے ہماری دعوت قبول کی اور ان کا تہہ دل سے استقبال کرتے ہیں۔

شری رام بہادر رائے نے اپنے تفصیلی اور معلومات افزا لیکچر میں آزادیِ ہند کے بعد ملک بھر کی ریاستوں کے جمہوریۂ ہند میں انضمام کی روداد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ان ریاستوں کی ہندوستان میں شمولیت کی تاریخ کافی دلچسپ ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان موجودہ شکل وصورت میں نظر آرہا ہے، ورنہ جس وقت ہندوستان آزاد ہوا تھا ہمارا ملک اس وقت تقریباً چھ سو چھوٹی بڑی ریاستوں اور رجواڑوں میں منقسم تھا۔ انھوں نے بتایا کہ مجلس قانون ساز نے آزادی سے قبل 1946 میں ہی سردار ولبھ بھائی پٹیل کی سربراہی میں ایک کمیٹی بنائی تھی، جس کے تحت ریاستوں کے نمائندوں سے باتیں کی گئیں اور مختلف مرحلوں میں انھیں ہندوستان میں شمولیت پر راضی کیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ اس پورے عمل میں سردار پٹیل اور ان کے ساتھ وی پی مینن نے غیر معمولی کردار ادا کیا۔ ایک اہم بات اپنے لیکچر میں انھوں نے یہ بتائی کہ عام طور پر اس حوالے سے پٹیل کو تخت باور کرایا جاتا ہے، مگر اپنے مطالعے کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ انھوں نے پورے ملک میں پھیلی ہوئی سیکڑوں چھوٹی بڑی ریاستوں کو ہندوستان میں شامل کرنے کا بظاہر مشکل کام نہایت معقول انداز میں اور شائستگی کے ساتھ انجام دیا۔ یہ کام کرتے ہوئے انھوں نے ریاستی سربراہوں، نوابوں اور راجاؤں کی نفسیات کا بھی خیال رکھا، ان کی حیثیت اور مقام کو برقرار رکھنے کی یقین دہانی کروائی، جس کے بعد بات چیت آسان ہوگئی اور بیشتر ریاستیں اپنی مرضی سے ہندوستانی وفاق میں شامل ہوتی گئیں۔ شری رائے نے کہا کہ اس معاملے کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں آزاد ہند کے پہلے گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا کردار بھی قابل ذکر تھا، جس نے ریاستوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے ملک کی آزاد حکومت میں ضم ہو جائیں، حالاں کہ بعض انگریز افسروں نے کچھ ریاستوں کو گمراہ بھی کیا اور انھیں ہندوستان میں شامل ہونے سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر ان کی سازش کامیاب نہیں ہو سکی اور آئین ہند پر یقین اور ہمارے رہنماؤں کی دوراندیشی کی بدولت ہندوستان ایک مضبوط اور متحد جمہوریت کی شکل میں عالمی منظرنامے پر سامنے آیا۔

ڈاکٹر کلیم اللہ (ریسرچ آفیسر) کے اظہارِ تشکر کے ساتھ پروگرام کا اختتام عمل میں آیا۔ اس موقعے پر کونسل کا تمام عملہ موجود رہا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 25 نومبر 2022

قومی اردو کونسل کے وفد کا وجے واڑہ کے سماجی و تعلیمی اداروں کے نمائندوں کے ساتھ تبادلہ خیال

وجے واڑہ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مقامی کیلی گرافی سینٹر کے زیر اہتمام وجے واڑہ و آندھرا پردیش کی سماجی تنظیموں، اسکولز، کالجز اور مدارس کے نمائندگان کے ساتھ ایک انٹرایکشن پروگرام کا انعقاد کیا گیا، جس میں اردو زبان کے فروغ کے تعلق سے کونسل کی اسکیموں کا تعارف کروایا گیا اور وجے واڑہ میں اردو کی تعلیم وترقی کے امکانات پر گفتگو کی گئی۔ اس موقعے پر کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ اردو ہندوستان کی ایک نہایت خوب صورت زبان ہے جسے پورے ملک کے عوام سمجھتے بھی ہیں اور پسند بھی کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بہت بڑی تعداد میں اب وہ لوگ بھی اردو سیکھ رہے ہیں جن کا اردو بیک گراؤنڈ نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں اپنی محنت اور کوششوں کو مزید منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے قومی اردو کونسل کی خدمات اور اسکیموں کا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ کونسل وزارت تعلیم، بھارت سرکار کا ایک خودمختار ادارہ ہے جس کا مقصد اردو زبان کو پورے ہندوستان میں فروغ دینا ہے، اس کے لیے ہماری متعدد اسکیمیں چلتی ہیں، عربی، اردو اور فارسی ڈپلوما کورسز چلائے جاتے ہیں جن کی تعداد ہزاروں میں ہے اور لاکھوں طلبہ وطالبات وہاں تعلیم حاصل کرتے ہیں، جس کی تکمیل کے بعد انھیں اچھی نوکریاں بھی ملتی ہیں۔ شیخ عقیل نے کہا کہ کونسل کے ذریعے پورے ملک میں کمپیوٹر سینٹرز بھی چلائے جاتے ہیں جہاں کمپیوٹر ایپلی کیشنز و بزنس اکاؤنٹنگ کی تعلیم دی جاتی ہے، یہ

کورس نہایت کامیاب ہے اور اسے کرنے کے بعد بچوں کو سرکاری و پرائیویٹ نوکریاں بھی ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ کیلی گرافی اور گرافک ڈزائننگ سینٹر کی بھی اسکیم ہے، جس کے ملک کے مختلف اضلاع میں 71 سینٹر ہیں، جن میں دوسو سے زیادہ اساتذہ برسرِ کار ہیں اور تین ہزار سے زائد طلبہ کیلی گرافی سیکھ رہے ہیں، اس کا تعلق سکل ڈیولپمنٹ سے ہے، اسے کرنے کے بعد کوئی بچہ بے روزگار نہیں رہتا۔ شیخ عقیل نے کہا کہ وجے واڑہ کے لوگ اردو زبان کے تئیں جس جوش وخروش کا مظاہرہ کررہے ہیں اس سے مجھے بے پناہ مسرت ہوئی ہے اور عنقریب ہم یہاں اپنی تمام اسکیمیں جاری کرنے کی کوشش کریں گے۔ خاص طور پر کیلی گرافی کے سینٹرز زیادہ سے زیادہ کھولے جائیں گے۔

اس موقعے پر کیلی گرافی کا کورس مکمل کرنے والے طلبہ کے درمیان ڈائرکٹر قومی اردو کونسل کے ہاتھوں اسناد تقسیم کی گئیں، اس کے علاوہ وجے واڑہ اور آندھرا پردیش کے سیکڑوں این جی اوز اور تعلیمی اداروں کے سربراہوں کا مومنٹو پیش کرکے خیر مقدم کیا گیا۔ قبل ازاں منتظمین نے پروفیسر عقیل احمد اور قومی اردو کونسل کے ریسرچ آفیسرز انتخاب عالم اور ڈاکٹر کلیم اللہ کا شال اور گلدستہ پیش کرکے استقبال کیا۔ اس پروگرام کے انعقاد میں مقامی سینٹر انچارج جناب کریم اللہ اور حیدرآباد سینٹر کے انچارج جناب عبدالغفار نے اہم کردار ادا کیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 13 دسمبر 2022

امیر نہٹوری کی کتاب 'اربابِ ادب' کا اجرا

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں معروف شاعر وادیب امیر احمد خاں امیر نہٹوری کی کتاب 'اربابِ ادب' کا کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل

احمد کے ہاتھوں اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے امیر نہٹوری کی ادبی خدمات کی پذیرائی کی اور کہا کہ مغربی یوپی کا ضلع بجنور اردو زبان و ادب اور علم وفضل کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے، جہاں سے سیکڑوں اصحابِ کمال پیدا ہوئے اور انھوں نے ایک دنیا کو فیض پہنچایا ہے۔ نہٹور بھی اسی ضلعے کا مشہور قصبہ ہے، جہاں سے سجاد حیدر یلدرم، نذر سجاد حیدر، قرۃ العین حیدر، حکیم نیر واسطی وغیرہ جیسے مشاہیر ادب کا تعلق رہا ہے اور آج بھی وہاں علم وادب کا چراغ روشن ہے۔ امیر نہٹوری نے اس کتاب میں نہٹور کی ادبی، علمی و تاریخی خصوصیات کا بڑی خوبی اور جامعیت کے ساتھ احاطہ کیا ہے اور اس خطے سے تعلق رکھنے والے درجنوں اہلِ علم وکمال کی خدمات کو عمدہ انداز میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ شخصیات کے علاوہ بھی چند فکر انگیز مضامین اس کتاب میں شامل ہیں۔ شیخ عقیل نے کہا کہ اس کتاب کے مطالعے سے بجنور، نہٹور اور آس پاس کے خطے سے تعلق رکھنے والے نئی پرانی درجنوں علمی و ادبی شخصیات اور ان کے کارناموں سے آگاہی ہوتی ہے۔ ہر علاقے کی ادبی خدمات و شخصیات پر اس طرح کی کتابیں آنی چاہئیں تاکہ ادب اور ادبی سرگرمیوں کا وسیع تر منظرنامہ لوگوں کے سامنے آسکے اور تاریخ ادب میں ان تمام لوگوں کی خدمات کا صحیح معنوں میں اعتراف ہوسکے جو مرکزی علاقوں کے بجائے دور دراز کے علاقوں میں رہ کر خلوص نیت اور بے لوثی کے ساتھ اردو زبان وادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ میں امیر نہٹوری کو اس کتاب کی اشاعت پر تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اس موقعے پر مصنف کے علاوہ معروف ناقد وادیب حقانی القاسمی و دیگر حضرات بھی موجود رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 5 دسمبر 2022

امتیاز وحید کی مرتبہ کتاب 'احمد علوی کی ظریفانہ شاعری' کا اجرا

نئی دہلی: احمد علوی کی ظریفانہ شاعری میں سماجی برائیوں پر طنز کے بہت عمدہ اور اثر انگیز نمونے ملتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کی یہ شاعری محض تفریح طبع کا سامان نہیں رہتی

ہے، بلکہ اس میں مقصدیت کا عنصر بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے کونسل کے صدر دفتر میں امتیاز وحید کی مرتبہ کتاب 'احمد علوی کی ظریفانہ شاعری' کے اجرا کے موقعے سے کیا۔ انھوں نے کہا کہ سنجیدہ شاعری یا غزل گوئی نسبتاً آسان ہے اس لیے فن شعرگوئی سے دلچسپی رکھنے والے عموماً اسی کا رخ کرتے ہیں، مگر ظریفانہ شاعری اس معنی میں ایک مشکل صنف ہے کہ اس میں شاعرانہ مہارت کے ساتھ موضوعات کی حساسیت کو بھی پیش نظر رکھنا ہوتا ہے، احمد علوی نے اس معاملے میں اپنے فنی کمال کا مظاہرہ کیا ہے شیخ عقیل نے کہا کہ احمد علوی کی مزاحیہ شاعری کی ایک خاص بات فکری شائستگی و گیرائی بھی ہے، اس میں ایک وقار و متانت ہے، وہ پھکڑ پن نہیں ہے جو عموماً آج کی مزاحیہ شاعری میں پایا جاتا ہے، وہ لفظوں کے معمولی ہیر پھیر سے بھی گہرے معانی پیدا کرنے کا ہنر جانتے ہیں، زبان و بیان کی سلاست و سادگی بھی ان کے قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور انھی اوصاف کی وجہ سے بڑے بڑے ادیبوں اور ناقدوں نے ان کی ظریفانہ شاعری کی ستائش کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ امتیاز وحید کی مرتبہ اس کتاب میں دو درجن سے زائد ناقدین اور اہل قلم کے مضامین و تاثرات جمع ہیں، جن کے مطالعے سے احمد علوی کی ظریفانہ شاعری کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، ساتھ ہی اس میں ان کی شاعری کے کچھ عمدہ نمونے بھی شامل کیے گئے ہیں، جن سے قارئین براہ راست ان کی شاعرانہ صلاحیتوں اور تخلیقی رنگارنگی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ میں اس کی اشاعت پر امتیاز وحید اور احمد علوی دونوں کو تہہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اس موقعے پر احمد علوی کے علاوہ ممتاز شاعر ڈاکٹر ایم آر قاسمی ،معروف ناقد حقانی القاسمی وغیرہ موجود رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 21 نومبر 2022

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر.............................. بتاریخ.............................. بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

دستخط

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

مولانا ابوالکلام اور قومی تعمیر میں ان کے افکار کا کردار

نئی دھلی: انڈیا عرب کلچرل سینٹر، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیراہتمام اور توحید ایجوکیشنل ٹرسٹ کے تعاون سے مولانا ابوالکلام آزاد کی یوم پیدائش کے موقعے پر 'مولانا

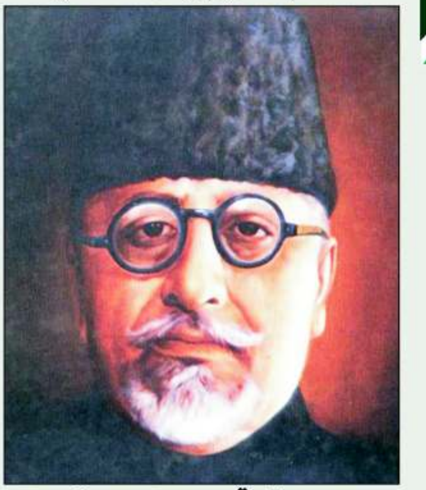

ابوالکلام آزاد اور قومی تعمیر میں ان کے افکار کا کردار' کے موضوع پر ایک سمپوزیم کا پروفیسر محمد ایوب ندوی ڈائرکٹر انڈیا عرب کلچرل سینٹر، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی صدارت میں انعقاد کیا گیا جس میں مہمان خصوصی کے طور پر سابق چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد جناب ظفر سریش والا نے شرکت کی جب کہ پروفیسر سلیل مشرا، شعبۂ تاریخ، امبیڈکر یونیورسٹی، دہلی، پروفیسر سنجے کمار پانڈے جواہر لال یونیورسٹی دہلی، جناب جنید حارث شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور مولانا مطیع الرحمٰن (توحید ایجوکیشنل ٹرسٹ) نے مولانا ابوالکلام آزاد کے افکار اور قومی تعمیر میں ان کے کردار اور خدمات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروفیسر سلیل مشرا نے مولانا آزاد کی حیات اور ان کی مختلف میدانوں میں خدمات پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ یہی وہ تمام شعبے ہیں جن کے ذریعے مولانا آزاد کے افکار کو ہم پورے طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ جناب ظفر سریش والا نے اپنے خطاب میں کہا کہ مولانا آزاد کی کتاب 'غبارِ خاطر' کو آج کے حالات میں بار بار پڑھنے کی ضرورت ہے۔ جناب جنید حارث نے مولانا آزاد کی خدمات پر گفتگو کرتے ہوئے انھیں ہندوستان کی جدید تعلیم کے معمار کے طور پر یاد کیا نیز مولانا آزاد کو قومی یکجہتی کا بڑا علمبردار قرار دیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 13 نومبر 2022

ساہتیہ اکادمی کے زیراہتمام کتاب میلہ

نئی دھلی: ساہتیہ اکادمی کی جانب سے منعقدہ 'پستکاین' کتاب میلے کا موضوع اس بار بچوں کے ادب پر مرکوز تھا۔ 'اپنے پسندیدہ مصنف سے ملو' پروگرام کے تحت مختلف اسکولوں کے بچوں کو 'بچوں کے نامور مصنفین بالسوروپ راہی، دیوک میش، کشما شرما، کمل جیت نیلو، پاروآنند اور اردو کے معروف ادیب اسد رضا کو ہر روز سننے کا موقع ملا۔ اسد رضا نے بچوں کو اپنی کہانی ننھے منوں کی سرکار سنائی اور انھیں مصنف بننے کے لیے ضروری تیاری کے بارے میں بھی بتایا۔ انھوں نے کہا کہ اگر بچے اپنی روزمرہ کی باتیں ڈائری میں لکھنے کی عادت بنائیں تو وہ آہستہ آہستہ اچھے مصنف بن سکتے ہیں۔ انھوں نے بچوں کے سوالات کے جوابات بھی دیے۔ بچوں کے ادبی پروگرام میں بچوں کے نامور مصنف یوگیندر دت شرما کی صدارت میں دیشا گروور، گھمنڈی لال اگروال، رشی راج، سوریہ ناتھ سنگھ، وید مترا شکلا اور ویلوسراوانن نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔ سوری ناتھ سنگھ نے 'بھولئی کا کا' کہانی سنائی جو بھولئی نامی کردار پر مرکوز تھی جو شام کو بھول جانے کی عادت سے پریشان تھا۔ اس بھول کی عادت کی وجہ سے بہت سے دلچسپ حالات پیدا ہوئے، جنھیں سن کر بچے لطف اندوز ہوئے۔ دیشا گروور، وید مترا شکلا، گھمنڈی لال اگروال اور یوگیندر دت شرما نے بچوں کو مختلف موضوعات پر نظمیں سنائیں۔ وید مترا شکلا کی ناگارانی گیڈینلیو پر مبنی نظم سنائی گئی جسے بچوں نے بہت پسند کیا۔ رشی راج نے کارگل جنگ میں شہید انوج نیر کی قربانی کی کہانی بیان کرتے ہوئے بچوں میں ملک کی خدمت کے لیے جوش پیدا کیا۔ ویلوسراوانن نے اپنی کہانی میں زمین اور آسمان کے درمیان تعلق پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے ایک کہانی کو بیان کیا ہے۔ سی سی آر ڈی کے تعاون سے پیش کیے گئے۔ 'آزادی کے رنگ بال کلاکاروں کے سنگ' کے عنوان سے ثقافتی پروگراموں کی ایک سیریز میں کلاسیکی گائیکی پیش کی گئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 نومبر 2022

رحیم خان خاناں اور ان کی شاعری

نئی دھلی: شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیراہتمام 'ہندی کے مشہور شاعر رحیم اور ان کی شاعری' کے موضوع پر پروفیسر عبدالماجد قاضی صدر شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی صدارت میں توسیعی خطبہ کا انعقاد کیا گیا جس میں مہمان خطیب کی حیثیت سے شعبۂ ہندی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر پروفیسر چندر دیو یادو نے شرکت کی اور اپنا خطبہ پیش کیا۔ پروگرام کے آغاز میں شعبۂ عربی کے توسیعی خطبوں کے کوآرڈینیٹر پروفیسر نسیم اختر ندوی نے مہمان خطیب، اساتذہ، ریسرچ اسکالرس اور طلبہ و طالبات کا استقبال کیا اور پروفیسر چندر دیو یادو کا تعارف پیش کرتے ہوئے ان کی شاعری، تنقید اور صحافت کے میدان میں خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی نیز اس توسیعی خطبہ کی اہمیت پر گفتگو کی۔ پروفیسر نسیم اختر ندوی کے بعد پروفیسر چندر دیو یادو نے رحیم کی حیات اور شاعری کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ رحیم کئی زبانوں پر عبور رکھتے تھے وہ ایک بڑے سپہ سالار بھی تھے اور اکبر کے خاص لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا، فاضل خطیب نے رحیم کی شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ان کی شاعری ان کی ذاتی زندگی کے ساتھ اس وقت کے معاشرہ کی آئینہ دار ہے، اس میں ہمیں ایک طرف جہاں ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں تو دوسری طرف سماج کے کمزور لوگوں کے مسائل اور درد کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ رحیم نے مختلف اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر موضوع کا حق بھی ادا کیا ہے، پروفیسر چندر دیو یادو نے ان کے اشعار کے ذریعہ سامعین کو ان کی شاعری کی خصوصیات کے بارے میں تفصیل سے بتایا، مہمان خطیب نے کہا کہ رحیم کی آخری زندگی

دردوالم سے بھرپور ہے جس کی عکاسی اس وقت کی ان کی شاعری میں ہمیں نظر آتی ہے۔ فاضل خطیب کے بعد صدر جلسہ پروفیسر عبدالماجد قاضی نے پروفیسر چندردیو یادو کا اس علمی خطبہ کے لیے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں پروفیسر چندردیو یادو کے خطاب سے عبدالرحیم خان خاناں کی شاعری اور ان کی زندگی کے بارے میں کافی علمی باتیں معلوم ہوئیں۔ پروگرام کے آخر میں پروفیسر نسیم اختر ندوی نے مہمان خطیب، تمام اساتذہ، ریسرچ اسکالر اور طلبہ وطالبات کا شکریہ ادا کیا۔ اس پروگرام میں بطور خاص پروفیسر محمد ایوب ندوی، پروفیسر حبیب اللہ خان، پروفیسر فوزان احمد، ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی، ڈاکٹر صہیب عالم، ڈاکٹر محفوظ الرحمٰن، ڈاکٹر عظمت اللہ اور شعبہ کے ریسرچ اسکالرس اور طلبہ وطالبات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 19 نومبر 2022

یادِ ذوق

نئی دهلی: اردو کے ممتاز شاعر استاد شیخ محمد ابراہیم ذوق کے یوم وفات کی مناسبت سے غالب انسٹی ٹیوٹ میں یاد ذوق کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقعے پر تقاریر اور شعری نشست

کا اہتمام کیا گیا۔ تقریری نشست کی صدارت غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی۔ اپنے صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا کہ یہ بڑا یادگار موقع ہے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ میں ذوق کو یاد کیا جارہا ہے۔ عام طور سے ذوق کو غالب کے حریف کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں کچھ تاریخی صداقت بھی ہے لیکن ذوق و غالب ہی کیا کسی شاعر کا دوسرے شاعر سے موازنہ صحیح نہیں ہے۔ ہر شاعر اپنی فکر اور اپنے انداز کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔ مہمان خصوصی اور ایسوسی ایشن آف انڈین یونیورسٹیز کے جوائنٹ سکریٹری ڈاکٹر بلجیت سنگھ شیخوں نے کہا کہ اردو زبان ہندوستانی تہذیب ہی نہیں انسانیت کو بھی سمجھنے کی سب سے مضبوط بنیاد ہے۔ ہم سے یہ خطا تو ہوئی کہ ہم نے اردو کو ایک خاص طبقے سے مخصوص سمجھ لیا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ ذوق کا عہد اردو ادب کی تاریخ میں سب سے اہم دور ہے کیونکہ زبان نے اپنی شکل اختیار کرلی تھی اب اس کی آرائش کا وقت آگیا تھا اور ذوق نے اپنے کلام سے اس فریضے کو ادا کیا۔ ڈاکٹر شاہینہ تبسم نے کہا کہ جس دور میں ذوق نے شاہ نصیر کی شاگردی اختیار کی اس وقت دہلی کے افق پر شاہ نصیر کا رنگ سخن چھایا ہوا تھا۔ ان کے انداز سخن کو قبولیت عام مل چکی تھی، ذوق نے اس رنگ کو قبول ہی نہیں کیا بلکہ اس میں کمال حاصل کیا اور اسے ترقی دی۔ پروفیسر سرورالہدیٰ نے کہا کہ ذوق کو پڑھنے کے دو تقاضے ہیں، ایک تو یہی کہ ہم اسی روایت کی روشنی میں ان کے کلام کو پڑھیں۔ اس قرأت میں روایت کے حصار کے باوجود روایت سے ماورا بھی دیکھا جاسکتا ہے اور دوسری قرأت وہ ہے جس میں ہم اپنے زمانے کا آشوب تلاش کرتے ہیں۔ اس دوسری قرأت میں ذوق کے اشعار بہت دور تک ہمارا ساتھ نہیں دیتے۔ ڈاکٹر شمیم احمد نے کہا کہ ذوق اپنے زمانے کے نمائندہ شاعر تھے اور اس زمانے میں انھیں غالب پر فوقیت حاصل تھی لیکن ایک دور کے بدلتے ہی ان کی حیثیت بدل گئی۔ ذوق کے زمانے میں ترتیب یہ تھی کہ ذوق، مومن اور غالب لیکن بعد میں ترتیب یہ بنی کہ غالب، مومن اور ذوق۔ یہ صرف تاریخ کی کروٹ نہیں تھی بلکہ ایک تہذیب کا بدل جانا تھا۔ اس موقعے پر ایک طرحی مشاعرے کا بھی اہتمام کیا گیا جس کی صدارت معصوم مرادآبادی نے کی اور نظامت کے فرائض معین شاداب نے انجام دیے۔ مشاعرے میں منیر ہمدم، صہیب فاروقی، نعمان جمال، اقبال مسعودی ہنر، محمد مستمر، گایتری محمد انس فیضی، خالد اخلاق، معین شاداب نے اشعار سنائے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 18 نومبر 2022

فن ترجمہ کے موضوع پر لیکچر

نئی دهلی: انڈیا عرب کلچرل سینٹر، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام سینٹر کی جانب سے عربی زبان میں ہندوستانی دانشوران اور ادیبوں کی کتابوں کے مترجمین کے اعزاز میں پروگرام کے ساتھ فن ترجمہ کے موضوع پر لیکچر کا انعقاد پروفیسر محمد ایوب ندوی ڈائرکٹر انڈیا عرب کلچرل سینٹر، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی صدارت میں کیا گیا جس میں مہمان خصوصی کے طور پر انڈیا عرب کلچرل سینٹر کے بانی ڈائرکٹر پروفیسر ذکرالرحمٰن نے شرکت کی جب کہ پروفیسر مجیب الرحمٰن سابق صدر اسکول آف عربک اینڈ افریقن اسٹڈیز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی نے 'عرب اسلامی ثقافت میں ترجمہ' کے موضوع پر خطبہ پیش کیا۔ پروگرام کے آغاز میں پروفیسر محمد ایوب ندوی نے تمام مہمانوں، اساتذہ، ریسرچ اسکالرس اور طلبہ وطالبات کا استقبال کیا اور فن ترجمہ کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ترجمہ ہی واحد ذریعہ ہے جس سے ہم مختلف ملکوں کی تہذیب و ثقافت سے واقف ہوسکتے ہیں۔ پروفیسر مجیب الرحمٰن نے اپنا خطبہ پیش کیا جس میں موصوف نے فن ترجمہ کے اصول اور عرب اور اسلامی ثقافت میں ترجمہ نگاری نیز مختلف ادوار میں عربی زبان میں ترجمہ کی تاریخ کے ساتھ مختلف علوم وفنون کی کتابوں کے ترجمہ پر روشنی ڈالی اور ان ادوار کے مترجمین کی خدمات کا تفصیل سے احاطہ کیا۔ لیکچر کے بعد پروفیسر مجیب الرحمٰن اسکول آف عربک اینڈ افریقن اسٹڈیز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، پروفیسر محمد ایوب ندوی، پروفیسر حبیب اللہ خان، پروفیسر عبدالماجد قاضی، پروفیسر نسیم اختر ندوی، ڈاکٹر صہیب عالم شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، پروفیسر ذکرالرحمٰن سابق ڈائرکٹر انڈیا عرب کلچرل سینٹر اور ڈاکٹر آفتاب عالم انڈیا عرب کلچرل سینٹر، جامعہ ملیہ اسلامیہ کو اعزاز سے نوازا گیا اور ان کے ترجموں کی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ اس کے بعد پروفیسر ذکرالرحمٰن نے انڈیا عرب کلچرل سینٹر، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کے پس منظر اور سینٹر کی جانب سے ہندوستانی کتابوں کے ترجمے کے مقصد اور اہمیت پر روشنی ڈالی۔ پروگرام کے آخر میں انڈیا عرب کلچرل سینٹر کے استاذ ڈاکٹر آفتاب عالم نے تمام مہمانوں، اساتذہ، ریسرچ اسکالرس اور طلبہ وطالبات کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 18 نومبر 2022

کچھ لمحے حافظ کرناٹکی کے ساتھ

نئی دهلی: موجودہ وقت میں کرناٹک سے ادب کی نمائندگی کرنے والے، ادب اطفال کے نمائندہ ادیب اور ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ شاعر و ادیب حافظ کرناٹکی (امجد حسین امجد) کے اعزاز میں ابوالفضل انکلیو جامعہ نگر، نئی دہلی میں 'کچھ لمحے حافظ کرناٹکی کے ساتھ' کے عنوان سے ایک نشست کا انعقاد کیا گیا جس میں حافظ کرناٹکی نے اپنی گفتگو میں کہا کہ ادب اطفال ادب اور زندگی کا پہلا لمس ہے، اس کی لذت نے مجھے سرشار کردیا اور میں اسی کا ہوکر رہ گیا۔

ادب اطفال زبان وادب اور کائنات کی روح کا عطر ہے اس کی خوشبو کو باقی رکھنا اور بڑے لوگوں تک پہنچانا ہم سب کا فرض ہے۔ حافظ کرناٹکی کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر امیر حمزہ نے کہا کہ حافظ کرناٹکی شش جہات شخصیت کے حامل ہیں لیکن انھوں نے اپنے آپ کو محض شاعر اور ادیب کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ وہ اگرچہ ماہر تعلیم ہیں اور زبیدہ ایجوکیشنل ٹرسٹ کے زیر انتظام متعدد مدارس اور عصری تعلیمی ادارے چلا رہے ہیں، سماجی خدمت گار بھی ہیں لیکن وہ خود کو صرف ادیب سمجھتے ہیں۔ محفل سے خطاب کرتے ہوئے مشہور ومعروف ادیب و ناقد حقانی القاسمی نے کہا کہ بہت سے لوگ ادب اطفال لکھ کر اپنے آپ کو بڑا بنایا یا بڑا بنانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن حافظ کرناٹکی نے ادب اطفال سے اپنے آپ کو بڑا نہیں کیا بلکہ بہت سارے بچوں کو بڑا بنا دیا۔ نشست میں ادب اطفال پر اپنی گراں قدر خدمات انجام دینے والے ادیب وصحافی حبیب سیفی نے بھی شرکت کی۔ اس محفل کی صدارت بزرگ شاعر وادیب وصحافی جناب سلیم شیرازی نے فرمائی اور نظامت ڈاکٹر فرمان چودھری نے کی۔ شریک شعرا میں سلیم شیرازی، معین شاداب، حبیب سیفی، معین قریشی، جاوید صدیقی، سراج طالب، فرمان چودھری، خالد اخلاق، اہتمام صادق، سیف ازہر کے نام قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج'، دہلی، 16 نومبر 2022

ڈاکٹر فردوس عظمت صدیقی کے ناول 'زنداں' پر مذاکرہ

نئی دہلی: ڈاکٹر فردوس عظمت صدیقی کے ناول 'زنداں' پر انڈیا انٹرنیشنل سینٹر نئی دہلی میں ایک مذاکرے کا اہتمام کیا گیا۔ مذاکرہ میں حال ہی میں جے سی بی ایوارڈ یافتہ پروفیسر خالد جاوید نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ خصوصی تبصرہ کے لیے ہندی کی مشہور شاعرہ پروفیسر سویتا سنگھ اور غالب اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد بھی موجود تھے۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر فرحت نسرین نے کی۔ جب کہ نظامت کی ذمے داری راہل کپور نے انجام دی۔ پروفیسر فردوس کے ناول 'زنداں' پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر خالد جاوید نے اس ناول کو ایک اہم سماجی وسیاسی ادب کے طور پر دیکھنے کی ضرورت کی طرف اشارہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ ناول کورونا پر لکھا جانے والا واحد ادب ہے جو براہ راست اردو میں لکھا گیا۔ یہ ناول تاریخ میں درج ہونے کا مستحق ہے۔ پروفیسر سویتا نے کہا کہ کورونا پر اردو میں ناول کا آنا خواتین لکھاریوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے ناول کو کووڈ پر ایک مناسب دستاویز کے طور پر دیکھنے کی بات کی۔ اپرنا دکشت نے کہا کہ ناول میں ایک عورت کووڈ کے درمیان کھڑی ہے اور کووڈ اور لاک ڈاؤن کو دیکھ رہی ہے۔ پروفیسر فرحت نسرین نے کہا کہ ناول 'زنداں' آج کے مقابلے میں بہت آگے کی بات کرتا ہے۔ اس دوران مصنفہ ڈاکٹر فردوس عظمت صدیقی نے ناول کا کچھ حصہ پڑھ کر شرکا کو سنایا۔ ڈاکٹر ترنم صدیقی کے شکریہ کے ساتھ پروگرام کا اختتام ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 دسمبر 2022

عربی ادب اور اس کی اصناف کا مختلف ادوار میں ارتقا

نئی دہلی: جے این یو کے شعبۂ عربی و افریقی کے ماتحت دو روزہ عالمی کانفرنس کی افتتاحی تقریب جے این یو کنونشن سینٹر میں منعقد ہوئی۔ کانفرنس کا عنوان 'عربی ادب اور اس کی اصناف کا مختلف ادوار میں ارتقا' تھا۔ تقریب میں کویت کے سفیر شیخ جاسم ابراہیم الناجم، عمان کے قائم مقام سفیر مبارک سلیمان بدر البسامی، سعودی کلچرل اتاشی ڈاکٹر خالد یوسف برقاوی وغیرہ کے علاوہ مصر، جزائر اور دوسرے عرب ممالک سے اساتذہ اور محققین نے شرکت کی۔ افتتاحی اجلاس میں مرکز کے چیئرپرسن پروفیسر رضوان الرحمٰن نے تمام مہمانوں، اساتذہ وطلبہ کو خوش آمدید کہا اور اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ کانفرنس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عبیدالرحمٰن طیب نے کہا کہ عربی زبان و ادب نے ارتقا کے مختلف مراحل طے کیے ہیں اور آج وہ دنیا کی دوسری زبانوں کے ساتھ پہلے کی طرح شانہ بشانہ کھڑی ہے۔ پروفیسر مظہر آصف نے مختلف ادبا اور علما کا تذکرہ کیا جنھوں نے عربی زبان کی ترقی میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ کویت کے سفیر جاسم ابراہیم الناجم نے کہا کہ عربی زبان جہاں دین وعبادت کی زبان ہے وہیں وہ جدید علوم وفنون کی بھی زبان ہے۔ عمان کے قائم مقام سفیر مبارک سلیمان بدر البسامی نے بتایا کہ عربی زبان وادب کی ترقی میں عمان نے بہت بڑا کردار نبھایا ہے۔ سعودی کلچرل اتاشی ڈاکٹر خالد یوسف برقاوی نے کہا کہ ادب کسی بھی ملک کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ سعودی عرب میں عربی ادب کی ہر صنف میں بہت کام ہوا ہے۔ شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر پروفیسر عبدالماجد قاضی نے عربی زبان وادب کی مختلف اصناف کے فروغ وترقی پر روشنی الی۔ قاہرہ یونیورسٹی کے پروفیسر سامی سلیمان نے عربی ادب کی ترقی کے مختلف مراحل پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں عربی ادب نے متنوع اصناف میں نمایاں ترقی کی ہے۔ جے این یو کے ریکٹر ستیش چندر گرکوٹی نے جلسے کی صدارت کی اور کہا کہ کانفرنس کا موضوع بہت اہم ہے اور ہمیں امید ہے کہ یہ کانفرنس ہندوعرب کے تعلقات کو اور مضبوطی بخشے گی جو دو ہزار سال سے بھی زیادہ قدیم ہیں۔ ڈاکٹر محمد اجمل نے اخیر میں تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر عبیدالرحمٰن کی کتاب 'الموجز فی تاریخ الاسلام' کی رونمائی بھی عمل میں آئی۔ اس کانفرنس میں ہندوستان کے علاوہ مصر، الجزائر، مراکش، فلسطین وغیرہ ملکوں کے 103 مقالہ نگاروں نے آن لائن وآف لائن اپنا مقالہ پیش کیا۔ یہ دو روزہ کانفرنس افتتاحی سیشن، بارہ علمی اجلاس اور اختتامی سیشن پر مشتمل تھی۔ کانفرنس میں پروفیسر زبیر احمد فاروقی، پروفیسر شفیق احمد خان، پروفیسر محمد ایوب ندوی، پروفیسر مجیب الرحمٰن، پروفیسر نعیم الحسن، پروفیسر نسیم اختر، پروفیسر فوزان احمد کے علاوہ ملک و بیرون ملک کی متعدد یونیورسٹیز اور کالجز کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز شریک تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 دسمبر 2022

اترپردیش

جدید لسانیات اردو ادب کے حوالے سے

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے شعبہ لسانیات کے زیر اہتمام ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی کے تعاون سے 'جدید لسانیات اردو ادب کے حوالے سے' موضوع پر منعقدہ ایک روزہ سمپوزیم میں ماہرین لسانیات اور اردو اسکالروں نے اردو ادب اور اس کی نحوی ساخت و صوتیاتی خصوصیات پر تبادلہ خیال کیا۔ کلیدی خطبہ دیتے ہوئے پروفیسر خواجہ اکرام الدین (جے این یو) نے ادب کا مطالعہ کرنے کے لیے لسانیات میں اسٹائلسٹکس کے ابھرتے ہوئے شعبے کی اہمیت بیان کی اور ادبی کاموں کے تجزیہ میں مورفولوجی، نحو، صوتیات اور سیمنٹکس کے استعمال پر روشنی ڈالی۔ لسانی خصوصیات اور اسالیب پر بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ادب، اسٹائیلسٹکس کے بغیر مکمل نہیں ہوتا کیونکہ یہ جذبات، احساسات، اور استعاروں کی وضاحت میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ انھوں نے کہا ''اسٹائیلسٹکس ادب میں زبان کے فنکارانہ استعمال اور بیانیے کی خوبصورتی کو دیکھنے کا فن ہے۔

خیالات، تجربات، یا تخیل کے اظہار کا کوئی ایک طریقہ نہیں ہے اور ہر مصنف کے پاس اظہار کا ایک الگ طریقہ ہوتا ہے۔'' انھوں نے ادب میں استعمال ہونے والی زبان کے اسلوب اور لسانی تجزیہ کی خوبصورتی کی وضاحت کے لیے مختلف شعرا کی تخلیقات بھی پیش کیں۔ مہمان خصوصی پروفیسر انور پاشا (جے این یو) نے نوم چومسکی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ''زبان صرف الفاظ پر مشتمل نہیں ہوتی۔ یہ ثقافت، روایت اور کمیونٹی کا ملن ہے'' انھوں نے کہا ''زبان وقت گزرنے کے ساتھ بدلتی ہے اور اگر لوگ استعمال نہ کریں تو وہ مر بھی سکتی ہے۔ اگر ہم وقت کے ساتھ زبان، ثقافت، روایت، اقدار اور اسلوب میں تبدیلی کو دیکھیں۔''

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 نومبر 2022

انیس کی شاعری

لکھنؤ: اپنے شاعرانہ محاسن کی وسعت اور ہمیشہ ذہن میں زندہ رہنے والی صفت کی بنا پر انیس کی شاعری ہر نئے

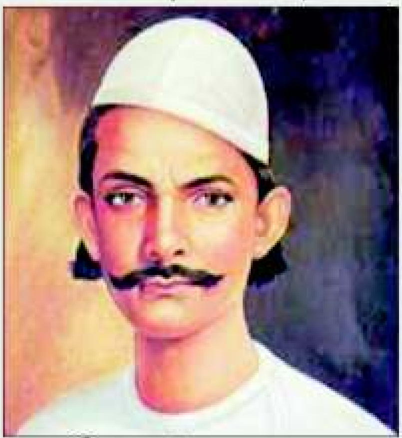

نظریے سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ انیسی مرثیہ بظاہر ایک مخصوص واقعے اور ایک محدود موضوع سے متعلق ہے لیکن انیس نے اپنی قوت کلام اور وسعت معنی کی وجہ سے اس میں شاعری کے وسیع امکانات اور مختلف النوع جہات پیدا کر دیے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر انیس اشفاق، سابق صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی نے معروف سینئر صحافی سعید نقوی کی صدارت میں منعقد جلسے میں کیا جس کا اہتمام کانپور کے سینئر ایڈووکیٹ سعید نقوی مصطفیٰ آبادی نے انیس کو خراج عقیدت پیش کرنے کی غرض سے مصطفیٰ آباد میں واقع اپنی آبائی رہائش گاہ پر کیا تھا۔ پروفیسر انیس اشفاق نے انیس کا مصرعہ 'نافہم سے کب داد سخن لیتا ہوں' پڑھتے ہوئے کہا کہ یہ میری خوش بختی ہے کہ میں انیس فہموں اور مرثیہ شناسوں کے درمیان گفتگو کر رہا ہوں۔ مصطفیٰ آباد کی سرزمین پورے برصغیر میں اپنی انیس دانی کے لیے مشہور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی مٹی کے ساختہ و پرداختہ ایک شخص ضمیر اختر نقوی نے اردو مرثیے بالخصوص انیس پر وہ کام کیا جس کی پذیرائی برصغیر میں ہر طرف کی گئی۔ اس مردم خیز خطے کے بچے بچے کی زبان پر انیس کے بند رواں رہتے ہیں اور وہ منبر پر انیس خوانی کا غیر معمولی مظاہرہ کرتے ہیں۔ تقریب کے صدر اور سینئر صحافی سعید نقوی نے اپنے مخصوص انداز میں انیس کے بہت سے بند کی قرأت کے ذریعے انیس کی بہت سی شعری خوبیوں کا احاطہ کیا اور کہا کہ اپنی شاعری کی بے پناہ خوبیوں کی بنا پر انیس بجا طور پر خدائے سخن کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ بزرگ شاعر اور استاد اصغر نقوی مصطفیٰ آبادی، تسنیم کوثر اور تراب اختر نے انیس کی غزلوں اور سلاموں کے ذریعے انیس کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ سعید نقوی ایڈووکیٹ نے اپنی تعارفی تقریر میں انیس کے شاعرانہ محاسن بیان کرتے ہوئے انھیں ہر زمانے میں زندہ رہنے والا شاعر قرار دیا اور شرکائے جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔ جلسے سے کاشف اختر مصطفیٰ آبادی نے بھی خطاب کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 نومبر 2022

سرسید احمد خاں کی حیات و خدمات

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے ایس ٹی ایس اسکول میں سرسید احمد خاں کی حیات و خدمات پر ایک خطبہ کا اہتمام کیا گیا۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے شعبۂ ترسیل عامہ کے پروفیسر ایم شافع قدوائی نے کہا کہ اے ایم یو کے بانی سرسید احمد خاں نے اس حقیقت کو محسوس کر لیا تھا کہ 1857 کے بعد کے ہندوستان میں سماجی تبدیلی لانے کے لیے علم اور جدید تعلیم ہی کلیدی کردار ادا کریں گے۔ انھوں نے کہا سرسید نے جلد ہی یہ محسوس کر لیا کہ سائنس اور ٹکنالوجی کا علم ہی انسان کو ترقی اور خوشحالی کی بلند ترین منزلوں تک لے جا سکتا ہے۔ سرسید نے اس بات پر زور دیا کہ تعلیم اور معاشی ترقی کے معاملے میں مغرب کے ہم پلہ ہونے کے لیے اس طرح کا علم ضروری ہے۔ پروفیسر قدوائی نے مزید کہا کہ سرسید نے علی گڑھ تحریک کی بنیاد رکھی اور لوگوں کو تعلیم کی اہمیت کے بارے میں قائل کیا۔ انھوں نے پوری زندگی لوگوں کو یہ باور کرانے میں صرف کی کہ ہم سائنس اور ٹکنالوجی کے جدید علم کے ذریعے ہی مغربی دنیا کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ایس ٹی ایس اسکول کے پرنسپل مسٹر فیصل نفیس نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا اور طلبہ کو تجزیہ، سوال اور تفہیم کے لیے تنقیدی نقطۂ نظر فروغ دینے کی ترغیب دی۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 10 نومبر 2022

اردو صحافت: ماضی، حال اور مستقبل

وارانسی: اردو زبان اتنی شیریں ہے کہ یہ کل بھی تھی آج بھی ہے اور کل بھی رہے گی۔ یہ باتیں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے وائس چانسلر پروفیسر سید عین الحسن نے 'اردو صحافت ماضی، حال اور مستقبل' موضوع پر مہاتما گاندھی کاشی ودیاپیٹھ کے لائبریری ہال میں مہمان خصوصی کے طور پر 25 نومبر کو اپنے خطاب میں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ بنارس میں کئی یونیورسٹیاں ہیں، بیشتر میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس شہر کے قرب و جوار کے رہنے والے مرزاپور، بھدوہی وغیرہ کے لوگ جب دور دراز کے شہروں میں جاتے تھے تو کہتے تھے کہ ہم بنارسی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں ساری دنیا گھوم چکا ہوں مگر بنارس جیسا کوئی شہر نظر نہیں آیا۔ دنیا جدیدیت کی جانب دوڑ رہی ہے لیکن بنارس اپنی جگہ قائم ہے۔ راجا رام موہن رائے، منشی پریم چند، مرزا اسداللہ خاں غالب وغیرہ نے اردو کے لیے بہت کام کیا ہے۔ مہمان اعزازی ایم، ڈبلیو انصاری (آئی پی ایس) نے کہا کہ اردو قدیم زمانے سے اس لیے ہے کہ اس زبان میں بہت مٹھاس ہے۔ اپنے صدارتی خطاب میں مہاتما گاندھی کاشی ودیاپیٹھ کے پروفیسر اشوک مشر نے کہا ٹیپو سلطان نے 1794 میں اردو اخبار نکالا تھا، میں تو کہتا ہوں کہ اردو ہندی کی بڑی بہن نہیں بلکہ اردو ہندی کی بوا ہے تو یہ غلط نہیں ہوگا۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کے پروفیسر افضل مصباحی نے کہا کہ اردو زبان سمجھ لینے سے ہی ہندی اور انگریزی بھی بہتر ہو جائے گی۔ صحافی اسد کمال لاری نے مرحوم شاعر نذیر بنارسی اور اس وقت کے کاشی ودیاپیٹھ کے وائس چانسلر دودوناتھ چترویدی کے مابین ہوئے دلچسپ واقعہ کا ذکر کیا۔ اسد کمال نے کہا کہ نذیر بنارسی اور دودوناتھ چترویدی کی ملاقات کا اثر یہ ہوا کہ مہاتما گاندھی کاشی ودیاپیٹھ میں شعبہ اردو کی شروعات ہوگئی۔ پروفیسر انوراگ کمار نے کہا کہ اردو کا فروغ نہیں ہو رہا ہے تو اس کے لیے ذمہ دار اردو والے ہی ہیں۔ صحافی اجے رائے نے کہا کہ اگر کوئی شخص آندھرا پردیش میں ہندی بول رہا ہے تو اس سے کہا جاتا ہے کہ آپ اردو بول رہے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اردو اور ہندی میں کتنی قربت ہے۔ کاشی ودیاپیٹھ

کے پروفیسر نرنجن سہائے نے کہا کہ شروعاتی دور میں اردو صحافت کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ 19 ویں صدی میں خواتین کے وجود پر سوالیہ نشان لگایا گیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ میں تو ہندی کا پروفیسر ہوں لیکن اردو الفاظ زبان سے نکل آتے ہیں۔ تقریباً 3 گھنٹے چلے سیمینار میں کافی تعداد میں سامعین موجود تھے۔ سیمینار میں ڈاکٹر محمد اختر، ڈاکٹر احتشام الحق، ڈاکٹر نغمہ پروین، ڈاکٹر محمد جاوید، صحافی محمد جاوید، ڈاکٹر ریاض احمد، خورشید اسلم، ڈاکٹر لئیق سمیت کافی لوگ موجود تھے۔ نظامت ڈاکٹر محمد فریاد نے، جب کہ رسم شکریہ ڈاکٹر شمس الدین نے ادا کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 نومبر 2022

نئی صدی میں اردو غزل

میرٹھ: ''خطبے کا موضوع تو نئی صدی میں اردو غزل تھا لیکن ہر عہد کا کوئی نہ کوئی نام ہونا چاہیے۔ چونکہ جب ترقی پسندیت کا احتجاج سرد پڑنے لگا تو ناصر کاظمی نے اپنے احباب و حلقۂ ارباب ذوق کی بنیاد رکھی۔ آج ناصر شناسی کا نیا ادبی ڈسکورس شروع ہو رہا ہے۔ آج کے مسائل ترقی پسندوں سے زیادہ مشکل ہیں۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی اصطلاحیں اب روایتی ہوگئی ہیں۔ یہ الفاظ تھے لکھنؤ سے تشریف لائے پروفیسر عباس رضا نیر کے جو شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ اور اسماعیل نیشنل مہیلا پی جی کالج، میرٹھ کے مشترکہ اہتمام سے منعقد بعنوان 'نئی صدی میں اردو غزل' پر خصوصی مقرر کی حیثیت سے ادا کر رہے تھے۔

صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے انجام دیے۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر شاداب علیم، نظامت ڈاکٹر آصف علی اور شکریے کی رسم ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور ڈاکٹر عفت ذکیہ نے ادا کی۔

پروگرام دو حصوں پر مشتمل رہا۔ پہلے حصے میں پی ایچ۔ڈی کے طالب علم تابش فرید کا وائیوا عمل میں آیا۔ جن کا موضوع تھا 'ناصر کاظمی کی رومانوی شاعری' اور پروگرام کے دوسرے حصے میں 'نئی صدی میں اردو غزل' موضوع پر لکھنؤ سے تشریف لائے پروفیسر عباس رضا نیر نے خصوصی لیکچر پیش کیا۔

اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ آج کا خطبہ غزل میں جدید ترقی پسندی کے عناصر کی نشاندہی پر مبنی تھا۔ پروفیسر عباس رضا نیر نے بڑی خوبصورتی سے موضوع کا احاطہ کیا ہے جو نئی صدی میں اردو غزل کے مختلف موضوع و پہلو ہوسکتے ہیں انھوں نے نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس صدی میں جو غزل اور افسانے تخلیق ہو رہے ہیں ان کو کیا نام دیا جائے۔ مابعد جدیدیت کا تو خاتمہ ہوچکا ہے اب وہ وقت آچکا ہے کہ اس کے خاتمے کا اعلان کر دینا چاہیے۔ آج ادیب بالکل آزاد ہیں، آج بہت سے شعرا و ادیبوں میں اقلیتی اور دلت ڈسکورس نظر آرہا ہے جو اس صدی سے قبل نظر نہیں آتا تھا۔ اس عہد کو جدید ترقی پسندی کا نام دیا جاسکتا ہے۔

اس موقعے پر ڈاکٹر الکا وششٹھ، ڈاکٹر شبستاں آس محمد، فرح ناز، گلناز، نوید خان، مدیحہ اسلم، فیضان ظفر، محمد شمشاد، عمائدین شہر اور کثیر تعداد میں طلبہ و طالبات موجود رہے۔

پریس ریلیز: محمد شمشاد، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، 29 نومبر 2022

اردو صحافت: ایک جائزہ

میرٹھ: فیض عام ڈگری کالج میں اردو صحافت ایک جائزہ موضوع پر پروگرام کا انعقاد کیا گیا، جس میں کالج انتظامیہ نے شہر کے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے اردو صحافیوں کو بلاکر خصوصی لیکچر کرائے۔ اپنے کلیدی خطبے میں معروف صحافی تنظیر انصار نے کہا کہ کسی بھی میدان میں جانے سے پہلے اس کی مکمل جانکاری ہونا بہت ضروری ہے۔ صحافت کا میدان بھی بہت وسیع ہے۔ اردو صحافت کے ذریعے بھی طلبہ اپنا بہترین کیریئر بنا سکتے ہیں، لیکن اس کے لیے کسی اچھے ادارے سے ڈگری ڈپلوما لینا بہت ضروری ہے، جن طلبہ کا موضوع صحافت ہے ان کو چاہیے کہ وہ ابھی سے لکھنا شروع کر دیں، کیونکہ دیکھنے میں آتا ہے بہت سے ادارے ہیں جہاں صرف صحافت کی تعلیم دی جاتی ہے ان کو پریکٹیکل کے لیے میدان میں نہیں بھیجا جاتا۔ اس میدان میں تعلیم کے ساتھ ساتھ رپورٹنگ کا تجربہ بھی بہت ضروری ہوتا ہے، اس سے طالب علم ڈگری یا ڈپلومہ مکمل کرنے کے بعد کوئی میڈیا ہاؤس جوائن کرتا ہے تو اس کو زیادہ پریشانی نہیں ہوتی ہے۔ انھوں نے موجودہ وقت میں صحافیوں پر مختلف دباؤ کا بھی ذکر کیا۔ صحافی وسیم انصاری نے کہا کہ صحافت میں ویڈیوگرافی کا اہم کردار ہوتا ہے۔ شورٹس کیسے لیے جاتے ہیں صحیح تصاویریں لینے کا کیا طریقہ ہوتا ہے یہ صحافت کی کتابیں پڑھ کر آسانی سے جانا جاسکتا ہے۔ اردو صحافت کا کورس کر رہے طلبہ کو مشورہ دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ پڑھائی کے دوران صحافیوں سے رابطہ رکھا کریں۔ کبھی کبھی میدان میں ان کے ساتھ چلے جایا کریں، اس سے آپ کو کافی تجربہ ہوگا۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے کہا کہ صحافت ہماری زندگی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس فن کو صرف نوکری حاصل کرنے کے لیے ہیں نا سیکھیں بلکہ یہ ہر میدان میں آپ کے کام آتا ہے۔ تعلیمی میدان میں کیریئر بنانا ہوا اور آپ اچھی صحافت بھی جانتے ہوں تو آپ بہتر طریقے سے خدمات انجام دے سکتے ہیں اور جہاں نوکری کرتے ہیں اس فن کے ذریعے وہاں کی کسی چھوٹی سی ایکٹیویٹی کو بھی پوری دنیا کو دکھا سکتے ہیں۔ پروگرام کنوینر شعبۂ اردو کی استاد ڈاکٹر فرحت جہاں نے مہمان کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت مولانا عظیم ندوی نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 دسمبر 2022

بہار

امداد امام اثر: یادگاری تقریب

پٹنہ: ہر آدمی کی اپنی انفرادیت ہوتی ہے۔ اپنا اختصاص ہوتا ہے۔ امداد امام اثر کی بھی انفرادی حیثیت تھی۔ انھوں نے اپنے عہد اور معاشرے کے تناظر میں اپنی تخلیقات اپنی کتابیں ترتیب دیں جو ان کے دور میں کافی اہم اور مفید تسلیم کی گئیں۔ مذکورہ خیال کا اظہار اردو ڈائریکٹوریٹ کے زیر اہتمام منعقد 'امداد امام اثر: یادگاری تقریب' سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر اعجاز علی ارشد نے کیا۔ اس موقعے پر مختلف مقالہ نگاروں نے کہا کہ امداد امام اثر ایک نیک طبیعت، منکسر المزاج اور سادگی پسند انسان تھے۔ امداد امام اثر بڑے وسیع الذہن اور وسیع العلم انسان تھے۔ ان کو مختلف علوم و فنون پر دسترس تھا۔ شعر و ادب، ارضیات، زراعت، سیاست، حکمت، اخلاقیات، اور مذہبیات وغیرہ پر انھوں نے درجن بھر سے زائد بڑی وقیع اور قابل مطالعہ

کتابیں لکھیں۔ ان میں کاشف الحقائق ان کی شاہکار تصنیف ہے۔ اردو کے اولین تنقید نگاروں میں امداد امام اثر کی حیثیت مسلم اور منفرد تسلیم کی جاتی ہے۔ وہ حالی کے ہمعصر تھے۔ اردو تنقید میں انھوں نے حالی کے برخلاف اپنی الگ راہ قائم کی۔ امداد امام اثر کے تعلق سے ڈاکٹر صفدر امام قادری نے کہا کہ حالی اور شبلی وغیرہ کی تنقیدی صلاحیت اور امداد امام اثر کی تنقید کا موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ ڈاکٹر ابوبکر رضوی نے کہا کہ وہ پہلی شخصیت ہیں جنھوں نے لطف شاعری کی بات اٹھائی۔ انھوں نے کہا کہ لطف شاعری کے لیے منظوم ہونا ضروری نہیں بلکہ شعری معنویت ضروری ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر سید ابومنور گیلانی نے بھی امداد امام اثر کی شخصیت اور کارناموں پر روشنی ڈالی۔ اس سے قبل اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر احمد محمود نے مہمانوں اور دانشوروں کا خیر مقدم کیا اور امداد امام اثر یادگاری تقریب کی غرض وغایت بیان کی۔ انھوں نے کہا کہ اسلاف کو یاد کرنا اور انھیں خراج عقیدت پیش کرنا ہماری اخلاقی ذمے داری ہے۔ احمد محمود نے امداد امام اثر کی شخصیت کے حوالے سے کہا کہ انھوں نے نہ صرف بہار بلکہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر اپنی شناخت قائم کی۔ انھیں کئی زبانوں پر دسترس حاصل تھی۔ وہ بہ حیثیت انسان بھی کافی پسندیدہ اور ہردلعزیز رہے۔ پروگرام کی نظامت حبیب الرحمٰن انصاری نے کی۔ دوسرے سیشن میں بزم سخن کے تحت اثر فریدی، خالد عبادی، طلعت پروین، اصغر حسین کامل، ارون کمار آریہ، مصطفیٰ مضطر، افتخار عاکف، شبانہ عشرت، یاور راشد نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ بزم سخن کی صدارت معروف شاعر اسد رضوی مظفرپوری نے جب کہ نظامت کے فرائض محمد شکیب ایاز نے انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 نومبر 2022

بہار میں اردو صحافت: سمت ورفتار

پٹنہ: اردو صحافت کا مزاج ابتدا سے ہی باغیانہ واحتجاجی رہا ہے۔ صحافت کے ابتدائی دور میں اخبارات ورسائل کے زیادہ تر مدیران کو جیل جانا پڑا۔ غلام سرور کا صحافتی رنگ بھی باغیانہ اور جذباتی تھا لیکن جو صحافت جذباتی انداز کی ہوتی ہے وہ نابالغ ذہنوں کو متاثر کرتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر اعجاز علی ارشد نے کیا۔ وہ 24 نومبر کو شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی میں منعقد 'بہار میں اردو صحافت: سمت ورفتار' کے موضوع پر منعقدہ تقریب سے خطاب کررہے تھے۔ اس موقعے پر روزنامہ 'قومی تنظیم' کے مدیر اشرف فرید نے کہا کہ اردو صحافت کی ڈگری حاصل کرنے والوں کے لیے آج زیادہ روشن امکانات ہیں۔ ڈاکٹر قاسم خورشید نے کہا کہ صحافت میں تعمیری رویہ اپنانا چاہیے۔ دوسروں پر تنقید سے پہلے خود احتسابی بھی ضروری ہے۔ معروف صحافی ڈاکٹر ریحان غنی نے کہا کہ اردو صحافت انگریزی اور ہندی صحافت سے بالکل الگ ہے۔ اردو کی تہذیبی وثقافتی قدریں دوسری زبانوں کے مماثل نہیں ہیں۔ اردو صحافت رائے عامہ ہموار کرتی ہے۔ معروف صحافی راشد احمد نے کہا کہ صحافت کے معیار میں گراوٹ کے باوجود ہر دور میں اچھے صحافی بھی ہوئے ہیں۔ آج بھی صحافیوں کے لیے مواقع کی کمی نہیں بشرطیکہ ان میں صلاحیت موجود ہو۔ ٹی وی جرنلسٹ محفوظ عالم نے بھی صحافتی پروفیشنلزم پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ہمیں جذباتی ہونے کے بجائے تکنیکی وعملی صلاحیت پیدا کرنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ پروفیسر اسرائیل رضا نے شعبۂ اردو کے جرنلزم کے کورس کو دوبارہ شروع کرنے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے اردو ایڈیٹر کاؤنسل پھر سے قائم کیے جانے کی وکالت بھی کی تاکہ اردو صحافت کے مسائل اس کاؤنسل کے ذریعے حل کیے جائیں۔ صدر شعبہ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے بھی صحافتی نکتہ پر بات کرتے ہوئے کہا کہ اردو صحافیوں کو سنجیدگی کے ساتھ اپنی زبان، تہذیب اور صحافت کی بقا کی فکر کرنی ہوگی اور ایک بار پھر قائدانہ رول ادا کرنا ہوگا۔ گرتے معیار کو سنبھالنا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ اخبارات پر تنقید کرنا آسان ہے مگر اس کٹھن راہ سے گزرنا آسان نہیں ہے۔ اردو کے فروغ کی راہ تیار کرنے کے لیے ہر فرد کو آگے بڑھنا ہوگا۔ اس موقعے پر شعبۂ اردو سے اردو جرنلزم کورس کے فارغین ورکنگ جرنلسٹوں کو توصیفی اسناد اور اعزازات سے بھی نوازا گیا، جنھیں توصیفی سند دی گئی ان میں نواب عتیق الزماں، عارف اقبال، انواراللہ، سراج الدین، زریں فاطمہ، نازیہ نوشاد، یحییٰ فہیم، تسنیم اختر، رضیہ سلطانہ اور مشتاق خان کے نام شامل ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 نومبر 2022

ظفر کمالی کی ادبی خدمات

پٹنہ: ظفر کمالی کی ادبی کاوشیں سنجیدہ ہیں اور ان کو ساہتیہ اکادمی کے ذریعے انعام دیا جانا خود اس انعام کو عزت بخشتا ہے۔ میں نے ظفر کمالی کو تقریباً گیارہ برس کی عمر سے دیکھا ہے اور اس وقت سے اب تک انھیں سنجیدگی سے لکھنے پڑھنے کے کام میں ہی لگے دیکھا ہے۔ مندرجہ بالا

باتیں مسٹر عامر سبحانی، چیف سکریٹری حکومت بہار نے بزم صدف کے ذریعہ منعقدہ یک روزہ قومی سیمینار کے افتتاح کے دوران کہیں۔ یہ سیمینار معروف مزاح نگار اور محقق و ادیب پروفیسر ظفر کمالی کو ساہتیہ اکادمی انعام برائے ادب اطفال ملنے کے اعزاز میں منعقد کیا گیا تھا۔ انھوں نے چالیس پینتالیس برس پہلے اپنے اسکول کے زمانے کو یاد کرتے ہوئے بتایا کہ وہ ان کے ہم درس تھے اور اس دور میں بھی ظفر کمالی کی اردو، فارسی اور مذہبیات کا علم قابل رشک تھا۔ ظفر کمالی نے اپنے اس علم اور ذوق پر اپنی محنت ومشقت سے اضافہ کیا۔ وہ جہاں بھی رہے مطالعہ اور تصنیف وتالیف کی بنیادوں پر خود کو مزید مستحکم کرتے رہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے جب بھی ظفر کمالی کی کوئی کتاب شائع ہوتی، تو وہ میرے مطالعے کے لیے ضرور بھیج دیتے۔ شاعری، ظرافت، تنقید وتحقیق، بچوں کا ادب اور ظریفانہ کاوشیں، ظفر کمالی نے بڑی محنت و مشقت کے بعد ادبی دنیا میں پہچان قائم کی۔ آج وہ ہماری زبان کے مشہور اور قابل ذکر لکھنے والوں میں ہیں۔ میں انھیں ساہتیہ اکادمی برائے ادب اطفال کے ایوارڈ کے لیے خاص طور پر مبارکباد دیتا ہوں اور بزم صدف انٹرنیشنل کو ان کے اعتراف کے لیے شایان شان جشن کرنے کے لیے بالخصوص تہنیت پیش کرتا ہوں۔ ابتدائی اجلاس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے روزنامہ قومی تنظیم کے چیف ایڈیٹر سید محمد اشرف فرید نے ظفر کمالی کی مجموعی ادبی خدمات کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ انھوں نے رفتہ رفتہ کس طرح سے اپنی ادبی شخصیت کی تعمیر وتشکیل کی۔ انھوں نے کہا کہ ظفر کمالی کی شخصیت کثیرالجہات ہے اور وہ شاعری اور نثر کی متعدد اصناف میں ایک ساتھ اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے ان کامیابیوں تک پہنچے ہیں۔ انھوں نے ان کی شخصیت کی سادگی، شرافت اور علمی گہرائی کے اوصاف کا اظہار کیا اور بتایا کہ کس طرح یہ تمام اوصاف مل کر ان کی ایک مجموعی شخصیت کا حصہ بنتے ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 22 نومبر 2022

ایک شام ہارون رشید غافل کے نام

ارریہ: شہر سے متصل گیاری گاؤں میں ادارہ فیض ادب کے زیر اہتمام ایک شام ہارون رشید غافل کے نام سمینار

اور مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ مڈل اسکول گراؤنڈ میں منعقد ہونے والے اس پروگرام میں پہلے سیشن میں سمینار اور دوسرے سیشن میں مشاعرہ کا انعقاد ہوا سمینار کی نظامت الحاج ارشد انور الف اور جسیم الدین نے مشترکہ طور پر کی جبکہ مشاعرہ کی نظامت کے فرائض مولانا ارشد ہمراز علیگ نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ الحاج ارشد انور الف نے خیر مقدمی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہارون رشید غافل کی شخصیت ہمہ جہت تھی وہ بیک وقت شاعر، اناؤنسر اور صحافی تھے انھوں نے کہا کہ ان کی شخصیت اور حیات و کارنامہ کو یاد رکھنے کے لیے اس پروگرام کا انعقاد ہورہا ہے۔ سینئر صحافی پرویز عالم نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہارون رشید غافل نے اپنی شاعری کے ذریعے کلہیا زبان کو ایک الگ پہچان دی۔ آج بھی ان کی شاعری کی دھوم ہے۔ ماسٹر اسعد انور نے کہا کہ ہارون رشید ایک شاعر، ادیب، صحافی، وکیل، سماجی کارکن اور ایک بہترین اسٹیج اناؤنسر تھے، انھوں نے کہا کہ وہ سیکڑوں ایوارڈ سے نوازے گئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ آج بھی لوگ ہر موقع پر ان کی شاعری اور شخصیت پر بات کرتے ہیں۔ مفتی ہمایوں اقبال ندوی نے کہا کہ مرحوم ہارون رشید کی شخصیت عبقری تھی انھوں نے کم وقت میں بڑا کارنامہ انجام دیا۔ مولانا محمد منصور شمسی نے کہا کہ غافل ہمارا بھتیجا تھا اور اس نے اندھیرے میں چراغ روشن کیا تھا، مولانا مصور عالم ندوی نے مرحوم ہارون رشید کی ادبی اور سماجی خدمات کو آگے بڑھانے پر زور دیا۔ دیپک داس نے کہا کہ ہارون رشید غافل گنگا جمنی تہذیب کے علمبردار تھے۔ ماسٹر مصور عالم نے کہا کہ مرحوم ہارون رشید ایک جینوئن فنکار تھے اور اس نے سماج کو روشنی دکھائی، سمینار میں جن حضرات نے ہارون رشید غافل پر مقالے پیش کیے ان میں مولانا مدثر احمد قاسمی، قاری نیاز احمد قاسمی، ماسٹر مشتاق انجم، عبدالغفور طوفانی، شافع الہدی، ایڈوکیٹ شمیم انور، ماسٹر حامد حسین، ماسٹر سرفراز عالم، محتشم اختر، سرفراز عالم، عبد الرحمان فلاحی، خورشید عالم، مکرم آفاقی، فرمان علی فرمان اور نقیب اکبر کے نام قابل ذکر ہیں۔ صدر سمینار الحاج محمد محسن نے ہارون رشید کی ادبی اور سماجی خدمات کو آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل بتایا۔ مرحوم کے بیٹے مامون رشید نے اظہار تشکر پیش کرتے ہوئے کہا کہ ابا مرحوم نہ صرف ہمارے بلکہ تمام نوجوانوں کے لیے ایک آئیڈیل تھے، انھوں نے کہا کہ وہ ہم سب کو ہمیشہ راست بازی اور سچائی پر چلنے کی تلقین کرتے تھے اور ہمیشہ لوگوں کی حوصلہ افزائی کرنا سکھایا، مامون رشید نے اپنے والد کی لکھی ایک غزل بھی پیش کی۔

پریس ریلیز: عبدالغنی، ارریہ، بہار، 7 دسمبر 2022

تمل ناڈو

بین الکلیاتی تقریری مقابلہ

چینئی: (ساجد حسین ندوی) میاسی اردو اکیڈمی وشعبہ اردو عربی، نیو کالج، چینئی کے زیر اہتمام دوسو سالہ جشن

اردو صحافت کی مناسبت سے آل تمل ناڈو بین الکلیاتی تقریری مقابلہ کا انعقاد بتاریخ 2 نومبر 2022 کو عمل میں آیا جس میں صوبہ تمل ناڈو کے 51 سے زائد کالجز کے طلبا وطالبات نے شرکت کی اور صحافت کے مختلف موضوعات پر اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ پیش کیا۔

پروگرام میں نظامت کے فرائض میاسی اردو اکیڈمی کے کنوینر جناب محمد روح اللہ صاحب نے انجام دی۔

میاسی اردو اکیڈمی کے چیئرمین جناب اے محمد اشرف صاحب نے اپنے صدارتی خطاب میں فرمایا کہ: صحافت کے دوسو سال کا جشن پورے ملک میں بڑے آب وتاب کے ساتھ منایا جارہا ہے لہٰذا میاسی اردو اکیڈمی جنوبی ہند کی نمائندگی کرتے ہوئے صحافت کا دوسو سالہ جشن منارہی ہے۔ نیز طلبا میں اردو صحافت کے تئیں بیداری پیدا کرنے کے لیے بین الکلیاتی تقریری مقابلہ کا انعقاد کیا گیا تا کہ طلبا اردو صحافت کی تاریخ سے واقفیت حاصل کرسکیں۔

پروگرام کے مہمان خصوصی جناب اسجد نواز ایڈیٹر روزنامہ سالار نے اپنے خطاب میں کہا کہ ہمیں ان اسلاف کو یاد کرنے کی ضرورت ہے جنھوں نے اپنا خون جگر لگا کر اردو اخبار کو سینچا اور پروان چڑھایا تھا، خواہ وہ سید باقر ہوں یا پھر مولانا ابوالکلام آزاد۔ انھوں نے کہا کہ اردو صحافت کی دوسو سالہ تاریخ کا جشن ضرور منایا جارہا ہے، لیکن حقیقت میں اردو صحافت کی تاریخ اس سے کہیں زیادہ پرانی ہے۔ انھوں نے ٹیپو سلطان شہید کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہا انھوں نے اپنی فوجی ٹریننگ کے لیے نہ صرف اردو اخبار (فوجی اخبار) شائع کروایا بلکہ اس کے لیے پرنٹنگ پریس بھی لگوایا۔

اس تقریری مقابلے میں صوبہ تمل ناڈو کے مختلف کالجز سے تقریباً 20 طلبا نے شرکت کی۔ جبکہ حکم کے فرائض جناب مولانا فیاض عالم، ڈاکٹر محترمہ ذاکرہ ام شہلہ اور ڈاکٹر پروین فاطمہ نے انجام دیا۔ حکم صاحبان نے منصفانہ طور پر نمبرات دیتے ہوئے تین طلبا وطالبات کو اول دوم اور سوم کے لیے منتخب کیا جب کہ دو طلبا جو چہارم وپنجم پوزیشن پر آئے تھے ان کو تشجیعی انعامات کے لیے منتخب کیا گیا۔ شعبہ اردو نیو کالج کے طالب علم عبداللہ مشتاق نے اول پوزیشن حاصل کی اور عبدالمجید نے دوم پوزیشن، جبکہ سوم پوزیشن اسلامیہ کالج برائے اناث، وانمباڑی کی طالبہ عزیزہ مدیحہ فردوس نے حاصل کی۔

نیز ساجد باشا اسلامیہ کالج برائے ذکور، وانمباڑی نے چوتھی پوزیشن اور طالبہ طوبیٰ ایاز اسلامیہ کالج برائے اناث وانمباڑی نے پانچویں پوزیشن حاصل کی۔ اس مقابلہ جاتی پروگرام میں حصہ لینے والے تمام طلبا وطالبات کو سرٹیفکٹ مع کیسہ زر سے نوازا گیا۔ پروگرام میں میاسی کے جملہ ممبران، نیو کالج کے پرنسپل، وائس پرنسل، ڈپٹی وارڈن کے علاوہ شہر مدراس واطراف واکناف سے ڈاکٹر امتیاز باشا، اکبر زاہد، اسانغنی مشتاق، کے عبدالباری ایڈیٹر نشان منزل وغیرہ نے شرکت کی۔ پریس ریلیز: ساجد حسین ندوی، 5 نومبر 2022

کشمیر

اردو میں افسانوی ادب کی روایت

کرگل: شعبۂ اردو کرگل کیمپس یونیورسٹی آف لداخ کی جانب سے کنیز فاطمہ (ریکٹر کرگل کیمپس) کی سرپرستی میں 'اردو میں افسانوی ادب کی روایت' پر ایک آن لائن توسیعی خطبے کا اہتمام کیا گیا، جس میں پروفیسر ابن کنول نے ایک بلیغ وبسیط خطبہ پیش کیا۔ اس پروقار تقریب کے آغاز میں شعبۂ اردو کے استاذ ڈاکٹر عیسیٰ محمد نے مہمان خصوصی پروفیسر ابن کنول کے ہمراہ اس تقریب کے تمام شرکا کا استقبال کرتے ہوئے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ اس کے بعد پروفیسر ابن کنول نے 'اردو میں افسانوی ادب کی روایت' کے موضوع پر نہایت معلوماتی خطبہ پیش کیا۔ پروفیسر موصوف نے اپنے خطبے میں اردو فکشن کا تاریخی پس منظر پیش کرتے ہوئے اردو فکشن کی مختلف اصناف کے حوالے سے تفصیلی بحث کی۔ انھوں نے داستان کے فن اور داستان کے ارتقائی مراحل سے بحث کرتے ہوئے ناول اور افسانے کے فن اور روایت پر مفصل گفتگو کی، اپنے خطبے میں انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ افسانوی ادب کی تمام اصناف چاہے وہ داستان ہو ناول یا افسانہ اگر ان میں قصہ پن نہ ہو تو ان کی معنویت، اہمیت اور مقبولیت ختم ہوجاتی ہے، افسانوی ادب کی تمام اصناف تب کامیاب ہوسکتی ہیں جب ان میں قصہ بیان کیا جائے اور اگر داستان، ناول یا افسانہ میں قصہ یا کہانی نہیں ہے تو کوئی بھی آپ کی بات کو سننے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔ اس تقریب میں سوال جواب کا وقفہ بھی کافی دلچسپ رہا۔ ڈاکٹر ولایت علی نے مہمان خصوصی پروفیسر ابن کنول کا مختصر تعارف پیش کیا۔ ڈاکٹر محمد رفیع نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور شعبہ اردو کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر جعفر علی خان نے شکریہ کے کلمات ادا کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 نومبر 2022

راجستھان

غالب کی زندگی اور شاعری

اجمیر: راجستھان کے اجمیر میں مشہور اردو شاعر مرزا غالب کی زندگی اور شاعری پر مشتمل 'گفتگو' کا پروگرام

منعقد کیا گیا۔ اجمیر کے ویشالی نگر میں واقع اجمیر و پریس کلب میوزیم میں 28 کی شام منعقدہ گفتگو پروگرام میں صحافی، مصنف اور پینٹر ونود بھاردواج نے مرزا غالب کی زندگی پر لکھی اپنی کتاب 'گلی قاسم جان' پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مرزا غالب کی زندگی سے جڑے کئی دلچسپ قصے اور ان چھوئے پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ مرزا غالب جیسے مشہور شاعر کی زندگی پر علی گڑھ اور رام پور جیسی لائبریری میں بھی پورا ادب موجود نہیں ہے۔ دہلی کے چاندنی چوک میں واقع ان کی حویلی کی زندگی کا سفر بنارس، الہ آباد، دہلی، لکھنؤ سے جڑا ہے اور غالب کی پسندیدہ جگہ کاشی رہی ہے۔ پروگرام میں موجود پدم شری ڈاکٹر سی پی دیول نے اپنے خطاب میں کہا کہ مرزا غالب پہلے سے زیادہ آج معاشرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ انتقال کے بعد ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوا اور نوجوانوں میں ان کے تئیں دلچسپی میں اضافہ ہوا ہے۔ پروگرام میں کئی جانے مانے ادیب رام جیسوال، گوپال گرگ، بخشی سنگھ، راس بہاری گوڑ بھی موجود تھے۔ کلب کے صدر ڈاکٹر رمیش اگروال نے سبھی کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 29 نومبر 2022

مدھیہ پردیش

ہندوستانی ادب میں کالیداس کا مرتبہ

اجین: ہندوستان کے قدیم ترین شہر اجین میں حکومت مدھیہ پردیش کے زیر اہتمام ہر سال کالی داس سماروہ کے نام سے دس روزہ تقریبات منعقد کی جاتی ہیں۔ یہ سلسلہ گزشتہ ساٹھ برسوں سے جاری ہے۔ یہ تاریخی پروگرام ہر سال ماہ نومبر میں ہوتا ہے جس میں ہندوستان بھر کے سنسکرت وودوان شرکت کرتے اور اپنے مقالے پیش کرتے ہیں۔ امسال کالیداس سماروہ میں اردو کے معروف وممتاز شاعر وادیب پروفیسر صادق کو بھی مدعو کیا گیا۔ انھوں نے سنسکرت وودوانوں کے درمیان اظہار خیال کرتے ہوئے کالیداس اور اس کے عہد پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے بتایا کہ کالیداس کے نام سے چالیس کتابیں ملتی ہیں جن کی گہری چھان بین کرنے کے بعد محققین نے صرف سات کتابوں کو کالیداس کی اصل تصانیف قرار دیا ہے۔ ان میں تین ڈرامے دومہا کاویہ اور دو پریم کاویہ ہیں۔ کمار سمبھو میں شو اور پاروتی کی محبت کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ رگھوونش میں رگھو، دشرتھ، رام اور کش کی کتھائیں ہیں۔ ڈراموں میں 'ابھگیان شاکنتلم' اور شاعری میں 'میگھ دوتم' ان کی لاثانی تخلیقات ہیں جن کے ترجمے دنیا بھر کی زبانوں میں ہوتے رہے ہیں۔ کالیداس سماروہ میں سنسکرت وودوانوں کے ساتھ پروفیسر صادق کا بھی پرزور سمان کیا گیا۔ اس موقعے پر پروفیسر صادق کی شریک حیات پروفیسر شاہینہ تبسم بھی ان کے ساتھ تھیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 نومبر 2022

اعزاز و اکرام

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ برائے اطفال

ادب 2022 کی ایوارڈ تقسیم تقریب

نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام ساہتیہ اکادمی ایوارڈ برائے اطفال ادب 2022 کی ایوارڈ تقسیم تقریب 14 نومبر کی شام تریوینی کلا سنگم تان سین مارگ نئی دہلی میں منعقد ہوئی۔ تقریب کے مہمانِ خصوصی ہندی کے نامور ادیب و بچوں کے مصنف پرکاش تھے۔ انھوں نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ادب اور فن میں منافع کی فکر کرنا بے معنی ہے، اگر دنیا نفع کے لیے بنائی جائے تو بہت بے رنگ ہوگی۔ اگر بچوں کے ادب کی حساسیت سے ہمارا بچپن تیار ہوگا تو بعد میں ہمیں مہربان ڈاکٹر، ایماندار انجینئر اور ملک کے لیے سچے اور خوددار شہری ملیں گے۔ انھوں نے بچوں کے ادب کے وقار اور شناخت کو بڑھانے کے لیے ساہتیہ اکادمی کی قابل ذکر کوششوں کو بھی سراہا۔ قبل ازیں اپنے صدارتی بیان میں ساہتیہ اکادمی کے صدر چندر شیکھر کمبار نے کہا کہ بچے توانائی، جوش اور تجسس سے بھرپور ہوتے ہیں، یہ ہمارے اردگرد کے ایسے پودا ہیں جو بعد میں ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، اس لیے ان کے بچپن کی مناسب دیکھ بھال بہت ضروری ہے، بچوں کا ادب لکھنا بہت مشکل ہے، اس لیے اس کی حمایت

ضروری ہے۔ اختتامی کلمات میں ساہتیہ اکادمی کے نائب صدر مادھوکوشک نے کہا کہ جس طرح ہمارا ملک تنوع میں اتحاد کی ایک مثال ہے، اسی طرح ہمارا بچوں کا ادب بھی ہندوستانی اتحاد کی ایک خوبصورت مثال ہے اور یہ مکمل طور پر ہندوستانی ہے۔ تقریب کے آغاز میں خطبہ استقبالیہ دیتے ہوئے ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری کے سرینواس راؤ نے بچوں کے ادب کی افادیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ساہتیہ اکادمی 24 ہندوستانی زبانوں میں بچوں کے ادب کے کئی اہم منصوبوں پر کام کررہی ہے۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ برائے اطفال ادب 2022 کی ایوارڈ تقسیم تقریب میں ظفر کمالی (اردو)، دگنت اوزا (آسامیہ)، جیا مترا (باڈلا)، دیوررام سیاری (بوڈو)، راجیشور سنگھ راجو (ڈوگری)، عرشیہ ستار (انگریزی)، وراث گوسوامی (گجراتی)، شاشرما (ہندی)، حمید اللہ وانی (کشمیر) سمیت کئی لوگوں کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ انعام یافتگان کو بطور انعام ایک تانبے کی شیلڈ اور پچاس ہزار روپے نقد دیے گئے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 نومبر 2022

سیفی سرونجی

دوحہ قطر: اِس سال عالمی فروغِ اردو ادب ایوارڈ، دوحہ قطر 2022 کی چھبیسویں تقریب آن لائن منعقد ہوئی جس میں معروف شاعر، ادیب، نقاد، محقق وصحافی ڈاکٹر

سیفی سرونجی کو ایوارڈ دیا گیا جو ڈیڑھ لاکھ روپے نقد، ایوارڈ ٹرافی اور سپاس نامہ پر مشتمل ہے۔ اعزاز یافتگان کی تخلیقات اور تصاویر سے بھرپور ایک خوبصورت مجلّہ بھی شائع کیا گیا ہے۔ مجلسِ فروغِ اردو ادب، دوحہ قطر کا یہ پروقار ایوارڈ ہر سال ہندوستانی اور پاکستانی ادیب کو مجموعی خدمات پر دیا جاتا ہے۔ اِس سال ہندوستان سے سیفی سرونجی اور پاکستان سے ظفر اقبال کو اس اعزاز سے نوازا گیا۔ تقریب کی صدارت مجلس کے چیئرمین محمد عتیق صاحب نے فرمائی اور نظامت کے فرائض عنبرین حسیب عنبر نے انجام دیے۔ اپنی صدارتی تقریر میں عتیق صاحب نے سیفی سرونجی اور ظفر اقبال کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ یہ ایوارڈ اردو کا نوبل انعام قرار دیا جانے لگا ہے۔ ہندوستان کے ایوارڈ یافتہ جناب سیفی سرونجی کا انتخاب آنجہانی پروفیسر گوپی چند نارنگ کی سربراہی میں اِس سال فروری میں کیا گیا تھا۔

پروفیسر شافع قدوائی (چیئرمین انڈین جیوری) اور ڈاکٹر خورشید رضوی (چیئرمین پاکستانی جیوری) نے ایوارڈ یافتگان کا تعارف کروایا۔ پروفیسر شافع قدوائی نے اراکین مجلس کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ سیفی سرونجی صاحب نصف صدی سے مدھیہ پردیش کے چھوٹے سے، دور اُفتادہ قصبے سرونج میں بیٹھ کر اردو کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں۔ 40 برسوں سے سہ ماہی 'انتساب' شائع کررہے ہیں جس کی ہندو پاک میں ایک خاص پہچان ہے۔ 'انتساب' کے خصوصی شمارے ادبی دنیا میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ سیفی سرونجی ایک کثیر التصانیف ادیب ہیں۔ انھوں نے غزلیں لکھیں، افسانے لکھے، نعتوں کا مجموعہ شائع کیا، سفرنامے اور آپ بیتی لکھی۔ ان کی مختلف موضوعات پر 50 سے زائد کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ سیفی سرونجی کی قادر الکلامی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے سرونج سے مکہ مدینہ تک کا منظوم سفرنامہ لکھا۔ اپنی گفتگو میں شافع قدوائی نے 'سرونج سے لندن تک'، 'آپ بیتی' یہ تو سچا قصہ ہے'، 'ایک بحر سو غزلیں' اور 'اردو نظم کا ارتقائی سفر' کو منفرد کارنامہ قرار دیتے ہوئے تفصیل سے روشنی ڈالی۔

سیفی سرونجی نے اراکین مجلس محمد عتیق، عبید طاہر قاضی (سکریٹری)، قمرالزماں (صدر مجلس) کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ کو شدت سے یاد کیا۔ اپنی حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے سیفی سرونجی نے کہا کہ کس طرح وہ ایک بیڑی مزدور سے اِس مقام تک پہنچے۔

پریس ریلیز: استوتی اگروال، سرونج، 25 نومبر 2022

خالد جاوید

نئی دہلی: عہد حاضر کے ممتاز فکشن نگار پروفیسر خالد جاوید کے اردو ناول 'نعمت خانہ' کے انگریزی ترجمے 'دی پیراڈائز آف فوڈ' کو باوقار 'جے سی بی ایوارڈ برائے

ادب دو ہزار بائیس' ملا ہے۔ پروفیسر خالد جاوید کو انعام کی رقم کے طور پر پچیس لاکھ روپے ملے ہیں۔ مذکورہ ناول کا انگریزی ترجمہ پروفیسر باراں فاروقی نے کیا ہے، انھیں بھی بطور انعام الگ سے دس لاکھ روپے ملے ہیں۔ انعام کے فاتح کا اعلان لارڈ بیم فورڈ چیئرمین، جے سی بی نے آن لائن موڈ میں کیا اور جناب سنیل کھرانا، پنیر سلوان، جیوری کے صدر نے سال دو ہزار بائیس کے لیے اوبیرائے ہوٹل، نئی دہلی میں منعقدہ ایک باوقار تقریب میں انعام کی ٹرافی پروفیسر خالد جاوید کو تفویض کی۔ پروفیسر جاوید نے کہا کہ یہ ان کے لیے خوشی و مسرت کا موقع ہے۔ ہم روزمرہ کی زندگی میں چھوٹی چھوٹی مسرتوں کے جویا رہتے ہیں اور سچی خوشی کا کوئی کوئی موقع ہمیں نصیب ہوتا ہے۔ آج کا دن انھیں سچی خوشی کے لمحات میں سے ہے اور اعزاز سے مجھے سچی خوشی ملی ہے۔ پروفیسر نجمہ اختر، شیخ الجامعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اسے یونیورسٹی کے لیے ایک قابل فخر لمحہ قرار دیا۔ انھوں نے پروفیسر خالد جاوید کو مبارکباد دی اور مستقبل کی کاوشوں کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ خالد جاوید کا یہ ناول باورچی خانے کے فریم ورک میں ایک متوسط مسلم گھرانے کی کہانی ہے، بھوک، تشدد، محبت، جرم اور اعتراف کے اردگرد گردش کرتی ہے۔ پروفیسر خالد جاوید کے تین ناول موت کی کتاب، نعمت خانہ اور ایک خنجر پانی میں کافی مقبول ہوئے ہیں۔ ان کے ناول موت کی کتاب کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر عبدالنصیب خاں نے کیا تھا۔ پروفیسر خالد جاوید کو ملک کے دیگر ممتاز ادبی اداروں اور اکادمیوں سے بھی متعدد اعزازات و اکرامات مل چکے ہیں۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 23 نومبر 2022

پروفیسر اسلم جمشید پوری

میرٹھ: ہر سال کی طرح امسال بھی میرٹھ گرلز انٹر کالج نے اپنا سالانہ جلسہ نہایت تزک و احتشام کے ساتھ منایا،

جس میں بچوں نے بہت خوبصورت ثقافتی پروگرام پیش کیے۔ اس مبارک موقع پر کالج کے فاؤنڈر سماجی کارکن حامد علی خان مرحوم کی یاد میں پہلا 'حامد علی ایوارڈ' 23-2022 برائے تعلیمی خدمات معروف فکشن نگار، اعلیٰ پایے کے ناقد، بین الاقوامی نوجوان اردو اسکالرز انجمن (آیوسا) کے مشیر اعلیٰ، صدر شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ پروفیسر اسلم جمشید پوری کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری ماہر تعلیم کے طور پر بھی اپنی

ایک الگ شناخت رکھتے ہیں آپ کی تعلیمی خدمات کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ ایوارڈ میرٹھ گرلز انٹر کالج، میرٹھ کی پرنسپل محترمہ فرزانہ سبزواری کالج کے منیجر محترم دانش خاں، ڈائریکٹر ارشاد جہاں (بیگم مرحوم حامد علی خاں) اور دیگر اراکین کالج کے دست مبارک سے پروفیسر اسلم جمشید پوری کو پیش کیا گیا۔

اس موقعے پر مسند صدارت پر رونق افروز رہیں محترمہ ارشاد جہاں (بیگم مرحوم حامد علی خاں) اور مہمان خصوصی کے بطور ڈاکٹر ڈولی اکستن، پرنسپل آل سینٹ چرچ اسکول، میرٹھ، جبکہ مہمانوں کا استقبال اور پروفیسر اسلم جمشید پوری کا تعارف مائنورٹی ایجوکیشن ایسوی ایشن کے صدر محترم آفاق احمد خان نے کیا۔ پروگرام میں نظامت کے فرائض مشترکہ طور پر اقرا اور ثمینہ نے انجام دیے۔ ایوارڈ کی وصولیابی کے بعد کالج کے اراکین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ آج سے کچھ سال قبل مرحوم حامد علی خاں نے جو ننھا سا پودا لگایا تھا وہ آج تناور درخت میں تبدیل ہو گیا ہے۔ مستقبل میں یہ کالج ڈگری کالج ہونا چاہیے۔ یہی مرحوم حامد علی خاں کا خواب تھا جس کو پورا کرنا ہم سب کی ذمے داری ہے۔

پریس ریلیز: محمد شمشاد، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ، 24 نومبر 2022

ہمالیائی اردو ادب ایوارڈ برائے صحافت

نئی دھلی: انجمن ارتقائے اردو ادب نیپال نے اس سال نیپال کے سب سے بڑے ایوارڈ ہمالیائی اردو ادب

ایوارڈ برائے صحافت کے لیے جن عظیم صحافیوں کو منتخب کیا ان میں سابق بیوروکریٹ عظیم اختر، روزنامہ انقلاب نارتھ کے ایڈیٹر ایم ودود ساجد اور جدید خبر کے مدیر معصوم مرادآبادی شامل تھے۔ غالب اکیڈمی میں ان سینئر صحافیوں کو ڈاکٹر سید محمد فاروق کے ہاتھوں ایوارڈز کے لیے تقریب منعقد کی گئی تھی جس کے روح رواں معروف صحافی وشاعر اور انجمن ارتقائے اردو ادب نیپال کے صدر زاہد آزاد جھنڈانگری تھے۔ ایوارڈ میں مومنٹو، توصیفی اسناد اور شال شامل تھیں۔ زاہد آزاد جھنڈانگری نے بتایا کہ گزشتہ 12 برسوں کے دوران انجمن کی طرف سے کئی درجن صحافیوں، ادبا، اور شعراء کرام کو اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔ مسٹر جھنڈانگری کہتے ہیں کہ صحافت ایک ذمے داری کا پیشہ ہے اور اگر ایماندارنہ صحافت ہو تو اس سے ملک وسماج کی تعمیر نو کی جا سکتی ہے برعکس اس کے بگاڑ پیدا ہوگا۔ تقریب کے دوران سینئر صحافی سہیل انجم نے کہا کہ زاہد آزاد جھنڈانگری نیپال میں یوم اردو منانے کا فریضہ ادا کرتے رہے ہیں اور اردو کی ترویج وارتقا کے لیے جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ انجمن ارتقائے اردو ادب نیپال، نیپال کی سب سے قدیم انجمن ہے جو 1987 سے ادبی، صحافتی، علمی اور اصلاحی کاز میں لگی ہوئی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ زاہد آزاد جھنڈانگری اردو کے ڈیولپمنٹ کی ذمے داری نیپال میں بخوبی نبھا رہے ہیں۔

روزنامہ'ہمارا سماج' دہلی، 10 نومبر 2022

ایم اطہرالدین

نئی دھلی: این ڈی ٹی وی کے سینئر صحافی اور سماجی کارکن ایم اطہرالدین منے بھارتی کو صحافت کے علاوہ سماجی شعبے میں ان کے کام کے اعتراف میں سپریم کورٹ کے انڈین لا انسٹی ٹیوٹ میں انڈین کونسل آف جیورسٹ نے نیشنل لا ڈے ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ سابق چیف جسٹس آف انڈیا ڈاکٹر جسٹس کے جی بالاکرشنن، ہریانہ کے ایڈووکیٹ جنرل بلدیو راج مہاجن، جسٹس اندرا بنرجی، آر ایس ایس لیڈر ڈاکٹر اندریش کمار، جسٹس ایڈیشنل سکریٹری راجندر کمار کشیپ، انڈین کونسل آف جیورسٹ کے صدر اور سپریم کورٹ کے سینئر وکلا نے اس موقعے پر شرکت کی۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے شعبے میں منے بھارتی کو لائف ٹائم ایوارڈ دیا گیا جو تقریباً 25 سال سے الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا میں کام کر رہے ہیں۔ فی الحال NDTV میں سینئر صحافی کے طور پر کام کر رہے ہیں۔

روزنامہ'میراوطن' دہلی، 30 نومبر 2022

محمد یوسف رحیم بیدری

بیدر: کرناٹکا راجیہ اردو ٹیچرس ایسوی ایشن (کراٹا) ضلع بیدر نے محمد یوسف رحیم بیدری کو ان کی بہترین صحافتی

خدمات پر ایوارڈ سے نوازا۔ یہ ایوارڈ 'یوم اردو' کے موقعے پر رنگ مندر بیدر کی ایک عظیم الشان تقریب میں دیا جانے والا تھا، لیکن محمد یوسف رحیم بیدری کی غیر حاضری کے سبب ان کے دفتر موقوعہ تعلیم صدیق شاہ، بیدر پہنچ کر شیخ مسیح الدین اعزازی صدر کرناٹکا راجیہ اردو ٹیچرس ایسوی ایشن بیدر، شیخ انصار بیگ صدر اور محمد شہاب الدین سکریٹری نے ایوارڈ دیا۔ اس موقعے پر گل پوشی اور شال پوشی کرتے ہوئے مومنٹو کی شکل میں ایوارڈ دیا گیا۔ محمد یوسف رحیم بیدری نے کراٹا تنظیم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کراٹا کے عہدیداران نے اپیل کی کہ وہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد (مانو) کے بیدر سٹیلائٹ کیمپس کے باضابطہ آغاز کے لیے سرکاری سطح پر رکن پارلیمنٹ بیدر سے بات چیت کریں، کیونکہ اس سٹیلائٹ کیمپس کے آغاز سے کے جی سے پی جی تک مفت تعلیم اقلیتی طلبہ کو اردو زبان میں مل سکتی ہے۔ رکن اسمبلی بیدر کو بھی اس اراضی پر نظر رکھنی چاہیے اور وہاں مانو کا سٹیلائٹ کیمپس فوری تعمیر ہو۔ محمد یوسف رحیم بیدری نے بتایا کہ کراٹا جو بھی پروگرام کرے وہ اس کی تشہیر کی طرف بھی توجہ دے۔ ان کے علاوہ دو مزید تجاویز پیش کیں۔

روزنامہ'ہمارا سماج' دہلی، 2 دسمبر 2022

عبدالقادر فیصل

بیدر: عوام ٹی وی نظام آباد کی جانب سے نظام پیلس فنکشن ہال نظام آباد میں 12 نومبر منعقدہ تقریب میں الحاج محمد عبدالقادر فیصل صدر اردو جرنلسٹ فورم متحدہ ضلع میدک اور اسٹیٹ سکریٹری ٹی یو ڈبلیو جے کو ان کی تین دہائیوں سے زائد عرصہ پر محیط صحافتی خدمات کا اعتراف اور صحافیوں کے مسائل کے حل کے لیے جدوجہد کرنے پر 'فخر تلنگانہ' ایوارڈ پیش کیا گیا۔ اور لیس خان ڈپٹی میئر نظام آباد، ایس اے علیم سابق چیئرمین ریڈکو، شکیل احمد کارپوریٹر اور صدر ایم آئی ایم شہر نظام آباد، بوبلی نرسیا صدر ٹی یو ڈبلیو جے اور نعیم قمری ای او عوام ٹی وی نظام آباد نے قادر فیصل کو ایوارڈ پیش کیا۔

روزنامہ'ہمارا سماج' دہلی، 14 نومبر 2022

ڈاکٹر سہیل فاطمہ شیخ

نئی دھلی: ہمدرد کے اسکول آف یونانی ایجوکیشن اینڈ ریسرچ کی ہیڈ آف پریزینٹیشن ڈپارٹمنٹ پروفیسر ڈاکٹر سہیل فاطمہ کو شیخ جوید انٹرنیشنل ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ محترمہ فاطمہ کو یہ ایوارڈ دی لوٹس ہولیسٹک ہیلتھ انسٹی ٹیوٹ، ابوظہبی میں پیش کیا گیا۔ اطلاع کے مطابق ڈاکٹر

سہیل فاطمہ کو یہ ایوارڈ اکیڈمک ان یونانی میڈیسن میں دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سہیل کے کئی مقالے بین الاقوامی سطح پر بھی شائع ہوچکے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انھیں قومی سطح پر کئی اعزازات سے بھی نوازا گیا ہے۔ شیخ جوید انٹرنیشنل ایوارڈ حاصل کرنے کے بعد پروفیسر سہیل فاطمہ نے ایوارڈ کمیٹی کے ارکان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ یہ یونانی طب کے شعبے میں اہم ہے کیونکہ اس سے یونانی کو بین الاقوامی سطح پر پہچان ملے گی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 11 نومبر 2022

رسم اجرا

عالمی اردوادب

نئی دھلی: جامعہ نگر بٹلہ ہاؤس واقع ڈائنامک انگلش انسٹی ٹیوٹ میں مظہر فاؤنڈیشن انڈیا اور اکادمی اردو زبان و ادب، دہلی کے زیراہتمام رسالہ عالمی اردو ادب کے اڑتالیسویں شمارے کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر عتیق اللہ نے کی جب کہ ڈاکٹر خالد مبشر نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ پروفیسر عتیق اللہ نے اپنے صدارتی کلمات میں رسائل کی تاریخ پر روشنی ڈالی اور عالمی اردوادب کی اہمیت واضح کی۔ پروفیسر عتیق اللہ صاحب نے بتایا کہ نئی نسل کو رسائل کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ نئی نسل حس تحیر سے محروم ہوگئی ہے۔ ادب کا شوق قدرت کا گراں قدر عطیہ ہے۔ یہ بہت بڑی سعادت ہے۔ انھوں نے نند کشور وکرم کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ رسالہ نکالنا ایک طرح سے دیوالیہ ہونا ہے۔ کوئی قلندر ہی یہ کام کرسکتا ہے، وہ قلندرانہ صفت نند کشور وکرم میں تھی۔ فاروق ارگلی نے نند کشور وکرم سے اپنی دوستی اور گہرے مراسم کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ان میں ایک طرح کا دیوانہ پن تھا جو انھیں کام کرنے کے لیے تحریک دیتا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ جب عالمی اردوادب کا پہلا شمارہ وکرم صاحب نے نکالا تھا تو اس کی کتابت انہی نے کرائی تھی۔ رسالے کے سرپرست پروفیسر کوثر مظہری نے آج کے دور میں رسائل کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے بتایا کہ بیشک آج سوشل نیٹ ورکنگ کا زمانہ ہے اور لوگ اسی میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں، لیکن اس کے باوجود اخبارات و رسائل مسلسل شائع ہورہے ہیں اور لوگ پڑھ بھی رہے ہیں ایسا نہیں ہے کہ اخبارات ختم ہوگئے ہوں۔ پروفیسر شہزاد انجم نے بتایا کہ مرحوم نند کشور وکرم اپنے آپ میں ایک انجمن تھے، انھوں نے اردو کی بے لوث خدمت کی۔ صاحب طرز نثر نگار اور ناقد حقانی القاسمی نے اپنے اظہار خیال میں نند کشور وکرم اور پروفیسر ستیہ پال آنند سے متعلق گفتگو کی۔ ڈاکٹر جاوید حسن نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور رسالے کے سرپرست پروفیسر کوثر مظہری کو مبارکباد پیش کی۔ پروگرام میں عادل حیات، نوشاد منظر، امتیاز احمد علیمی، مصطفیٰ علی، ڈائنامک انگلش انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر انوارالحق، عاقل زیاد اور شاہنواز ہاشمی کے علاوہ بڑی تعداد

میں ریسرچ اسکالرز اور طلبہ نے شرکت کی۔ آخر میں رسالے کے مدیر یوسف رضا نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'اخبارِ مشرق' دہلی، 22 نومبر 2022

حیاتِ مستعار

دیوبند: جامعہ مظاہر علوم سہارنپور کے امین عام مولانا سید محمد شاہد الحسنی کی خودنوشت سوانح 'حیاتِ مستعار' جو 1951 سے 1980 تک کے حالات پر مشتمل ہے، اس کی دو جلدوں کی افتتاحی تقریب آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری مولانا مفتی خالد سیف اللہ رحمانی نے کی صدارت میں مدرسہ الشیخ محمد زکریا سہارنپور کے کانفرنس ہال میں منعقد ہوئی، جس کی نظامت جامعہ مظاہر علوم کے استاذ مولانا مفتی محمد جاوید نے کی۔ 'حیاتِ مستعار، کے تعلق سے منظوم تعارف مولانا فضل حق عارف خیرآبادی کی طرف سے مدرسۃ الشیخ کے استاذ قاری محمد انعام نے پیش کیا۔ اس موقعے پر مولانا ضیاء الحق خیرآبادی نے حیات مستعار کی دونوں جلدوں کا مبسوط تعارف پیش کیا اور کہا کہ جب میں نے حیات مستعار کا بالاستیعاب مطالعہ شروع کیا تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ جیسے یہ حضرت شیخ مولانا محمد زکریا کی آپ بیتی کا تتمہ اور تکملہ ہے، وہی انداز، وہی اسلوب، وہی روحانیت۔ خطبۂ صدارت میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے کہا کہ یہ بہت بڑا کام ہوا ہے، اس میں کثرت سے حضرت شیخ کے معمولات اور ان کی مصروفیات اور بہت سی جگہوں پر انھیں کے الفاظ و تعبیرات نے اس کتاب کو تقدس عطا کردیا ہے۔ دارالعلوم وقف دیوبند کے مہتمم مولانا محمد سفیان قاسمی نے کہا کہ مولانا محمد شاہد الحسنی کی یہ خودنوشت سوانح صرف ایک آپ بیتی ہی نہیں بلکہ پورے ایک عہد کی تاریخ ہے، پروفیسر اختر الواسع نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مولانا محمد شاہد الحسنی اس دور میں عارف ہی نہیں بلکہ ایک دائرۃ المعارف ہیں۔ ممتاز عالم دین مولانا ندیم الواجدی نے اپنے تاثراتی بیان میں کہا کہ مولانا محمد شاہد الحسنی کو مظاہر علوم سے بھی عشق ہے اور اپنے بزرگوں سے بھی عقیدت و محبت ہے جس کی شاہکار مولانا کی کتابیں ہیں، ہر ادارہ میں مولانا شاہد جیسا عالم ہونا ضروری ہے جب ہی ادارہ کی خدمات کا تعارف سامنے آسکتا ہے، ان کے علاوہ دارالعلوم دیوبند کے استاذ حدیث مولانا عبداللہ معروفی، مولانا ازہر مدنی، جامعہ مظاہر علوم کے رکن شوریٰ مولانا مفتی معصوم ثاقب وغیرہ نے بھی تاثراتی خطاب کیا اور مولانا الحسنی کی تصانیفی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ آخر میں داعی اجلاس مولانا سید محمد شاہد الحسنی نے تمام مہمانوں و جملہ سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ شیخ الحدیث و ناظم مولانا سید محمد عاقل سہارنپوری کی دعا پر اس اجلاس کا اختتام ہوا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 17 نومبر 2022

خانوادۂ حیات اللہ انصاری اور فرنگی محل تاریخ کے آئینہ میں

لکھنؤ: فرنگی محل کسی خاندان کا نام نہیں بلکہ پراپرٹی کا نام ہے جو مغل شہنشاہ اورنگ زیب نے شہید قطب الدین سہالوی کے دو فرزندان ملا سعید اور ملا اسد کو اپنے ایک فرمان کے ذریعے دی تھی۔ خاندان کا نام انصار مدینہ ہے۔ ان خیالات کا اظہار 'خانوادۂ حیات اللہ انصاری اور فرنگی محل تاریخ کے آئینہ میں' نامی کتاب کے اجرا کے لیے منعقد تقریب سے خطاب کرتے ہوئے مصنفہ بیگم شہناز سدرت نے کیا۔ تقریب کا انعقاد زنانہ پارک، امین آباد میں کیا گیا تھا۔ صدارت سینئر صحافی قطب اللہ نے کی اور بطور مہمان خصوصی اسسٹنٹ پروفیسر خواجہ معین الدین چشتی یونیورسٹی ڈاکٹر ثوبان سعید و بطور مہمان اعزازی سدرت اللہ انصاری و

مجاہدالحسن نے شرکت کی۔ نظامت مشترکہ طور پر ڈاکٹر اعظم انصاری اسسٹنٹ پروفیسر خواجہ معین الدین چشتی یونیورسٹی اور ڈاکٹر منصور حسن نے کی۔ کتاب کا اجرا صدر جلسہ، مہمان خصوصی و مہمانان اعزازی کے بدست ہوا۔ تقریب میں مقررین نے خانوادۂ فرنگی محل کی خدمات اور اس کی تاریخ پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ کتاب کے مشتملات سے روشناس کراتے ہوئے مصنفہ بیگم شہناز سدرت نے بتایا کہ فرنگی محل کی اصل تاریخ سے لوگوں کو بہت کم واقفیت ہے۔ انھوں نے کہا کہ کچھ لوگ فرضی طور پر اپنے کو فرنگی محلی لکھنے لگے ہیں۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ حکومت ایسے لوگوں کو فرنگی محلی لکھنے سے روکے۔ اپنے صدارتی خطاب میں سینئر صحافی قطب اللہ نے کہا کہ خانوادہ فرنگی محل میں بڑی عظیم شخصیات پیدا ہوئیں جنھوں نے اپنے قلم سے علم و ادب کی آبیاری کی۔ ایسی ہی ایک شخصیت حیات اللہ انصاری کی تھی جنھوں نے اردو کی بے مثال خدمات انجام دیں۔ حیات اللہ انصاری مدرسۂ فرنگی محل سے فارغ التحصیل تھے۔ انھوں نے بچپن سے ہی تکلیفوں اور مصیبتوں کو برداشت کیا تھا جس کی جھلک ان کے افسانوں و ناولوں اور خاص طور سے ان کے ضخیم ترین ناول 'لہو کے پھول' میں نظر آتی ہے۔ مہمان اعزازی ڈاکٹر ثوبان سعید نے خانوادہ فرنگی محل کے کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ حیات اللہ انصاری نے اردو زبان و ادب اور اردو صحافت کی بے مثال خدمات انجام دیں۔ یہی وجہ ہے کہ حیات اللہ انصاری کی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر آج یونیورسٹیز میں پی ایچ ڈی ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر اعظم انصاری نے کہا کہ شخص کو شخصیت بننے میں بڑی مشقت کرنی پڑتی ہے اور حیات اللہ انصاری ایک شخصیت تھے۔ انور جہاں نے حیات اللہ انصاری کی شخصیت پر روشنی ڈالی۔ تقریب میں صحافت و سماجی خدمات کے میدان کی نمایاں شخصیات کو اعزاز سے نوازا گیا۔ سدرت اللہ انصاری نے شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 16 نومبر 2022

رہنمائے تعلیم کا خصوصی شمارہ

نئی دھلی: 117 سال سے جاری 'رہنمائے تعلیم' کے خاص نمبر کا اجرا عمل میں آیا اور جناب کے ایل نارنگ ساقی کو ان کی اردو نوازی کے لیے تہنیت پیش کی گئی۔ جلسے کی صدارت ڈاکٹر سید فاروق نے کی جس کا اہتمام سید منصور آغا نے کیا تھا۔ یہ خاص نمبر مولانا رحمت اللہ

فاروقی، سالک دھامپوری، جناب نصرت ظہیر اور سماجی کارکن انور صدیقی ایڈوکیٹ کی علمی، ادبی اور سماجی خدمات اور شخصیت کی یاد میں نکالا گیا۔ اپنے تمہیدی کلمات میں منصور آغا نے کہا کہ جناب نارنگ ساقی کی اردو نوازی بے مثل ہے۔ وہ تقریباً ڈیڑھ درجن وقیع اردو کتابوں کے مصنف، مرتب اور ناشر ہیں۔ وہ خاموشی سے اردو ادیبوں و شاعروں کو بھی نوازتے رہتے ہیں اور رہنمائے تعلیم کی سرپرستی بھی فرماتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جن مرحومین سے منسوب یہ خصوصی شمارہ شائع ہوا ہے ان سب نے اپنے اپنے طور پر اردو زبان کی خدمت انجام دی ہے۔ فاروقی صاحب نے بے شمار بچوں اور بڑوں کو اردو پڑھائی اور مفت پڑھائی۔ یہی ان کا مشن تھا۔ دھامپوری صاحب نے ہر صنف ادب میں طبع آزمائی کی اور کئی کتابیں چھوڑی ہیں۔ نصرت ظہیر کی مزاح نگاری عالم آشکارا ہے۔ اس میں طنز بھی ہے اور تجزیہ بھی۔ انور صدیقی نے خاموشی سے عوامی خدمات انجام دیں۔

پروفیسر خواجہ ایم شاہد، صدر اے آئی ای ایم نے توقع ظاہر کی کہ نئی تعلیمی پالیسی میں ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دینے کا جو اصول منظور ہوا ہے وہ فروغ اردو کے لیے خوش آئند ہوگا۔ جلسہ میں عالمی یوم اردو کے بانی حکیم سید احمد خاں، مہمان خصوصی جناب معصوم مرادآبادی، ماہنامہ اردو دنیا کے مشیر حقانی القاسمی، عبدالرشید اعظمی، ہندوستان ایکسپریس کے معاون مدیر ظفر انور شکرپوری، جناب انعام الرحمٰن، زبیر خاں اور جاوید سالک فرزند سالک دھامپوری نے بھی اظہار خیال کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 23 نومبر 2022

انتخاب انٹرنیشنل

تاجدار اودھ واجد علی شاہ کی نگری مٹیابرج سے تعلق رکھنے والے نئی نسل کے معتبر ادیب و شاعر ڈاکٹر محمد زاہد کی

ادارت میں ایک سہ ماہی رسالہ 'انتخاب انٹرنیشنل' کا اجرا لاری لا ایسوسی ایٹ کے زیر اہتمام ایڈوکاٹ چیمبر جیلیا پاڑہ روڈ میں ہوا۔ اس پروگرام کی صدارت بزرگ معلم و ادیب ڈاکٹر ایس جی آئی حیدر نے جب کہ نقابت کے فرائض نسیم اختر لاری (ایڈوکیٹ) نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی میں ایوارڈ یافتہ شاعر کمتر عظیم آبادی اور سینئر صحافی خورشید اختر فرازی موجود تھے جب کہ حاجی شمس الحق لاری کمزور صحت کے سبب شامل نہ ہو سکے۔ مقررین میں ڈاکٹر الف انصاری، ڈاکٹر نوشاد عالم، انیس النبی، صبیحہ تزئین اور شاہد حسین شاہد تھے۔ تنویر پھول (نیویارک)، غوثیہ سلطانہ (شکاگو)، سرور غزالی (برلن) اور فاروقی جائسی (کانپور) کے ویڈیو پیغامات سامعین نے سنے۔ ڈاکٹر الف انصاری نے ایک جامع مضمون ڈاکٹر محمد زاہد کے تعلق سے پڑھ کر سنایا جس کے بعد کمتر عظیم آبادی کے ہاتھوں رسالہ کا اجرا ہوا۔ خورشید اختر فرازی نے مٹیابرج سے اپنے قلبی تعلقات کا ذکر کیا۔ صابر نظر نے مضمون 'کلکتہ کی اردو صحافت اور ڈاکٹر محمد زاہد' سامعین کے گوش گزار کیا جسے کافی پسند کیا گیا۔ ڈاکٹر نوشاد عالم نے اس رسالہ کی کامیاب اشاعت پر مدیر اور ان کی ٹیم کو مبارکباد پیش کی۔ محترمہ صبیحہ تزئین نے اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے اس نیک کام کو سراہا۔ جناب انیس النبی نے زاہد صاحب کی ہمہ جہت شخصیت کی تعریف کی۔ صدارتی خطبہ ڈاکٹر ایس جی آئی حیدر نے پیش کیا۔

پریس ریلیز: زاہد عالم، 25 نومبر 2022

لفظوں کی گلکاری

رامپور: رامپور کی تاریخی صولت پبلک لائبریری میں خان کمال میموریل سوسائٹی کے زیر اہتمام تحریک ادب رامپور کے چیئرمین اور معروف شاعر نعیم نجمی کے مجموعہ کلام 'لفظوں کی گلکاری' کی رسم رونمائی کی پروقار تقریب کا انعقاد عمل میں آیا۔ دوران تقریب 'لفظوں کی گلکاری' کے خالق نعیم نجمی کو اعزاز سے نوازا گیا اور مسلم راشٹریہ منچ کے علاقائی سیوا پرمکھ اترپردیش و اتراکھنڈ اور نوجوان شاعر فیصل ممتاز کے ذریعے نعیم نجمی کو ان کی تصویر پیش کی گئی۔ اس موقعے پر لائبریری الحاج حمایت اللہ خاں ہال میں ایک پروقار مشاعرے بعنوان 'ایک شام نعیم نجمی کے نام' کا انعقاد بھی عمل میں آیا جس میں رامپور کے معروف شعرا نے شرکت کی۔ مشاعرے کی صدارت ڈاکٹر محمود علی خاں صدر صولت لائبریری نے کی جب کہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے جانشین ڈاکٹر شوق اثر شہزادہ گلریز اور مہمان

خبرنامہ

ذی وقار کے طور پر سابق ضلع جج تنویر احمد وصفی، سابق ریجنل ڈائرکٹر اعلیٰ تعلیمات ڈاکٹر ممتاز عرشی اور جمعیت علما ہند رامپور کے ضلع صدر مولانا محمد اسلم جاوید القاسمی نے شرکت کی۔ کلیدی خطبہ ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے پیش کیا۔ مشاعرے کی نظامت کے فرائض معروف نوجوان شاعر عدنان ضیائی نے بحسن وخوبی انجام دیے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 8 نومبر 2022

اسباق

فتح پور شیخاواٹی / بیکانیر: پریٹن لیکھک سنگھٹن اور تنظیم محفل ادب بیکانیر کے اشتراک سے معروف مصنف وشاعر، نقاد اور مدیر اسباق، پونہ نذیر فتح پوری کا ڈاکٹر ضیاء الحسن قادری اور دیگر ذمے داران کے ذریعے، فتحپور میں ان کی رہائش گاہ پر شال اڑھا کر پھولوں سے استقبال کیا گیا۔ اس موقعے پر رسالہ اسباق کے تازہ شمارے اور تین نئی کتابوں کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ تنظیم اردو محفل بیکانیر کے صدر ڈاکٹر ضیا الحسن قادری نے اس موقعے پر نذیر فتح پوری کی نثری، شعری اور ادب اطفال پر مشتمل کتب وخدمات کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ وہ تقریباً 42 سال سے رسالہ اسباق شائع کر رہے ہیں جس نے اردو کی ادبی صحافت میں ایک اہم سنگ میل طے کیا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ نذیر فتح پوری کی فکشن پر بھی گہری نظر ہے اور ان کی تنقید معاصر تنقید کی آبرو ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عمران عاکف خان نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ نذیر فتح پوری کو راجستھان کا بابائے اردو کہنا چاہیے کیونکہ انھوں نے تقریباً تمام اصناف ادب پر کام کیا ہے، خصوصاً خطوط نگاری، دوہا نگاری، ادبی تاریخ نویسی، صحافت نگاری اور دیگر اہم اصناف پر قلم اٹھایا ہے اور نئی طرحوں کا اضافہ کیا ہے۔ اس موقعے پر راجستھان میں اردو ادب کی مجموعی صورت حال، یہاں کے جامعات اور اداروں میں اردو تدریس کے مسائل نیز ادبائے راجستھان کی کارکردگیوں پر تبادلہ خیال کیا گیا اور سیر حاصل گفتگو ہوئی۔

روزنامہ 'قومی بھارت' دہلی، 14 نومبر 2022

فخر رامپور شوکت علی خاں ایڈوکیٹ

رامپور: مظفراللہ خاں ریزیڈنٹ ایڈیٹر روزنامہ راشٹریہ سہارا گورکھپور اور ڈاکٹر راحل جہاں ڈائٹ کالج امروہہ کی تصنیف کردہ فخر رامپور شوکت علی خاں ایڈوکیٹ کی تقریب رسم اجرا کا پروقار انعقاد صولت پبلک لائبریری کے الحاج حمایت اللہ خاں ہال میں ایک پروقار تقریب کے دوران عمل میں آیا۔ صولت لائبریری کے صدر ڈاکٹر محمود علی خاں کے زیر صدارت منعقدہ ادبی تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر اظہر عنایتی نے شرکت کی۔ جب کہ نظامت کے فرائض ریٹائرڈ انجینئر محکمہ ہائیڈل ومعروف ناظم مشاعرہ سید شکیل غوث نے اپنے منفرد انداز میں انجام دیے۔ رسم اجرا تقریب سے خطاب کرتے ہوئے مقررین نے مرحوم شوکت علی خاں ایڈوکیٹ کی ہمہ جہت شخصیت پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ رامپور رقبہ میں چھوٹا لیکن رتبہ میں بہت بڑا ہے۔ دور حاضر میں رامپور کو ایک ایسی پراعزاز شخصیت کو جنم دینے کا شرف حاصل ہے جس نے اپنی گوناگوں صفات، صالح فکر وعمل، اپنی تعمیری فہم و فراست، تحریر وتقریر، زندہ ضمیری اور عزم وحوصلہ کی فراوانی سے ایسے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے جو قابل رشک اور لائق صد تحسین وافتخار ہیں۔ اس شخصیت کا نام نامی ہے شوکت علی خاں ایڈوکیٹ۔ آنے والی نسلیں جب ان کی گراں قدر خدمات اور تہہ دار ومتحرک شخصیت سے روبرو ہوں گی تو انھیں نہ صرف فخر کا احساس ہوگا بلکہ یہ حیرت بھی ہوگی کہ ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی۔

روزنامہ 'اخبارِ مشرق' دہلی، 14 نومبر 2022

سرخاب کے پر

لکھنؤ: ادبی تنظیم کاروان رہبر کے تحت جشنِ معید رہبر و حافظ وسیم جہانگیرآبادی کا مجموعۂ کلام 'سرخاب کے پر' کی رسم اجرا و آل انڈیا مشاعرہ کا انعقاد 'نہرو یوا کیندر' بالمقابل حسین آباد، پاور ہاؤس ہوا۔ عبدالوحید فاروقی صدر صحابہ ایکشن کمیٹی لکھنؤ کی سرپرستی میں پروگرام دیر رات اختتام پذیر ہوا۔ صدارت عالمی شہرت یافتہ شاعر و ناظم واصف فاروقی نے کی جب کہ مہمانان اعزازی کی حیثیت سے ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی و ڈاکٹر مخمور کاکوری نے شرکت کی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے سابق اردو پروگرامر پرتل جوشی و عالمی شہرت یافتہ شاعر حسن کاظمی شریک تھے۔ نظامت کے فرائض بحسن وخوبی عاصم کاکوروی نے انجام دیے۔ صدر مشاعرہ واصف فاروقی نے اپنے خطاب میں کہا کہ وسیم جہانگیرآبادی حضرت خورشید افسر بسوانی مرحوم کے تلامذہ میں ہیں اس لیے میرے استاد بھائی بھی ہیں۔ وسیم نوئیڈا میں بڑی دلجمعی سے اپنے کاروبار اور شعری و ادبی مشغلے میں اپنے شب و روز گزار کر ایک سادگی بھری زندگی میں مطمئن ہیں۔ معید رہبر صاحب جشن ہیں اور دبستانِ لکھنؤ کا ایک درخشندہ ادبی ستارہ ہیں جنھوں نے بے لوث ادبی خدمت میں اپنی زندگی کو وقف کر رکھا ہے۔ ادب کے متعدد چراغ معید رہبر کی رہبری کے روغن سے روشن ہو کر آسمان ادب پر ایک چمک بکھیرنے کے لیے برسرپیکار ہیں۔ میں سبھی کو مبارکباد دیتے ہوئے نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔ اس موقعے پر واصف فاروقی، ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی، ڈاکٹر مخمور کاکوروی، پرتل جوشی، معید رہبر لکھنوی، حافظ وسیم جہانگیرآبادی کو یادگاری نشان اور شال پیش کی گئی۔ عبدالوحید فاروقی صدر صحابہ ایکشن کمیٹی لکھنؤ، کو 'فخر لکھنؤ' ایوارڈ سے نوازا گیا۔ حافظ سید وصی (نوجوان لیڈر) کو گلدستہ پیش کیا گیا اور اعجاز چاندی والا و محمد فرقان کی گلپوشی کی گئی جس کے بعد تمام اہم شخصیات کے ہاتھوں 'سرخاب' کے پر' کی رسم اجرا ہوئی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 12 نومبر 2022

موجودہ ہندوستان میں مساوات، انصاف اور بھائی چارہ

نئی دھلی: معروف ادارہ انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز کی ایک اہم اشاعت 'موجودہ ہندوستان میں مساوات، انصاف اور بھائی چارہ' کا اجرا عمل میں آیا۔ اس کتاب کی تالیف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ قانون کے استاذ پروفیسر محمد ظفر محفوظ نعمانی نے کی ہے۔ اجرا کی تقریب میں انھوں نے ویڈیو کانفرنسنگ کے ذریعے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کتاب میں مساوات، انصاف اور بھائی چارے کا موجودہ حالات کے تناظر میں تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے اور بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ آئین ہند کے مقدمہ میں واضح طور پر مساوات، انصاف اور بھائی چارہ کا ذکر موجود ہے۔ ملک کی ترقی، سلامتی اور عوام میں یکجہتی اور انصاف کے حصول کے لیے قانون پر عمل کرنا ضروری ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب موجودہ ہندوستان میں مساوات، انصاف اور بھائی چارہ کو یقینی بنایا جائے گا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبہ قانون کے پروفیسر اقبال حسین کے ہاتھوں کتاب کا اجرا عمل میں آیا۔ انھوں نے اپنی گفتگو میں کتاب کی اہمیت کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ بھائی چارہ، مساوات اور انصاف کسی بھی سماج اور معاشرہ کی بنیادی کلید ہے، ہندوستان کے آئین میں اس کی وضاحت موجود ہے۔ پروفیسر زیڈ ایم خان سکریٹری جنرل انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز نے صدارتی خطاب میں کہا کہ آئی او ایس کے متعدد منصوبوں میں مساوات اور انصاف کا موضوع سرفہرست رہا ہے،

متعدد سمینار اور کانفرنس کا انعقاد کیا گیا ہے، کئی کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں، یہ کتاب بھی اس سلسلے کا ایک حصہ ہے جس کی تالیف پروفیسر ظفر محفوظ نعمانی نے کی۔ نظامت کا فریضہ پروفیسر حسینہ حاشیہ نے انجام دیا۔ اس موقعے پر انھوں نے معروف ماہر اسلامی معاشیات پروفیسر نجات اللہ صدیقی کی وفات کا تذکرہ کرتے ہوئے انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 13 نومبر 2022

مولانا جلال الدین عمری: افکار و آثار

نئی دھلی: جماعت اسلامی ہند کے مرکز، نئی دہلی میں

ایک تقریب میں جناب سید سعادت اللہ حسینی، امیر جماعت اسلامی ہند کے بہ دست 'مولانا سید جلال الدین عمری: افکار و آثار' نامی کتاب کا اجرا ہوا۔ یہ کتاب ان مقالات پر مشتمل ہے جو 19-18 ستمبر 2022 میں ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ کی جانب سے کانفرنس ہال، مرکز جماعت اسلامی ہند میں منعقد ہونے والے سمینار میں پیش کیے گئے تھے۔ سید سعادت اللہ حسینی نے اپنے صدارتی کلمات میں مولانا عمری کی خدمات پر روشنی ڈالی اور اس بات پر اپنے اطمینان اور خوشی کا اظہار کیا کہ سمینار میں پیش کیے گئے مقالات نہایت عمدگی کے ساتھ مرتب کیے گئے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ مقالات میں مولانا کے تحریری سرمایہ کے جن پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے ان پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ مجموعہ میں شامل مقالات کی روشنی میں ادارہ کے ذمے داروں کو منصوبہ بندی کرنی چاہیے اور فہرست تیار کرنی چاہیے کہ آئندہ کن کن موضوعات پر مزید کام کرنا ہے۔ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی صدر ادارہ تحقیق نے استقبالیہ کلمات پیش کیے۔ انھوں نے اس بات پر مسرت کا اظہار کیا اور اللہ تعالی کا شکر ادا کیا کہ مختصر عرصے میں یہ مجموعہ منظر عام پر آ گیا ہے۔ پھر ڈاکٹر عطیہ صدیقہ سکریٹری شعبہ خواتین جماعت اسلامی ہند اور ڈاکٹر حسن رضا چیئرمین اسلامی اکیڈمی نئی دہلی نے کتاب پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر عطیہ صدیقہ صاحبہ نے کہا کہ مولانا عمری کا معاشرت اور حقوق نسواں پر خصوصی کام ہے۔ سمینار میں ایک اجلاس خواتین کے لیے خاص کیا گیا تھا اور مجموعہ مقالات میں بھی خواتین کی اچھی نمائندگی ہے۔ انھوں نے مولانا کی تصانیف کا تعارف کرایا اور ان کے افکار سے بھی بحث کی۔ ڈاکٹر حسن رضا نے تفصیل سے کتاب کے مشتملات کا تجزیہ کیا اور خصوصیت سے بعض مقالہ نگاروں کا تذکرہ کیا، جنھوں نے مولانا کے علمی کاموں کا جائزہ لیا ہے اور نئے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے مرتبین کو مبارکباد دی کہ انھوں نے مختصر عرصے میں بہت محنت کر کے یہ مجموعہ مرتب کیا ہے۔ اشہد رفیق ندوی سکریٹری ادارہ نے پروگرام کی نظامت کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 30 نومبر 2022

بچوں کی زمین سے

نئی دھلی: 'ماں، مذہب، ملک اور اور مادری زبان کو مادی فوائد سے دور ہی رکھنا چاہیے کہ ان کا رشتہ دل سے ہوتا ہے، پیٹ سے نہیں۔' پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے اپنے صدارتی خطاب میں زبان و ادب کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے یہ کہا۔ موصوف آل انڈیا ادب الاطفال سوسائٹی نئی دہلی اور واٹس ایپ گروپ بچپن کے زیر اہتمام ملی ماڈل اسکول نئی دہلی 12 نومبر 2022 کو منعقدہ دو روزہ سمینار کی افتتاحی نشست میں اظہار خیال کر رہے تھے۔ اس تقریب میں مہمانان خصوصی پروفیسر خالد محمود، ڈاکٹر سراج الدین ندوی، ڈاکٹر نظر محمود، ڈاکٹر اطہر ندوی، ڈاکٹر عبد الماجد نظامی کی موجودگی میں معروف انشائیہ نگار محمد اسد اللہ کی کتاب 'بچوں کی زمین سے' کا اجرا پروفیسر اختر الواسع کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس کتاب میں بچوں کے لیے مختلف موضوعات پر منظومات ہیں۔ 'ماہنامہ کھلونا ایک انتخاب' کے مرتب، انشائیہ نگار محمد اسد اللہ کی ادب اطفال سے متعلق چند کتابیں اس سے پہلے بھی شائع ہو چکی ہیں۔

اسی تقریب میں ماہنامہ الفاظ ہند کامٹی سے شائع ہونے والے ماہنامہ الفاظ ہند کے گوشۂ سراج عظیم کا بھی اجرا عمل میں آیا۔ اس سمینار میں ملک کے مختلف علاقوں سے تشریف لائے ادیبوں اور فنکاروں نے شرکت کی۔

پریس ریلیز: جاوید حسین، ناگپور، 15 نومبر 2022

دیوانِ غالب

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے زیر اہتمام پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ میں دیوان غالب پنجابی کی رسم رونمائی اردو ادب کی اہم ترین شخصیات کے ہاتھوں کی گئی۔ اس موقعے پر منعقدہ تقریب میں پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ وائس چانسلر پروفیسر اروند نے کہا کہ بڑا شاعر وہی ہے جو وقت کے ساتھ آگے بڑھتا رہتا ہے اور اس کی شاعری کی معنوی تہیں وقت کے ساتھ کھلتی چلی جاتی ہیں۔ ایک غلط فہمی یہ ہے کہ ماڈرن تھیوریز مغربی ہیں، جس سے مجھے شدید اختلاف ہے۔ آپ اگر غالب کی شاعری کو پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ وہ ماڈرن تھیوریز کا پورا ساتھ دیتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ غالب کلاسک (قدیم) ہونے کے باوجود سب سے ماڈرن (جدید) شاعروں میں سے ایک ہیں۔ تقریب کے آغاز میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ ملازمت کے سلسلے میں میرا پنجاب میں قیام رہا ہے اور میں کسی قدر پنجابی زبان سے واقف بھی ہوں۔ میری کوشش ہے کہ دیوان غالب ہندوستان کی تمام علاقائی زبانوں میں شائع ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے چارج لینے کے بعد سب سے پہلے دیوان غالب پنجابی میں شائع ہوا ہے۔ ہم پنجاب میں ہی اس کی رسم رونمائی چاہتے تھے اس کے لیے پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ سب سے مناسب مقام ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ پروفیسر اروند نے نہ صرف ہمیں اس کی اجازت دی بلکہ خود بھی اس تقریب میں شرکت کی۔ اس موقعے پر میں ڈاکٹر نریش جنھوں نے اس دیوان کا پنجابی میں ترجمہ کیا ہے کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ میں ڈاکٹر بلبیر سنگھ مادھو پوری اور ڈاکٹر بلجیت سنگھ شیخوں کا شکریہ ادا کرنا بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ پروفیسر محمد رفیع سابق سکریٹری پنجاب اردو اکادمی نے کہا کہ شاعری کا ایک انداز یہ ہے کہ 'ایک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں' غالب کے یہاں یہ وصف بڑے خوبصورت انداز میں ظاہر ہوا ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ مبارکباد کا مستحق ہے کہ اس نے اس اہم ضرورت کو محسوس کیا اور اس کو عملی جامہ پہنایا، پروفیسر گرمکھ سنگھ صدر شعبۂ پنجابی، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ نے کہا

کہ میں نے جگجیت سنگھ اور دیگر لوگوں کی آواز میں غالب کی غزلیں سنیں، پھر سیریل دیکھا اور بعد میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کی کتاب پڑھی۔ پروفیسر نارنگ نے انھیں بالکل مختلف انداز میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر راجندر سنگھ برار ڈین فیکلٹی آف لینگویجز نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ غالب نے کہا تھا کہ 'وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے' اس موقعے پر مجھے یہ شعر بہت اچھا لگ رہا ہے کیونکہ غالب گرمکھی کا لباس پہن کر ہمارے گھر آئے ہیں۔ پروفیسر رحمٰن اختر صدر شعبۂ فارسی، اردو، عربی نے اس اجلاس کی نظامت کرتے ہوئے کہا کہ غالب اردو کے سب سے مقبول شاعر ہیں۔ وہ ہمارے سلیبس کا حصہ بھی ہیں۔ آج جب غالب کا کلام گرمکھی رسم الخط میں شائع ہوا ہے تو مجھے بہت خوشی ہورہی ہے۔ میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے تمام ذمے داران کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ایرانی اسکالر محترمہ لیلیٰ چمن خان نے اس موقعے پر غالب کی فارسی غزل پیش کی۔ تقریب میں علم وادب سے وابستہ مختلف شخصیات کے علاوہ یونیورسٹی اساتذہ وطلبہ نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 نومبر 2022

چھاؤں سے دھوپ تک

اردو کے مقبول اور معتبر شاعر مصداق اعظمی کا اولین

نظموں کا مجموعہ 'چھاؤں سے دھوپ تک' کے اجرا کی تقریب حرا پبلک اسکول موضع پھدگدیہ امباری میں بدست انجینئر طارق اعظم اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ممبر مولانا ابوطالب رحمانی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس موقعے پر تقریب کے صدر مولانا ابوطالب رحمانی نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے مجموعے کو مختصر اوقات میں جو پڑھا ہے اس سے بے حد خوشی ہوئی مختلف موضوعات پر نظمیں ہیں جو گھر آنگن سے لے کر ہمارے معاشرے، ملکی حالات اور بیرونی حالات کا احاطہ کرتی ہیں اس مجموعے کے عنوان میں قوم وملت کی زبوں حالی کا درد چھپا ہے یعنی یہ سچ ہے کہ آج ہم سب 'چھاؤں سے دھوپ تک' کا سفر طے کر رہے ہیں' اس موقعے پر انجینئر طارق اعظم نے مصداق اعظمی کے متعلق کہا کہ وہ اردو کے معتبر نمائندہ شاعر ہیں اور ان کا تعلق ہمارے علاقہ سے ہے جو ہم سب کے لیے باعثِ عزوشرف ہے اور اس تعلق سے ہم سب کی کوشش ہونی چاہیے کہ جو لوگ بھی مصداق اعظمی کی طرح سچی لگن، محنت اور ایمانداری سے زبان وادب کی خدمات انجام دے رہے ہیں ان کی ہر ممکن پذیرائی اور حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی ریٹائرڈ پرنسپل جج بدرالدجی نقوی نے سامعین کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے معتبر شاعر مصداق اعظمی صاحب کے مجموعۂ نظم کے رسم اجرا کی تقریب کا اہتمام کرنا ایک مستحسن قدم ہے۔ اس موقعے پر اقرا پبلک اسکول کے بانی وسرپرست، ماہر ادبِ اطفال محمد عارف اصلاحی نے شعری مجموعہ 'چھاؤں سے دھوپ تک' کا اجمالی تعارف پیش کیا اور مختلف نظموں پر سیر حاصل گفتگو کی۔

مصداق اعظمی نے طارق اعظم صاحب کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ دیگر احباب کی محبتوں وعنایتوں کا بھی دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: مصداق اعظمی، 6 نومبر 2022

کرب ناتمام

نئی دہلی: انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز کے زیراہتمام معروف صحافی شاہین نظر کے افسانوی مجموعہ 'کرب ناتمام' کا رسم اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر آئی او ایس کے چیئرمین ڈاکٹر محمد منظور عالم نے کہا کہ آج کی یہ مجلس جناب شاہین نظر کے دوسرے افسانوی مجموعہ کرب ناتمام کی تقریب رونمائی کے طور پر منعقد کی گئی ہے، شاہین جتنے اچھے انگریزی اور اردو کے صحافی ہیں اتنے ہی اچھے افسانہ نگار بھی ہیں، اور انھوں نے اپنے افسانوں میں روزمرہ کی زندگی کی مختلف چلتی پھرتی تصویروں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر شہزاد انجم نے صدارتی خطاب میں شاہین نظر کو مبارکباد پیش کی اور کہا کہ انھوں نے موجودہ حالات کو جس خوبصورتی کے ساتھ افسانہ کی شکل میں قارئین کی نذر کیا ہے اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ مصنف کتاب شاہین نظر نے اپنی گفتگو میں کہا کہ میں پیشے کے اعتبار سے صحافی ہوں اور غیر جانبدار طریقے سے کسی واقعہ، حادثہ کو نیوز اسٹوری کی طرح پیش کرنا میرا کارمنصبی ہے لیکن ہر حساس دل انسان کی طرح واقعات اور مشاہدات مجھے متاثر کرتے ہیں اور میرے وجود کا حصہ بن کر مجھے بے چین رکھتے ہیں اور پھر خود بخود دیر سویر نوک قلم تک افسانوں کی شکل میں آہی جاتے ہیں۔ افسانہ نگاری بھی میرے حساس دل ہونے کا ہی فطری نتیجہ ہے۔ انھوں نے اس موقعے پر اپنی کتاب سے کچھ افسانے بھی پڑھ کے سنائے۔ اس موقعے پر معروف صحافی جناب سہیل انجم اور جناب خورشید اکرم نے بھی اظہار خیال کیا۔ نظامت کا فریضہ آئی او ایس سینٹر برائے آرٹس اینڈ لٹریچر کے کوآرڈینیٹر جناب انجم نعیم نے انجام دیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 6 نومبر 2022

گھروندا

لکھنؤ: گھروندا ایک سماجی اور جذباتی اتار چڑھاؤ کا ناول ہے، جس کے مصنف اطہر نبی ہیں۔ اطہر نبی ایک ایسا نام ہے جس سے شعروادب سے شناسائی رکھنے والا، ہر شخص اچھی طرح واقف ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار پروفیسر شارب ردولوی نے ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی کی سہ روزہ گولڈن جبلی تقریبات میں ناول کی رسم اجرا کے موقعے پر ہوٹل کلارک میں سیکڑوں سامعین کے سامنے صدارتی خطاب میں کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اطہر نبی کی ادبی، ثقافتی اور سماجی خدمات روز روشن کی طرح عیاں ہیں اور وہ کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ مہمان خصوصی برجیش پاٹھک نائب وزیراعلیٰ حکومت اترپردیش نے کہا کہ اطہر نبی جو ایک مایہ ناز ادیب، شاعر، دانشور، مدبر، ڈرامہ نگار، اور ناول نگار کے ساتھ ہی ادبی منتظم کے طور پر ادبی حلقوں میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، وہ ایک سادہ، سہل، نام ونمود سے دور اور ملنسار شخصیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے ملک کی تہذیبی زندگی، مشترکہ ثقافت کی مضبوطی اور فروغ کے ساتھ ساتھ گنگا جمنی تہذیب کا علم ہمیشہ اٹھائے رکھا۔ پروگرام کے آغاز میں اطہر نبی نے

اپنی کمیٹی کے اراکین کے ساتھ مہمانوں کا استقبال کیا اور اپنی تنظیم کے نصف صدی کے سفر کے بارے میں بتایا کہ وہ کس طرح اور کن لوگوں کے تعاون سے اتنے بڑے بڑے اور اہم تقریبات کو انجام تک پہنچا سکے۔ گولڈن جبلی تقریبات کے موقعے پر صوفیانہ شام غزل کا بھی اہتمام کیا گیا جس میں مشہور گلوکارہ پوجا گائیکو نڈے نے اپنی مسحور کن آواز سے حاضرین کا دل جیت لیا، ڈاکٹر عمار رضوی (سابق کارگزار وزیراعلیٰ اتر پردیش) نے کہا کہ اطہر نبی جو کہ پیشے سے وکیل ہیں، لیکن اردو دنیا کے بین الاقوامی حلقے میں انھیں 'محسن اردو' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ کملیشور نے کہا تھا کہ ہر زبان کو ایک گوپی چند نارنگ کی ضرورت ہے لیکن میرا ماننا ہے کہ اردو کے فروغ اور ترقی کے لیے ہر گلی، ہر محلے، ہر گاؤں اور ہر شہر کو ایک اطہر نبی کی ضرورت ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم (دہلی یونیورسٹی) نے کہا کہ اطہر نبی بے پناہ تنظیمی صلاحیتوں کے مالک ہیں، اور وہ اپنے اندر ایک مکمل ادارہ ہیں۔ غیر ممالک سے افتخار عارف، اشفاق حسین، جاوید دانش، آغا سہیل، عارف نقوی، احمد فراز، فیض احمد فیض، فہمیدہ ریاض ان سب کو لکھنؤ بلا کر یکجا کرنے کا جو ہنر اطہر نبی کو آتا ہے وہ عدیم المثال ہے۔ پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے کہا کہ اودھ کے معزز گھرانے کے چشم و چراغ و ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی کے روح رواں اطہر نبی پیشہ ورانہ طور پر وکیل ہیں تاہم ان کی دلچسپی کا محور بنیادی طور پر ادب اور ثقافت رہا ہے، جس کی خدمت میں وہ نصف صدی سے اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ میدان عمل میں ہیں۔ پروفیسر صغیر افراہیم (اے ایم یو) نے کہا کہ اطہر نبی کی ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی کے بارے میں کون نہیں جانتا، آپ نے علمی و ادبی سمینارو ں اور دوسری تہذیبی و ثقافتی سرگرمیوں کو عالمی سطح پر بلندی عطا کی ہے۔ گولڈن جبلی تقریب کے موقعے پر آئے ہوئے مہمانان کا استقبال معروف شاعر حسن کاظمی، ضیاء اللہ صدیقی، ڈاکٹر یاسر جمال، سہیل کاکوروی، رفیع احمد، بلال نورانی وغیرہ نے گلدستہ اور شال پیش کر کے کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 6 نومبر 2022

آدھی دنیا کا مکمل جہان

جمشید پور: اردو کی مایہ ناز ادیبہ اور کئی تاریخی کتابوں کی مصنفہ محترمہ شمع اختر کاظمی کی تازہ تخلیق 'آدھی دنیا کا مکمل جہان' کے اجرا کا شایان شان انعقاد ہوا۔

اردو قبیلہ جمشید پور کے زیر اہتمام شہر کے قدیم تعلیمی

ادارہ کریم سٹی کالج کے مانگو کیمپس میں واقع آڈیٹوریم میں منعقدہ اس تقریب اجرا کی صدارت کالج کے سابق پرنسپل محمد زکریا نے کی جب کہ کتاب کا اجرا کریمہ ٹرسٹ کے ٹرسٹی سید اشفاق کریم کے ہاتھوں انجام پایا۔ اس موقع پر اپنی صدارتی تقریر میں محمد زکریا نے کہا کہ شمع اختر کاظمی کی کتاب 'آدھی دنیا کا مکمل جہان' اردو ادب میں ایک تاریخی حیثیت کی حامل ہے۔ اور اس کتاب کو کبھی بھلایا نہیں جاسکے گا۔ پروفیسر احمد بدر نے کتاب 'آدھی دنیا کا مکمل جہان' اور اس کی مصنفہ کے حوصلوں کی داد دیتے ہوئے کہا کہ عظیم ملک ہندوستان کی تقریباً تمام ریاستوں میں رہنے اور تخلیقی عمل جاری رکھنے والی 80 خواتین کا تعارف و تذکرہ لکھنا اور اردو زبان سے متعلق الگ الگ سوالات کر کے ان کا انٹرویو کرنا یقینی طور پر بڑے حوصلے کا کام ہے۔

'آدھی دنیا کا مکمل جہان' کی مصنفہ شمع اختر کاظمی نے اس موقعے پر تمام مہمان کرام کالج انتظامیہ، سامعین حضرات اور اردو قبیلہ کے عہدے داران وار اکین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ یہ میرے لیے انتہائی خوشی کا مقام ہے کہ آج میری مادر علمی میں میری تیسری کتاب کا اجرا عمل میں آیا۔ پروفیسر سید آل علی نے اس باوقار تقریب اجرا کی نظامت بحسن وخوبی انجام دی جبکہ مختار عالم خان نے تمام مہمانوں اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: عبدالسلام، جمشید پور، 4 نومبر 2022

پاکیزہ الفاظ

سہارنپور: سہارنپور کی سرزمین نے اردو ہندی ادب کے نامور شاعروں کو جنم دیا ہے جنھوں نے ہندی اردو

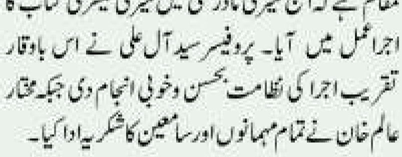

ادب کی بہترین اور دیانت داری سے خدمات انجام دے کر ضلع سہارنپور کا نام بین الاقوامی سطح پر روشن کیا ہے۔ اس وقت معروف شاعر دانش کمال سہارنپوری نے جناب حمید قریشی اور سادھورام آرزو جیسے سینئر شاعروں کی نعت گوئی کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنے شعری مجموعے کے ذریعے سامعین سے بھرے آڈیٹوریم میں نئی نسل کو نعت گوئی سے متعارف کرایا۔ پروگرام میں سنجیو جھنگران، آسیہ صدیقی، دل بہار ملک اور کشمیری گلوکارہ فوزیہ پروین نے دانش کمال کی شاعرانہ تخلیقات کو اپنی بہترین گائیکی میں پیش کیا۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ ڈاکٹر نواز دیوبندی نے نعتیہ شعری مجموعہ کا اجرا کیا۔ مہمان خصوصی ایم پی حاجی فضل الرحمٰن نے شہر کے بزرگ شعرا کا حوالہ دیتے ہوئے دانش کمال کی اس ادبی کاوش کو سراہا۔ مہمان خصوصی سنجے گرگ، سابق سٹی ایم ایل اے نے کہا، سہارنپور ہمیشہ سے محبت کا شہر رہا ہے۔ ہندی اردو ادب نے پورے ملک کو امن ومحبت کا راستہ دکھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے سابق پرنسپل جلال عمر نے کہا کہ 'پاکیزہ الفاظ' خدا اور اس کے آخری رسول محمد کی شان میں لکھا ہوا ایک کلام ہے، جو پوری دنیا کو امن، محبت اور بھائی چارے کا پیغام دیتا ہے اور پوری انسانیت کو اس کی اصل حالت سے روشناس کراتا ہے، پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے انجمن علم وادب کی صدر اور معروف رنگین مصور جاوید خان سروہا نے آڈیٹوریم میں موجودہ حاضرین کا استقبال کیا اور سہارنپور میں اردو ادب کے سفر پر روشنی ڈالی، ڈاکٹر ریاض النبی نے بھی خطاب کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 2 دسمبر 2022

گیتا کی روحانی طاقت

لکھنؤ: بائبل، گروگرنتھ، توریت اور قرآن شریف سمیت تمام مذہبی کتابیں انسانیت ومحبت، رواداری وخیر خواہی کی تعلیم دیتی ہیں۔ سبھی مذاہب میں انسانیت کو پہلا درجہ دیا گیا ہے۔ تمام مذاہب کے علما نے ہمیشہ انسانیت و بھائی چارے کا پیغام دیا ہے۔ دنیا میں پائی جانے والی نفرتیں اور ایک دوسرے سے دوری مذہب سے دوری کی وجہ سے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مذاہب کی تعلیمات کو عام کیا جائے۔ آپسی بھائی چارہ کو مضبوط کرنے کے لیے مذاہب کی مقدس کتابوں کے پیغامات کو آسان زبان میں تمام مذاہب کے ماننے والوں تک پہنچایا جائے۔ اس سے غلط فہمیوں کا ازالہ ہوگا اور لوگوں کے دلوں سے غلط فہمیاں دور ہوں گی اور ایک دوسرے کے تئیں دلوں میں احترام پیدا ہوگا۔ ان خیالات کا اظہار آج یہاں فرنگی محل واقع مدرسہ حیات العلوم، فرنگی محل کے ہال میں سدرت اللہ انصاری کی تصنیف 'گیتا کی روحانی طاقت' کی تقریب رسم اجرا و مذاکرہ سے خطاب کرتے ہوئے مقررین نے

کیا۔ تقریب کا انعقاد مسرور ایجوکیشنل سوسائٹی نے کیا تھا جس کی سرپرستی بیگم شہناز سدرت صدر بزم خواتین نے، صدارت پروفیسر عباس رضا نیر نے کی اور بطور مہمانان خصوصی نریندر بھوش (پی سی ایس)، وریندر کمار سکسینہ (سابق انفارمیشن کمشنر اتر پردیش) واتل کمار شریواستو (صدر ایسوسی ایشن آف پرائیویٹ اسکول اتر پردیش) نے شرکت کی۔ نظامت شکیل گیاوی نے کی۔ کتاب کا اجرا اسٹیج پر موجود مہمانوں کے بدست عمل میں آیا۔ اس موقعے پر مقررین نے گیتا و دیگر آسمانی کتب کے حوالے سے انسانی بھائی چارہ کی اہمیت پر مختلف انداز سے روشنی ڈالی۔ پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر منصور حسن خاں نے استقبالیہ کلمات کہے۔

روز نامہ 'صحافت' دہلی، 2 دسمبر 2022

وفیات

پروفیسر مرزا سعید الظفر چغتائی

علی گڑھ: پروفیسر مرزا سعید الظفر چغتائی (2022-1937) 4 نومبر 1937 کو دریاباد، بارہ بنکی میں پیدا ہوئے اور ان کا انتقال 17 نومبر 2022 کو ایک لمبی بیماری کے بعد علی گڑھ میں ہوا۔ انھوں نے 85 برس کی عمر پائی۔ ان کی تدفین یونیورسٹی قبرستان میں عمل میں آئی۔ پسماندگان

میں بیوہ، دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ چغتائی صاحب معروف ادیب مرزا محمد نذیر بیگ چغتائی کے فرزند تھے، ان کا آبائی تعلق اودھ کے معزز اور معروف گھرانے سے ہے جو اردو ادب اور صحافت میں اپنی خدمات کے لیے جانا جاتا ہے۔ چغتائی صاحب گرچہ سائنس کے آدمی تھے لیکن ان کو اردو ادب سے محبت، اردو دوستی اور اردو نوازی خاندانی طور پر ورثہ میں ملی تھی۔ انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی، پیرس یونیورسٹی، فرانس سے فزکس کی تعلیم حاصل کی۔ وہ اٹامک سپیکٹروسکوپی کے ماہر تھے۔ چغتائی صاحب نے 1969 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستگی اختیار کی تھی۔ وہ 'فکر و نظر' علی گڑھ کے ادارتی بورڈ کے رکن بھی رہے۔ انھوں نے 'فکر و نظر' کا ایک خاص سائنس نمبر 1975 میں مرتب کیا تھا۔ انھوں نے 'فکر و نظر' اور 'تہذیب الاخلاق' میں بہت سے سائنسی مضامین لکھے۔ چغتائی صاحب اردو شاعری اور تنقید میں اپنی دلچسپی کے لیے بھی جانے جاتے ہیں۔

جنون زار (1964)، نغمات زندگی (1997)، نے نوازی (2013) ان کے شعری مجموعے ہیں۔ ان کی 45-1942 کے بچپن کے دنوں کی یادداشتیں یعنی 'سحر کے پہلے اور بعد' مکتبہ جامعہ، نئی دہلی نے 1991 میں شائع کی تھی۔

فیس بک اور دیگر ذرائع سے

منیب الرحمٰن

اردو کے مشہور شاعر و ادیب اور مترجم ڈاکٹر منیب الرحمٰن کا 28 نومبر 2022 کو مشی گن (امریکہ) میں انتقال ہو گیا۔

منیب الرحمٰن کی ولادت 18 جولائی 1924 کو آگرہ میں ہوئی۔ انھوں نے الٰہ آباد کے سینٹ میری کنوینٹ سے تعلیم کا آغاز کیا۔ میرٹھ کالج سے انٹر پاس کیا۔ 1940 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے گریجویشن اور 1942 میں تاریخ میں ایم اے کیا۔ 1944 میں انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ہی فارسی میں ایم اے کیا۔ 1945 میں لندن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں فارسی میں پی ایچ ڈی کے لیے داخلہ لیا۔ انھوں نے وہاں پروفیسر اے کے ایس لیم بٹن (A.K.S. Lambton) کی نگرانی میں جدید فارسی ادب پر تحقیقی کام کا آغاز کیا۔ 1954 میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ادارہ علوم اسلامیہ میں ریسرچ فیلو کے طور پر ان کا تقرر ہوا۔ علی گڑھ سے ہی ان کا مقالہ Post- Revolution Persian Verse شائع ہوا۔ ادارۂ علوم اسلامیہ میں ریڈر کی جگہ پر ان کی ترقی ہوئی۔ 1970 میں وہ امریکہ چلے گئے جہاں انھیں مشی گن کے شہر روچسٹر کے Oakland University کے جدید زبانوں کے شعبے میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کی جگہ مل گئی اور وہیں وہ 1990 میں پروفیسر بھی بنے اور اسی یونیورسٹی سے پروفیسر ایمرٹیس کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

منیب الرحمٰن کا شمار جدید نظم کے اہم شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کی سب سے پہلی نظم 'شہاب ثاقب' کے نام سے ادبی دنیا لاہور میں شائع ہوئی تھی۔ ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ 'بازدید' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد شہر گمنام، نقطۂ موہوم جیسے مجموعے شائع ہوئے۔ ان کی اہم کتابوں میں سڑکوں کے چراغ 2005، ہجر و فراق کی نظمیں 2008، سرمایۂ کلام 2019 قابل ذکر ہیں۔

برگزیدۂ شعر فارسی معاصر (حصہ اول و دوم) اور جدید فارسی شاعری (1959) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے شائع ہوئیں۔ انھوں نے شیکسپیئر کے ڈرامے 'اینٹنی' اور 'قلوپطرہ' کا اردو ترجمہ کیا جو مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے شائع ہوا۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام اور انسائیکلو پیڈیا ایرانیکا کے لیے اردو اور فارسی ادب پر انگریزی میں مضامین لکھے۔

ولی عالم شاہین کے فیس بک اور دیگر ذرائع سے۔ سوانحی تفصیلات ان کے مجموعہ 'سرمایۂ کلام' سے ماخوذ

سردار علی

حیدر آباد: حیدر آباد دکن سے تعلق رکھنے والی اردو دنیا کی معتبر و بزرگ شخصیت و بانی شعر و سخن ڈاٹ کام ویب سائٹ الحاج سردار علی ولد شبیر علی کا 84 سال چہار شنبہ کو

کینڈا میں انتقال ہو گیا۔ وہ گزشتہ کئی ماہ سے علیل تھے۔ نماز جنازہ 24 نومبر بروز جمعرات کو کینڈا میں بعد نماز ظہر اسلامک فاؤنڈیشن آف ٹورنٹو نیو جیٹ مسجد میں ادا کی گئی اور تدفین کینڈا کے قبرستان میں عمل میں آئی۔ پسماندگان میں چار فرزند اور دو دختر شامل ہیں۔ شعر و سخن پر اردو کے اہم رسائل پابندی سے پیش ہوتے تھے اور ویب سائٹ پر دنیا بھر کے قلمکاروں کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ دنیا میں جہاں کہیں بھی ادبی اجلاس، مشاعرے و سمینار ہوتے تو پابندی سے سردار علی انھیں ویب سائٹ پر پیش کرتے تھے۔ اردو دنیا کی تمام شخصیات نے انھیں اردو کا ایک خاموش خدمت گزار قرار دیتے ہوئے ان کے انتقال کو اردو زبان کے لیے ایک عظیم نقصان قرار دیا ہے۔

روزنامہ 'اودھ نامہ' لکھنؤ، 25 نومبر 2022

پروفیسر عقیل احمد جہان آبادی

پٹنہ: مگدھ یونیورسٹی کے ایس این سنہا کالج کے سابق

پروفیسر عقیل احمد کا 18 نومبر کو ان کی رہائش گاہ پر انتقال ہو گیا۔ انھیں کینسر جیسی مہلک بیماری نے اپنے شکنجے میں لے لیا تھا۔ ان کی

عمر تقریباً 85 برس تھی۔ ان کی تدفین ان کے آبائی گاؤں جہان آباد کے اریکی میں بعد نماز جمعہ ادا کی گئی۔ خاندانی ذرائع کے مطابق پسماندگان میں تین بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔ ان کے بڑے بیٹے ڈاکٹر شمس اقبال نیشنل بک ٹرسٹ میں بطور اردو ایڈیٹر اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ پروفیسر عقیل احمد کا انتقال 18 نومبر جمعرات کی شام 5 بجے پٹنہ میں ہوا۔ پروفیسر عقیل مگدھ یونیورسٹی کے ایس این سنہا کالج میں برسوں شعبہ اردو سے منسلک رہ کر اردو اور اردو سے وابستہ لوگوں کی خدمت کی۔ وہ منکسر المزاج، شیریں زباں اور ہمدرد دل رکھتے تھے۔ انھوں نے کبھی خود کو پروفیسر کے طور پر پیش نہیں کیا بلکہ اردو کا ایک معمولی خادم کہہ کر اپنی انکساری و عاجزی کا ثبوت دیتے رہے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی خدمت خلق میں وقف کر دی۔ ان کے ہم عصر اور حلقہ احباب میں پروفیسر علیم اللہ حالی، پروفیسر فصیح ظفر، پروفیسر حسین الحق اور وہاب اشرفی تھے جو ان کے اخلاق و کردار کے قائل رہے۔ وہ ایک خاموش طبع سپاہی تھے اور نیک نیتی سے اردو کی خدمت کرتے رہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 19 نومبر 2022

مولانا فضل الرحمن سلفی

دہلی: سابق استاد دارالعلوم احمدیہ سلفیہ دربھنگہ، سابق صدر المدرسین مدرسہ دارالتکمیل مظفرپور، بہار، بزرگ و معمر ترین عالم دین مولانا فضل الرحمن سلفی کا 19 نومبر کو انتقال ہوگیا۔ مولانا کا تعلق مولا نگر سیتامڑھی بہار کے ایک معروف علمی و دینی خانوادے سے تھا۔ ابتدائی تعلیم والد گرامی سند العلما حافظ عبدالستار صاحب سے حاصل کی۔ 1938 میں ہندوستان کی قدیم ترین دینی دانشگاہ دارالعلوم احمدیہ سلفیہ میں داخلہ لیا اور 1943 میں سند فضیلت حاصل کی۔ آپ اس وقت دارالعلوم کے سب سے قدیم فارغ التحصیل تھے۔ آپ بیک واسطہ شیخ الکل فی الکل میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی کے فیض یافتگان میں سے تھے کیونکہ آپ نے مولانا محمد اسحاق آروی اور مولانا عبدالغفار جیراجپوری سے کسب فیض کیا تھا۔ اسی طرح مولانا عین الحق سلفی، مولانا شمس الحق سلفی، مولانا عبدالودود جیراجپوری، مولانا مصلح الدین جیراجپوری بھی آپ کے نامور اساتذہ میں سے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ فی زمانہ حدیث میں سند عالی کی وجہ سے مرجع علما بنے ہوئے تھے اور برصغیر سمیت سعودی عرب، کویت متحدہ عرب امارات، انگلستان وغیرہ کے افاضل علما حسب سہولت حاضر خدمت ہوکر یا آن لائن آپ سے کتب احادیث پڑھ کر سند اجازت لیتے تھے۔ آپ نے فراغت کے ابتدائی دور میں مادر علمی دارالعلوم احمدیہ سلفیہ دربھنگہ اور مدرسہ شیر شاہی مالدہ میں بھی درس و تدریس کا فریضہ انجام دیا۔ پھر مدرسہ دارالتکمیل مظفرپور سے وابستہ ہو گئے اور وہاں 23 سال تک صدر المدرسین کے منصب پر فائز رہے۔ آپ کو تصنیف و تالیف اور صحافت سے بھی دلچسپی تھی آپ کی ایک کتاب بنام 'حسن البیان والے مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی- حیات و خدمات' کافی مشہور ہے۔ آپ کی پوری زندگی تعلیم و تربیت اور دعوت و اصلاح کے لیے وقف رہی۔ آپ نے کئی نسلوں کی تعلیم و تربیت کی۔ نماز جنازہ مظفرپور، بہار میں عمل میں آئی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی 21 نومبر 2022

احمد علی برقی

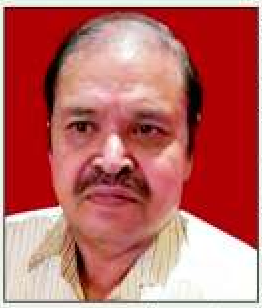

نئی دہلی: اردو، فارسی کے قادر الکلام اور خاص طور پر موضوعاتی شاعر ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی کا 5 دسمبر 2022 کو علی الصباح اترپردیش کے جونپور میں حرکت قلب بند ہوجانے سے 67 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال پر سرکردہ ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں نے تعزیت کا اظہار کیا۔ خاندانی ذرائع نے اطلاع دی ہے کہ ان کی تدفین بعد نماز عشا اعظم گڑھ میں عمل میں آئی۔ وہ چند روز پہلے ہی دہلی سے اعظم گڑھ اپنے وطن گئے تھے۔ اعظم گڑھ سے وہ گزشتہ روز اپنے سسرال جونپور پہنچے۔ 4 دسمبر کی رات وہ سوشل میڈیا پر ایکٹیو تھے، 6 دسمبر کے روز صبح چار بجے انھیں گھبراہٹ محسوس ہوئی۔ ہسپتال لے جایا گیا لیکن حرکت قلب بند ہوجانے کی وجہ سے پانچ بجے ان کا انتقال ہوگیا۔ پانچ بجے جیسے ہی ان کے برادر نسبتی نے ان کے انتقال کی خبر پوسٹ کی ان کے دوست احباب، اعزا و اقارب، شاگرد سب صدمے سے دوچار ہوگئے۔ برقی اعظمی سوشل میڈیا کی وجہ سے پوری دنیا میں مشہور و مقبول تھے۔ وہ 25 دسمبر 1954 کو اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ شبلی نیشنل کالج سے ایم اے اردو کرکے دہلی آگئے۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ کچھ دن ایران کلچرل ہاؤس، نئی دہلی کی لائبریری میں ملازمت کی۔ 1984 میں وہ آل انڈیا ریڈیو کے شعبۂ فارسی سے منسلک ہوگئے۔ کافی عرصے تک اس کے سربراہ بھی رہے۔ 2014 میں ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد سے وہ اسی شعبے میں جز وقتی طور پر کام کرتے رہے۔ ان کے والد اعظم گڑھ کی تحصیل میں قانون گو تھے اور بہت اچھے شاعر تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 دسمبر 2022

تبسم

ممبئی: ماضی کی مشہور اداکارہ تبسم اب اس دنیا میں نہیں رہیں وہ 78 سال کی عمر میں انتقال کر گئیں۔ تبسم نے اپنے فلمی کیریئر کا آغاز بطور چائلڈ آرٹسٹ سال 1947 میں فلم میرا سہاگ سے کیا جس کے بعد وہ کئی فلموں اور ٹی وی شوز کا حصہ رہیں، تاہم اب یہ معروف اداکارہ 78 برس کی عمر میں اس دنیا کو الوداع کہہ گئیں۔ تبسم کو 18 نومبر جمعہ کی رات دل کے دو دورے آئے۔ انھیں پہلا ہارٹ اٹیک صبح 8 بج کر 40 منٹ پر اور دوسرا صبح 8 بج کر 42 منٹ پر آیا جس کی وجہ سے ان کی موت ہوگئی۔ ممبئی میں ان کی آخری رسومات ادا کی گئیں۔ ان کے بیٹے ہوشانگ گوول نے کہا کہ ان کی والدہ کی خواہش تھی کہ دفنانے سے پہلے کسی کو ان کی موت کے بارے میں نہ بتایا جائے۔ بچپن میں چائلڈ آرٹسٹ کے طور پر کام کرنے والی تبسم نہ صرف ایک اداکارہ کے طور پر پہچانی جاتی تھیں بلکہ انھوں نے ٹاک شو کی میزبان کے طور پر بھی اپنی پہچان بنائی تھی۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 20 نومبر 2022

معظم علی

جے پور: راجستھان اردو اکادمی جے پور کے فعال سکریٹری جناب معظم علی کا اچانک حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہوگیا۔ وہ طویل عرصے تک راجستھان اردو اکادمی کے سکریٹری رہے۔ انھوں نے بہت سے اہم ادبی موضوعات پر سیمینار کا انعقاد بھی کرایا اور راجستھان کے مختلف علاقوں میں مشاعرے بھی منعقد کیے۔ اردو زبان و

ادب کے تئیں ان کے اندر بے پناہ جذبہ اور جنون تھا۔ انھوں نے راجستھان کے بہت سے ادیبوں کی کتابیں اکیڈمی کے ذریعے شائع کروائیں اور سمینار میں پڑھے گئے مقالات کے مجموعے بھی مرتب کر کے شائع کیے جن میں اکیسویں صدی میں اردو ناول: روایات اور امکانات، بنجارے کا خواب، ساحر لدھیانوی، فراق گورکھپوری: کچھ یادیں کچھ باتیں قابل ذکر ہیں۔ ان کی سکریٹری شپ میں سہ ماہی 'نخلستان' شائع ہوتا رہا۔ اس کے کئی خصوصی شمارے بھی شائع ہوئے۔ معظم علی کے انتقال پر علمی اور ادبی شخصیتوں نے اظہار تعزیت کیا ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ جناب معظم علی راجستھان اردو اکادمی کے فعال سکریٹری تھے اور اردو کی ترقی کے لیے ہمیشہ فکرمند رہتے تھے۔ ابھی ان کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ ان سے بہت ساری امیدیں وابستہ تھیں جنھیں ان کی ناگہانی موت نے چکنا چور کر دیا۔

معظم علی کی بیگم ملکہ نسیم اردو کی ایک معتبر شاعرہ ہیں۔ ان کے مجموعے 'دوپہر کا سفر' اور 'آج کا موسم' کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے ڈاکٹر شاہینہ تبسم کی ایک کتاب 'ملکہ نسیم کی شعری کائنات' اگست 2022 میں شائع ہوئی۔

فیس بک اور دیگر ذرائع سے

لیاقت علی

لکھنؤ: اپنی تحریر سے لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے والے اردو ادیب لیاقت علی صدیقی 7 دسمبر کو KGMU میں انتقال کر گئے۔

پریاگ راج کے شیر گڑھ گاؤں کے رہنے والے لیاقت علی نے اپنے کیریئر کا آغاز انٹر کالج میں بطور استاد کیا اور 1998 میں جنتا انٹر کالج، موہما میں اردو کے لیکچرر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں اردو کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی زبان میں بھی بہت سے مضامین لکھے جس کے لیے انھیں کئی اداروں نے اعزاز سے بھی نوازا۔ لیاقت علی 85 سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ جب انھوں نے کے جی ایم یو میں آخری سانس لی تو ان کے بیٹے پروفیسر واحد علی کے ساتھ خاندان کے دیگر افراد بھی موجود تھے۔ انھوں نے بتایا کہ والد نے ہمیشہ اپنے قلم سے لوگوں کو کچھ سکھانے کی کوشش کی۔ اپنے آخری ایام میں بھی وہ امیر خسرو کی ایک کتاب کا عربی میں ترجمہ کر رہے تھے۔ وہ پریاگ راج کورٹ میں اسٹینڈنگ کونسل کے رکن بھی تھے۔ پروفیسر واحد نے بتایا کہ والد کی طبیعت کچھ عرصے سے ذیابیطس بڑھنے کی وجہ سے خراب ہو گئی تھی۔ انھیں کے جی ایم یو میں داخل کرایا گیا تھا۔

روزنامہ 'اودھ نامہ' لکھنؤ، 8 دسمبر 2022

عامر سلیم خان

نئی دہلی: اردو زبان کے معروف صحافی عامر سلیم خان 48 سال کی عمر میں 12 دسمبر بروز سوموار اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ وہ گزشتہ دو روز سے دہلی کے جی بی پنت ہسپتال میں وینٹی لیٹر پر تھے۔ دس دسمبر 2022 کو دل کا

دورہ پڑنے کے بعد انھیں ہسپتال میں داخل کرایا گیا تھا جہاں وہ رو بہ صحت نہ ہو سکے اور اس فانی دنیا کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ گئے۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ تین بیٹے شامل ہیں۔ عامر سلیم خان آبائی طور پر یوپی کے ضلع بستی کے رہنے والے تھے۔ وہ دو دہائی سے زائد عرصے سے دہلی کے مہندیان میں مقیم تھے۔ تقریباً پندرہ سال کے طویل عرصے سے وہ روزنامہ 'ہمارا سماج' سے وابستہ تھے۔ اس سے قبل وہ مختلف اخبارات میں کام کر چکے تھے۔ عامر سلیم خان اپنی بیباک صحافت کے لیے جانے جاتے تھے۔ ان کی نماز جنازہ بعد نماز عشا مہندیان قبرستان میں مولانا محمد رحمانی نے پڑھائی۔ بعد ازاں سیکڑوں سوگواران کی موجودگی میں والد چودھری سلیم خان مرحوم کی قبر کے سرہانے سپرد خاک کیا گیا۔ ان کے جنازے میں سماجی، سیاسی، علمی شخصیات کے علاوہ بڑی تعداد میں صحافیوں نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 دسمبر 2022

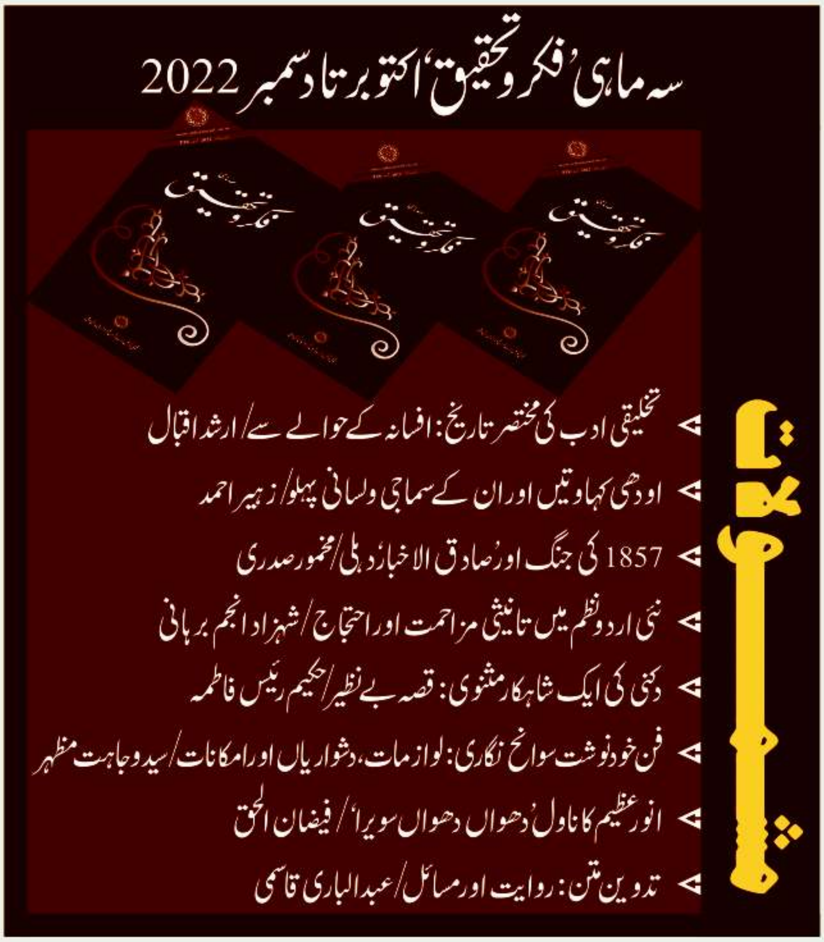

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

کلیات رشید احمد صدیقی جلد 8 (مضامین)

ترتیب وتدوین: ابوالکلام قاسمی

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 510

قیمت: 235 روپے

عہد وسطیٰ کا ہندوستان (حصہ اول)

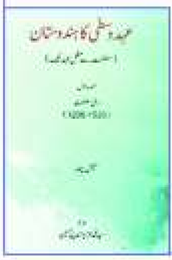

مصنف: ستیش چندر

مترجم: سید محمد عزیز الدین حسین

دوسری طباعت: 2022

صفحات: 348، قیمت: 170 روپے

حالی کی نظمیں

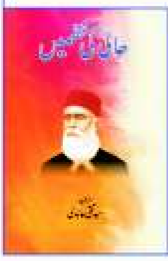

مرتب: سید تقی عابدی

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 262+66

قیمت: 160 روپے

کلیات راجندر سنگھ بیدی (جلد اول)

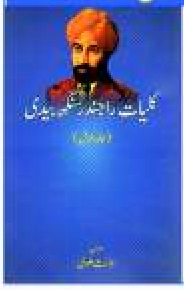

مرتب: وارث علوی

دوسری اشاعت: 2022

صفحات: 970

قیمت: 425 روپے

اردو ڈراما: تاریخ وتجزیہ

مصنف: محمد کاظم

پہلی اشاعت: : 2022

صفحات: 686

قیمت: 300 روپے

نظری تنقید: مسائل ومباحث

مرتبہ: عفت آرا

دوسری اشاعت: 2022

صفحات: 233

قیمت: 125 روپے

تشریح البدن (جلد دوم)

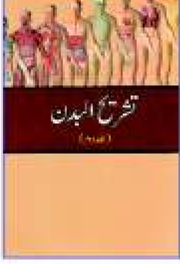

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 460

قیمت: 215 روپے

تاریخ طب یونانی (جلد اول)

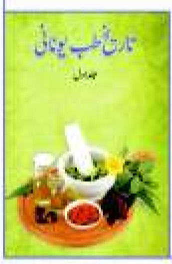

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 448

قیمت: 220 روپے

شعبہ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, जनवरी-२०२३,वर्ष:२५, अंक:०१

URDU DUNIYA Monthly, January-2023, Vol.25, Issue:01

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99

DL (S) - 01/3394/2023-25

ISSN 2249 - 0639

Date of Publication:24/12/2022

Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

Total Pages:100

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

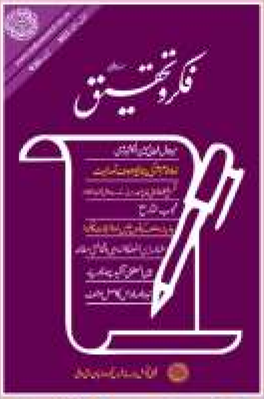

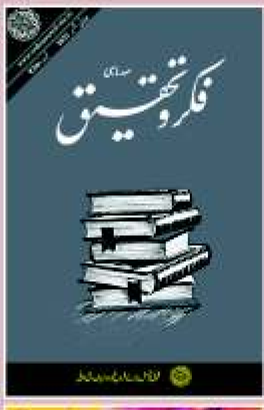

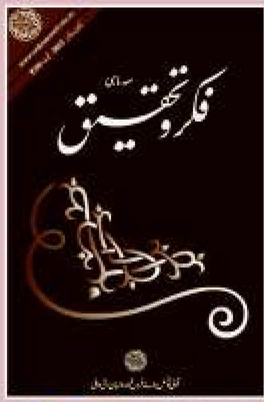

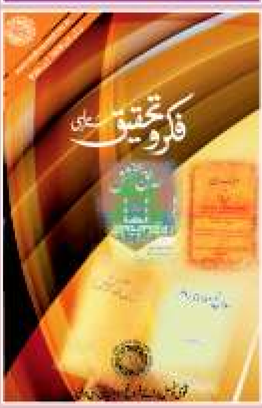

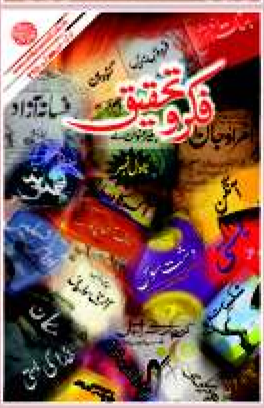

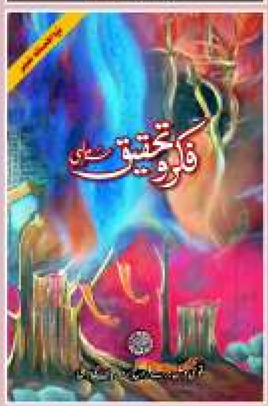

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 040 - 24415194

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020

And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025

LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6